اسلام میں عورتوں کا مقام

حقوق اور واجبات کی روشنی میں ایک مباحثہ

تالیف:

ڈاکٹر فاطمہ عمر نصیف

حصہ اول

اسلام کی آمد سے قبل عورتوں کی حیثیت

پہلا باب

قدیم تہذیبوں میں عورتوں کا مقام

قدیم تہذیبوں کے اندر اور صدیوں کے دورانیے پر محیط عرصے میں عورتوں کی حیثیت میں کافی فرق رہا ہے۔ اگرچہ کبھی کبھار عورتوں کو برائے نام عزت سے نوازا بھی جاتا، لیکن ان پر عام طور پہ ظلم و زیادتی ہی کی جاتی تھی۔ اکثر اوقات عورتوں سے متعلق ضوابط اور قانون سازی حیران کن طور پہ ناانصافی پر مبنی ہوتے تھے۔ وہ اپنے شہری حقوق کے ساتھ ساتھ فطری انسانی حقوق سے بھی محروم تھیں۔ لوگوں نے ان کے انسان ہونے پر شبہ کیا، انہیں الگ تھلگ رکھا اور رسم و روایات کے نام پر ان کا عرصۂ حیات تنگ کیا۔ عورتوں کو بارہا اپنی معاشرتی زندگی جینے کے حق سے اور اظہار رائے کے حق سے محروم کیا گیا تھا۔ ان کی حالت غلاموں سے بہتر نہ تھی، وہ خریدنے میں ارزاں اور فروخت کرنے کے لیے آسان شے تھیں۔ یہ صورتحال جوان عورتوں، بیویوں اور ماؤں کی حیثیت سے ان کے لیے تازندگی رہتی۔ انہیں ایک قید خانے سے دوسرے قید خانے لے جایا جاتا تھا، وہ باپ، شوہر یا کسی مرد سرپرست کی ماتحتی میں سونپی جاتیں جس کا ان کی زندگی کے تمام پہلوؤں پر اختیار ہوتا تھا۔ انہیں اپنے فیصلے کرنے کی اجازت نہیں تھی اور نہ ہی انہیں کوئی مالی یا شہری حقوق حاصل تھے۔

تاریخ میں کچھ ایسے واقعات درج ہیں جن میں عورتوں نے اقتدار کے عہدوں پر قبضہ کیا تھا، جیسے مصری تہذیب میں۔ لیکن ایسے واقعات بہت کم ہیں اور اس وقت یا اس کے بعد کی عورتوں کی عمومی حالت کی عکاسی نہیں کرتے ہیں۔ جہاں تک کچھ معبودوں اور فرشتوں کے نسائی ناموں کا تعلق ہے تو یہ محض اتفاق تھا، جو اس بات کی نشاندہی نہیں کرتا ہے کہ عورتوں کو بہت عزت و توقیر حاصل تھی۔ یہاں تک کہ اگر ایسا تھا بھی تو انہیں استثنائی معاملات سمجھنا چاہیے جو عام و رائج اصول پر اثر انداز نہیں ہوتے ہیں۔ قبل اسلام خواتین کی حالت زار کی مزید وضاحت کے لیے یہ باب مختلف قدیم تہذیبوں میں خواتین کی حیثیت کے عمومی جائزے پر مشتمل ہے۔ اسلام کی آمد سے عورتوں کی زندگی پر مرتب ہونے والے خوشگوار اثرات کو حقیقی معنوں میں سراہنے کے لیے ہمیں پہلے قدیم تہذیبوں کے اندر ان کے مقام و حیثیت کے تعلق سے کچھ معلومات حاصل کرنی ہوں گی۔ اسی لیے ذیل میں عورتوں کی حیثیت کا مختصر تاریخی جائزہ کتاب کے باقی ماندہ حصوں کے لیے ضروری تمہید کی حیثیت رکھتا ہے۔

یہاں تاکیداً بیان کرنا ضروری ہے کہ اس باب کا مقصد فقط قارئین کے لیے عہد رفتہ کی عورتوں کی حالت زار کی ایک تصویر پیش کرنا ہے۔ قارئین اگر چاہیں تو ذیل میں مذکور تہذیبوں کے مزید تفصیلی مطالعے کے لیے فہارس کتب حوالہ و حواشی سے رجوع کر سکتے ہیں۔

چینی تہذیب میں عورتوں کا مقام

چینی تہذیب میں عورتوں کی حیثیت ہمیشہ تغیر پذیر رہی۔ کنفیوشس کی آمد سے قبل ماؤں کے ساتھ قابل ذکر حد تک محترم سلوک روا رکھا جاتا تھا۔ اہل چین کے یہاں کنبے کی بڑی قدر و اہمیت تھی، اسی طرح کنبہ کی محور ہونے کی وجہ سے ماں بھی بے حد لائق عزت و تکریم ہستی سمجھی جاتی تھی[1]۔ بد قسمتی سے یہ صورتحال صرف تھوڑے عرصے تک ہی برقرار رہی۔

مورخین نے اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ جاگیرداری نظام کا آغاز ہی چینی تہذیب میں عورتوں کے مقام و مرتبے کے خاتمے کے لیے ذمہ دار ہے۔ ان ہی مورخین میں کتاب الحضارۃ (تہذیب و تمدن کی کتاب) کے مصنف بھی ہیں جو کہتے ہیں "شاید جاگیرداری نظام کی شروعات ہی سیاسی اور معاشی حقوق کے معاملے میں ان کی بے وقعتی اور انحطاط کی ذمہ دار تھی۔ باپ خاندان کا مرکزی فرد ہوا کرتا تھا جس کے پاس کل اختیارات تھے۔ بیٹے، ان کی بیویاں اور بچے سب باپ کی عملداری میں رہتے تھے۔ اگرچہ اراضی خاندان کے تمام افراد کی ملکیت ہوتی تھی، لیکن باپ کو خاندان کے باقی افراد کے ساتھ ساتھ اراضی پر بھی مطلق حاکمیت حاصل تھی۔ کنفیوشس کے دور اقتدار میں باپ اپنے کنبے کے متعلق معاملات میں فیصلہ سازی کے لیے غیر مشروط اور جبر و استبداد کی حد تک حق رکھتا تھا۔ یہاں تک کہ اسے اپنی بیوی اور بچوں کو غلامی میں بیچ ڈالنے کا بھی حق حاصل تھا۔"[2]

درحقیقت اہل چین نے عورتوں کو بہت معمولی حیثیت کے ساتھ جینے کا حق دیا۔ ان کے یہاں عورتیں برے شگون کی طرح لی جاتیں اور ذلت و رسوائی کی زندگی بسر کرتیں تھیں۔ "لوگوں نے دعائیں کی اور معبود سے نرینہ اولاد عطا کرنے کی التجا کی۔ ایک عورت کے لیے سب سے زیادہ شرمندگی کی بات یہ ہوتی تھی کہ اسے لڑکے نہ ہوں، کیونکہ لڑکے کھیتوں میں محنت کے کام سرانجام دیتے تھے اور لڑائی کے میدانوں میں ان پر زیادہ بھروسہ کیا جا سکتا تھا۔ جبکہ لڑکیوں کے معاملہ میں انہیں خاندان کے اوپر بوجھ سمجھا جاتا تھا، چونکہ والدین کو اپنے بچوں کی طرح انہیں ساری ضروریات مہیا کرانی ہوتی تھی اور بڑے ہو جانے پر ان کی شادی کے اخراجات

بھی برداشت کرنے پڑتے تھے۔ لہٰذا دختر کشی چینیوں کے اندر کثرت کے ساتھ رائج تھی، جب بھی لڑکیوں کی تعداد ان کے خاندان کی ضرورت اور ذرائع سے زیادہ ہوتی وہ اس برے کام کو انجام دیتے تھے۔ شیر خوار بچیاں کھیتوں میں چھوڑ دی جاتیں تاکہ سردی سے ٹھٹھر کر مرجائیں یا درندوں کی خوراک بن جائیں۔ یہ مذموم عمل ان کی زندگی کا معمول بن چکا تھا، اور شاید ہی اسے جرم کے کسی کمتر درجے میں رکھا جاتا تھا۔"[۳]

ایک عورت اپنی ساری زندگی ایک مرد سرپرست کی مطیع بن کر رہتی تھی۔ یہ سرپرست اس کا باپ، شوہر، باپ کی غیر موجودگی میں بھائی یا شوہر کی غیر موجودگی میں اس کا بیٹا ہو سکتا تھا[۴]۔

"وہ مرد کی مرضی کے تابع رہتی اور اپنی پوری زندگی اس کی اطاعت گزار بن کر رہتی تھی۔ وہ مالی اور معاشرتی حقوق سے یکسر محروم تھی۔ اسے اپنے معاملات خود سنبھالنے کا اہل نہیں سمجھا جاتا بلکہ اس کا ولی اس کے سارے فیصلے لیتا تھا۔ اسے تعلیم حاصل کرنے کا یا شعوری ارتقا کا کوئی حق حاصل نہیں تھا۔ وہ گھر پر رہ کر کنبے کی خدمت گزاری کی تربیت پاتی تھی۔ ایک وفاشعار خادم کے لیے جو ضروری صلاحیت ہو سکتی ہے اس میں وہ مکمل استعداد حاصل کرتی تھی۔ پندرہ برس کی عمر تک اسے اپنے بال کٹوانے پڑتے اور بیس برس کی عمر کو پہنچ جانے کے بعد شادی کرنی ہوتی تھی۔ شوہر عام طور پر دلال کی مدد سے والد کا منتخب کردہ ہوتا تھا۔ مزید برآں عورتیں گھر میں علیحدہ کمروں میں رہتی تھیں اور مردوں کے ساتھ شاذ و نادر ہی گھل مل پاتیں چونکہ ان کی معاشرتی زندگی میں مردوں سے میل جول پر پابندی تھی، یا پھر وہ عورتیں ایک ایسے طبقے سے تعلق رکھتی ہوں جہاں ایسے میل جول کی اجازت ہو، مثلاً گانے بجانے والوں اور کھیل تماشے والوں کا گروہ۔"[۵]

شادی کے بعد بیوی اپنے شوہر کے ماں باپ کے ساتھ منتقل ہو جاتی تھی۔ وہ اپنے شوہر کے نام پر وفاداری اور اطاعت گزاری کا حلف لیتی، اور پھر یہ اس کی ذمہ داری ہو جاتی کہ اپنے سسرالیوں کے ساتھ اچھی طرح تعاون کرے جیسا کہ وہ اپنے ماں باپ کے ساتھ کرتی تھی۔ وہ فوکانگ کہلاتی تھی جس کا مطلب ہوتا ہے "حوالگی"، جو اس کی فرمانبرداری اور اپنے شوہر کی مرضی کے تابع ہونے کی نشاندہی کرتا ہے۔ شوہر اپنی بیوی کی حیثیت صرف اپنے بچوں کی ماں ہونے کی حد تک ہی تسلیم کرتا تھا اور اس کا انتخاب اس کی خوبصورتی یا ذہانت کو سامنے رکھ کر نہیں بلکہ اس کی زرخیزی، شوہر اور اس کے کنبہ کی معاونت کرنے میں ثابت قدم رہنے نیز تابعداری کی بنیاد پر کرتا تھا۔ اسے کھانا پیش کیا جاتا اور وہ شاید ہی کبھی اپنی بیوی یا بچوں کو اپنے ساتھ کھانے میں شامل ہونے کی دعوت دیتا تھا۔ گھر کے سارے لوگ شاذ و نادر ہی کبھی ایک ساتھ میز پر کھانا کھاتے تھے۔ اگر شوہر کا انتقال

ہو جاتا تو اس کی بیوی کبھی دوبارہ شادی نہیں کر سکتی تھی۔ اس سے خود کو جلا کر اپنے مردہ شوہر کو خراج عقیدت پیش کرنے کی قربانی مانگی جاتی تھی٦۔

ایک مخصوص عہد میں کسی قوم کی معاشرتی زندگی کے احوال اور اس کے رسوم و روایات کو جاننے کے لیے اس قوم کا ادبی سرمایہ ہمیشہ سے ہی ایک بہترین ذریعہ رہا ہے۔ اہل چین کے ادبی ذخیرے بشمول نظموں اور مضامین کی مدد سے کوئی بھی با آسانی یہ ادراک کر سکتا ہے کہ چینی تہذیب میں عورتوں کی صورتحال کس قدر اذیت ناک اور بدحالی سے دوچار تھی۔ کتاب الحضارۃ کے مصنف نے مسز بان ہو بان کے اپنے معاشرے کی عورتوں کی صورتحال بیان کرنے والے مشہور خط سے یہ اقتباس نقل کیا ہے کہ "ہم طبقاتی اعتبار سے نسل انسانی کے انتہائی نچلے پائدان پر ہیں، ہم بنی نوع انسان میں سب سے کمزور نفوس ہیں اور پسماندہ ترین کاموں کی انجام دہی ہمارے ذمہ ہے"۔ یہ سادہ لیکن اعتراف حقیقت پر مبنی باتیں اپنے معاشرے کے اعلیٰ ترین طبقہ سے تعلق رکھنے والی ایک خاتون کے ذریعہ تحریر کی گئی تھیں، جو ہمیں نچلے معاشرتی طبقات کے اندر عورتوں کی صورتحال کے تعلق سے حیرت میں ڈالتی ہیں۔ وہ آگے لکھتی ہیں "یہ دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے کہ قانون کی کتاب عورتوں کے مسائل سے نمٹنے میں کس حد تک غیر جانبدار اور مبنی بر انصاف ہے، یہ حکم دیتی ہے کہ اگر کوئی عورت اپنے شوہر سے محبت کرتی ہے تو اسے زندگی کے باقی ایام اسی کے ساتھ گزار دینے چاہیے اور اگر محبت نہیں کرتی ہے تو بھی اپنی باقی زندگی اسی کے ساتھ رہ کر گزارنی چاہیے۔" یہ چینی معاشرے میں عورتوں کی تذلیل، لاچارگی اور کلی محکومی کی سب سے واضح تصویر ہے۔

ول دیورانت نے اس پر تبصرہ کیا ہے کہ "یہ ایک اشرافیہ سے تعلق رکھنے والی خاتون کی رائے تھی، میں معاشرہ کے نچلے طبقے کی عورتوں کی صورت حال کا تصور کرنے کی جرات نہیں کر پاتا ہوں"۔ چینی شاعر فوشوان اپنے معاشرے میں حالت نسواں کو بیان کرنے کی کوشش میں یہ گنگناتے ہیں:

کس قدر مصیبت زدہ ہے عورت

جہاں میں اس، ارزاں ہے سب سے وہ

لڑکے دہلیز پہ ہوتے ہیں کھڑے

سمجھتے ہوئے یہ، آسمانوں سے بھیجے دیوتا ہیں وہ

اور چاروں سمندروں کو ہیں للکارتے

اور ہواؤں کو، ریت کو اور افق کو
لڑکیاں رنج و حزن کے سوا کچھ نہیں
اہل خانہ کے لیے اپنے، خالی پن کے سوا کچھ لاتی نہیں ہیں وہ
بڑے ہونے پر، اپنے حجروں میں چھپ جاتی ہیں وہ
کسی انسانی چہرہ کو دیکھ لینے کا خوف طاری رکھے ہوئے
کسی کو روتا ہوا نہیں ہیں چھوڑتی
اگر وہ اوجھل ہو گئیں
بارش کے بعد بادلوں کی طرح ایک لمحے میں
اور سر اپنا نیچے کر کے وہ، خود کو خوبصورت ہیں بناتی
اور اپنے ہونٹوں کو کاٹتی ہیں وہ، اور جھک جھک جاتی ہیں وہ
اور اکثر مجمع کو کرتی ہیں یاد

نظم کے مطابق چینی عورتوں کی یہ صورتحال تھی۔ خلاصۂ کلام اس کا کچھ ایسے پیش کیا جاسکتا ہے کہ:

وہ ایک حقیر، تعلیم سے محروم، اپنے تمام حقوق اور آزادیوں سے بے بہرہ شے تھی، جو قرابت دار مردوں کی اطاعت اور اپنے کنبے کی خدمت پر مامور کی گئی تھی۔ اس کے پاس صرف وہ چیز تھی جو مردوں نے اسے دے دی اور اس نے وہی کچھ کیا جو اس سے کہا گیا۔ وہ بدستور خاموش رہی جب کہ وہ زیادتی کا شکار ہوئی اور ضائع کر دی گئی۔

ہندوستانی تہذیب میں عورتوں کی حیثیت

ہندوستانی لوگ عورت کے انسان ہونے کا ہی انکار کر بیٹھے۔ انہوں نے عورتوں کی معاشرتی اہمیت کو تسلیم نہیں کیا اور ان کے حقوق ان کو دیئے نہ ہی ان کے فرائض کی ادائیگی کی۔ ''وید'' ان قدیم ترین متون میں سے ایک ہے جو ہندوستانی تہذیب کے اندر عورتوں کی حالت زار کے لیے ذمہ دار ہے۔ ساتھ ہی ''وید'' ایک مقدس

کتاب بھی ہے جو برہمن مذہب کے اصولوں پر مشتمل ہے۔ "برہمن مذہب کی قانون سازی" عنوان کے تحت کتاب میں ہمیں مندرجہ ذیل اقتباس ملتا ہے:

"برہمن مذہب انسانوں کی درجہ بندی کے لحاظ سے اور ان کے حقوق کے اعتبار سے مرد اور عورت میں تفریق کرتا ہے۔ یہ عورتوں کو ان کے شہری حقوق سے محروم کر دیتا ہے اور انہیں تاحیات مردوں کی بالادستی کے زیر اثر رکھتا ہے جیسا کہ یہ "منو" کے قانون کی دفعہ نمبر 147 اور 148 کے تحت درج ہے۔ یہ واضح کرتا ہے کہ ایک عورت اپنی زندگی کے مختلف مراحل کے دوران کوئی فیصلہ نہیں کر سکتی، خواہ وہ اس کی اپنی زندگی کے متعلق ہو یا اس کے خانگی معاملات سے اس فیصلے کا تعلق ہو۔ دفعہ نمبر 147 کہتا ہے کہ جب وہ ایک نوعمر لڑکی ہو تب اسے اپنے والد کا فرمانبردار ہونا چاہیے اور ایک بیوی کی حیثیت میں اسے اپنے شوہر کی تابعداری کرنی چاہیے۔ اگر اس کا شوہر فوت ہو جاتا ہے تو اسے اپنے سرپرست کی اطاعت کرنی ہوتی ہے، اگر سرپرست کی بھی وفات ہو جائے تو حق سرپرستی اس کے چچاؤں کی طرف منتقل ہو جائے گا۔ اگر عورت کے چچا نہیں ہیں تو اس صورت میں اس کا ولی اور سرپرست موجودہ حکمران ہو گا۔ دفعہ نمبر 148 کے مطابق اسے آزاد رہنے کا کوئی حق نہیں ہے اور نہ ہی اپنی خواہشات کے مطابق کام کرنے کی خودمختاری حاصل ہے۔"[7]

اس طرح عورتوں نے اپنی تمام عمر مردوں کی بالادستی کے سامنے سر تسلیم خم کیا۔ انہوں نے مردوں کی مکمل تابعداری کی اور ان کے تئیں اپنی ذمہ داریوں کو پورا کیا۔ بلکہ یہ تابعداری سے کہیں بڑھ کر تھا کیونکہ انہیں کسی سامان تجارت سے زیادہ کی اہمیت حاصل نہیں تھی، جسے خریدا، بیچا یا اپنے پاس روکا جا سکتا ہے اور بطور ملازم تاعمر اپنی تحویل میں رکھا جا سکتا ہے۔

"ہندوستانی معاشرے کی عورت اپنے باپ کی ملکیت سمجھی جاتی تھی، باپ جہاں اور جس طرح چاہتا رخصت کر کے چھٹکارا پا سکتا تھا۔ شادی کے بعد اس کی حیثیت شوہر کے لیے زر خرید لونڈی کی سی ہو جاتی تھی۔ اگر شوہر فوت ہو جائے تو وہ اس کے رشتہ داروں کے زیر ملکیت آ جاتی تھی۔" جیسا کہ لوئیس فرینک کہتا ہے، منو کا قانون عورتوں کو پابند عہد کرتا ہے کہ "ایک ہندوستانی عورت کوئی بھی فیصلہ کرنے کا خواہ وہ ان کے خانگی امور سے ہی کیوں نہ تعلق رکھتا ہو کسی طرح کا حق نہیں رکھتی۔ کسی بھی کام کی انجام دہی سے قبل اسے اپنے باپ یا بھائی کی رضامندی حاصل ہونی ضروری ہے۔ نوجوان عورت کو نہایت تکریم اور اطاعت شعاری کے ساتھ اپنے والد سے

پیش آنا چاہیے۔ اسے اچھا اخلاق و کردار اپنانا چاہیے، مستعدی و مہارت کے ساتھ گھر چلانے کی قابلیت رکھنی چاہیے اور بغیر فضول خرچی کیے ہوئے اس کی تزئین و آرائش کرتے رہنا چاہیے۔"۸

ایک بار وہ شوہر کے پاس چلی جاتی تو اسے اپنے آپ کو بغیر کسی شکوہ شکایت کے حد درجہ خیر خواہی کے ساتھ اس کی خدمت کے لیے مکمل طور پر وقف کر دینا ہوتا تھا۔ بالفاظ دیگر اس کی غلامی کی زنجیریں شادی کے بعد بھی قائم رہتیں۔ منو عورتوں کے لیے یہ مقرر کر دیتا ہے کہ "ایک جاں نثار اور وفاشعار بیوی کو چاہیے کہ وہ اپنے آقا (شوہر) کی کسی دیوتا کی مانند خدمت کرے، اپنے آپ کو کسی ایسے کام میں ملوث نہ کرے جس سے اس کی دل آزاری ہوتی ہو۔ یہاں تک کہ اس کا شوہر خوبیوں سے عاری شخص ہو اور اچھی سیرت کا حامل نہ ہو تب بھی اسے میرے مالک، میرے دیوتا، اے آقا! جیسے الفاظ سے مخاطب کرنا چاہیے۔ اور اگر وہ دونوں عوامی مقامات پہ جائیں تو بیوی کو چاہیے ایک مناسب فاصلہ رکھتے ہوئے اس کے پیچھے پیچھے چلے۔" شوہر اپنی بیوی کو شاید ہی کبھی خود بول کر مخاطب کرتا تھا۔ جبکہ اسے اپنی بیوی سے ہر معاملے میں جاں نثاری اور خدمت گزاری کا رویہ مطلوب ہوتا؛ کھانا بنانا، اس کے کھالینے کے بعد بچوں کے ساتھ کھانا، بستر میں اس کی ٹانگوں کے درمیان دراز ہونا اس کے فرائض منصبی میں شامل تھا۔ اس کے باوجود اس کے لیے یہ نہایت بدقسمتی کی بات سمجھی جاتی اگر کبھی سرمو انحراف کر جاتی۔ یہ عقیدہ رکھا جاتا تھا کہ شوہر کی نافرمانی کرنے پر اسے اگلی زندگی میں گیدڑ بنا کر بھیجا جائے گا۔۹

عورتوں کو کہیں بھی اپنا مال صرف کرنے کا اختیار نہیں تھا، جائیداد اور اس کی ملکیت کی ساری چیزیں اس کے شوہر کے ماتحت تھیں۔ یہ صورتحال شوہر کی پوری زندگی میں اس کے ساتھ رہتی، جبکہ شوہر کی موت کے بعد یہ بد سے بدتر ہو جاتی تھی۔ اس کے لیے فیصلہ صادر کر دیا جاتا کہ وہ اپنے شوہر کی میت کے ساتھ زندہ جلا دی جائے، بصورت دیگر اسے سماج سے باہر کر دیا جاتا تھا۔ "ان کی مذہبی کتابوں کا مطالعہ کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ ایک بیوہ کے لیے یہ ضروری ہوتا؛ وہ خود کو اپنے شوہر کی چتا کی آگ کے حوالے کر دے۔ نعش کو پہلے جلائی جانے والی لکڑیوں کے اوپر رکھا جاتا اور بیوہ چل کر اس کے نزدیک آتی اس حالت میں کہ اس کے چہرے پر ایک کپڑا پڑا ہوتا۔ پھر برہمن آگے بڑھ کر چہرے سے کپڑا ہٹا دیتا اور آرائش و زیبائش کی چیزیں اس سے دور کر دیتا۔ وہ اپنے زیورات بھی اتار کر کنبہ کے لوگوں اور رشتہ داروں کو دے دیتی اور اپنے بالوں کو کھول لیتی۔ اس کے بعد ان میں سب سے بڑا برہمن اس کا دایاں ہاتھ پکڑ کر چتا کے گرد تین چکر لگاتا۔ پھر وہ اپنے گھٹنوں کے بل بیٹھ جاتی اور شوہر کے پاؤں کو اٹھا کر اپنے ماتھے پر رکھتی، ایسا کرنا تعظیم اور بے انتہا عقیدت کی ایک علامت ہوتی۔ یہ کرنے کے بعد وہ کھڑی ہو جاتی اور اس کے سرہانے کے قریب جا کر بیٹھ جاتی، اس کا دایاں ہاتھ شوہر کے جسم پر

رکھا ہوتا۔ اس کے بعد برہمن چتا میں آگ لگا دیتے اور اسے چتا کے ساتھ ہی زندہ جلا ڈالتے۔ ان کا دعوی تھا کہ ایسا کر گزرنے سے بیوی کو اپنے شوہر کے ساتھ بہشت میں 350 لاکھ سال (کسی انسانی جسم میں موجود بالوں کی تعداد کے برابر) لمبی اور خوشگوار زندگی عطا کر دی جاتی ہے۔ مذکورہ قربانی دینے کے بعد نہ صرف وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہوتی ہے بلکہ اپنے والدین، ننھیالی و ددھیالی رشتہ داروں اور شوہر کے کنبہ والوں کو بھی گناہوں سے پاک کر دیتی ہے۔ اپنے اس عمل سے وہ اپنے شوہر کو بھی اس کے کیے ہوئے گناہوں سے نجات دلاتی ہے اگرچہ اس کی گردن پر اپنے عزیز دوست یا کسی برہمن کا خون ہی کیوں نہ ہوتا۔ اور تب وہ اپنی نوعیت کی پاکیزہ اور نیک نامی کے ساتھ سب سے زیادہ معزز اور احترام کے لائق سمجھی جاتی۔ بد قسمتی سے یہ رسم وسیع پیمانے پر چلن میں تھی اور آج بھی جاری ہے"۔ ۱۰

جی لیپونٹ اس وحشیانہ رواج پر یوں تبصرہ کرتا ہے: "ایسا ہونے کی وجہ یہ ہے کہ ہندوستانی عورتیں اپنے شوہروں کو زمین پر دیوتاؤں کا نمائندہ سمجھتی رہی ہیں" ۱۱۔ لہٰذا جو عورتیں اس مہیب اور وحشت ناک طریقہ پر قربان ہونے سے بچ جاتی تھیں اسے ہمیشہ کے لیے معاشرہ مسترد کر دیتا اور اسے جانوروں کے مثل سمجھا جاتا تھا۔ لیپونٹ لکھتا ہے کہ "غیر شادی شدہ عورتوں اور خاص طور پر بیواؤں کو ہندو معاشرے نے نہایت حقیر جانا اور ان کا اپنے ساتھ رہنا نامنظور کر دیا تھا، انہیں جانوروں کے مساوی درجہ دے رکھا تھا۔ بہت سی عورتیں نہایت کم عمری میں ہی اپنے شوہروں کو کھو بیٹھتیں اور اس طرح ذلت اور ابدی تکلیف ان کا مقدر بن کر رہ جاتی تھی۔ اگر کسی سے ان کا سامنا ہو جائے تو دوسروں کے نزدیک یہ چیز نحوست تصور کی جاتی تھی۔ انہیں نجس و ناپاک مخلوق سمجھ کر معاشرہ سے الگ تھلگ رکھا جاتا تھا، ان کے چھو لینے سے ہی کوئی چیز پلید ہو جاتی تھی۔ کسی بیوہ عورت کے لیے واحد مہذب حل خود کو آگ کے حوالے کر دینا تھا یا پھر اس سے زیادہ بھیانک عذاب سے وہ گزرتی رہے"۔ ۱۲

مصنف عمر کحالہ کہتے ہیں "بیوہ ہمیشہ کے لیے اپنے ہی لوگوں کے ذریعہ مسترد اور بے دخل کر دی گئی تھی۔ لوگوں کے لیے وہ ایک ناگوار و ناپسندیدہ مخلوق تھی۔ اس کی حیثیت اس قدر معمولی تھی کہ وہ دن میں صرف ایک وقت ہی کھانا کھاتی، ہمیشہ ایک ہی کپڑا پہنے رہتی، نیند آنے پر فرش پہ سو جاتی اور ہر لمحہ مختلف کاموں کے بوجھ تلے دبی رہتی تھی۔ اپنی بیوگی کو آشکار کرنے کے لیے وہ اپنے بال منڈوائے رکھتی تھی۔ ۱۳" زیادہ افسوس ناک حقیقت یہ ہے کہ بیوہ عورتیں عام طور پہ کم عمر ہوتی تھیں اور انہیں اپنی ساری زندگی اسی طرح قابل رحم حالت میں گزار دینی ہوتی تھی۔ ایک اور قابل ملامت بات یہ ہے کہ معاشرہ کے اندر 7-6 سال کی عمر میں لڑکیوں کی شادی کر دینے کی روش عام تھی"۔ ۱۴

مذکورہ روایت کی اصل اور اس پر لوگوں کے اعتقاد رکھنے کی وجہ بتاتے ہوئے ول دیورانت کہتا ہے ”بیوی کو اپنے شوہر کی چتا کے ساتھ زندہ جلا دینے کی یہ رسم باہر سے ہندوستان پہنچی۔“ اس معاملے میں ہیروڈوٹس کا کہنا ہے ”یہ رسم ترکوں اور اسکاچ لوگوں کے درمیان بہت عام تھی۔ ان کے یہاں اپنے شوہروں کی قبر پر جان نچھاور کیے جانے کا اعزاز حاصل کرنے کے لیے عورتوں میں مقابلہ آرائی ہوتی تھی۔ امکان ہے کہ یہ رسم ہندو مذہب میں اس بہت پرانی روایت سے منتقل ہوئی ہوگی جو قدیم انسانوں اور معاشروں میں رائج تھی“۔

اہل چین کے اندر بھی اس قسم کی ایک روایت موجود تھی کہ شہزادے ایک آدھ بیویوں یا داشتاؤں اور بہت سے غلاموں کو قربان کر دیتے تھے اور دیگر نذرانے پیش کرتے تھے، اس طرح ان کا یہ اعتقاد تھا کہ اگلی زندگی میں یہ لوگ ان کے ساتھ ہوں گے۔ ”ویدوں کی مطبوعات“ میں ذکر ملتا ہے کہ یہ دور دراز کے علاقوں میں رواج پائی ہوئی روایت تھی اور ”رگ وید“ میں اس بات کا تذکرہ موجود ہے کہ یہ روایت ویدک معاشرے کے اندر کبھی بھی وسیع پیمانے پر نہیں پھیل پائی تھی، شوہر کی آخری رسومات ادا کرنے کے لیے اکٹھا کی گئی لکڑیوں پر آگ لگانے سے پہلے بیوہ کو بیٹھانے تک ہی اسے محدود کر دیا گیا تھا“۔[۱۵]

یہ تھی ہندوستانی تہذیب کے اندر نوجوان لڑکیوں سے لے کر بزرگ عورتوں کی حقیقی صورت حال۔ اسے مختصراً مینی چایوس منو کے اقتباس سے یوں سمجھا جاسکتا ہے کہ ”عورت بدنامی کا باعث ہے، تکلیف اور تصادم کا سبب ہے اور اس دنیاوی وجود کی اصل ہے۔ اس کی تخریبی صلاحیتیں نہ صرف یہ کہ کم عقل آدمی کو گمراہ کرنے میں کام آتی ہیں بلکہ وہ عقلمندوں کو بھی فریب دینے میں کامیاب ہے۔ وہ اسے اپنے قابو میں رکھتی ہے اور اسے اپنی خواہشات و ناراضگی کی پرواہ کرنے والا بندہ بنا لیتی ہے“[۱۶]۔ یہاں تک کہ ان کے اپنے ہندو مذہب سے تعلق رکھنے والے قوانین عورتوں کو افترا پردازانہ اور رسوا کن اوصاف کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔ ویدک صحیفوں میں درج ہے کہ ”جب منو نے عورتیں پیدا کیں تو اس نے ان کے اندر جنسی خواہشات اور زیورات و آرائشی چیزوں کی محبت رکھ دی۔ اس نے ان کے اندر غصہ، بیوفائی اور زنا کی رغبت بھی ڈال دی۔ اس میں کوئی دورائے نہیں کہ عورتیں جھوٹی اور ذلیل مخلوق ہیں۔ ان کا اصل مقصد مردوں کو ورغلانا اور ان کے ذریعہ مکروہ فعل کے ارتکاب کی راہ ہموار کرنا ہے، اسی لیے انہیں غیر منحصر اور غیر ماتحت نہیں ہونا چاہیے۔“ وہ لوگ عورتوں کو فطرتاً اس حد تک نجس و ناپاک سمجھتے تھے کہ جب کسی بچی کی پیدائش ہوتی تو اس کے کنبہ والوں اور رشتہ داروں کو دس دنوں تک ناپاک تصور کیا جاتا تھا۔ انسانوں کے باپ منو نے ہی عورتوں کو زمین پر مصائب و آلام سے بھرا مقام اور درجہ دیا ہے۔ اس نے فیصلہ کیا کہ ”عورتوں کو نہ تو طاقت رہے نہ عزت، وہ بے علم رہیں

اور گھر کے اندر غلام بن کر رہیں، ان کے پاس کوئی بھی خوبی نہ ہو اور نہ ہی ان میں ابدی روح ہو۔ در حقیقت ان ساری وجوہات نے عورتوں کو انتہا کی حد تک بدنام اور بے وقعت کرنے میں اہم کردار ادا کیا ہے اور یہ حیرت کی بات نہیں ہے اگر ہم ہندوستانی تہذیب کے اندر ایک ممتاز خاتون شخصیت کو نہیں پاتے ہیں"۱۷۔ زیادہ تر قدیم معاشرے عورتوں کے ساتھ اسی طرح کا سفاکانہ اور سنگدلانہ رویہ رکھتے تھے۔ ہندو مذہب کا مطالعہ کرنے سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ "طے شدہ تقدیر، تیز و تند ہوائیں، موت، زہر، اژدہے، جہنم اور آگ عورتوں سے بڑھ کر مضر نہیں ہیں۔"۱۸ در حقیقت تمام ہی قدیم مذہبی صحیفوں میں حیرت انگیز طور پہ عورتوں کے متعلق بیان کرنے کے لیے نہایت بھدے الفاظ کا انتخاب کرتے ہوئے اسے متضاد طور سے پیش کیا گیا ہے اور اس کی بشریت کی نفی کی گئی ہے۔

بی ایکس ٹن رسل اور ایورل جیسے کچھ محققین کا مؤقف ہے کہ مانویت (منو کا بنایا قانون) عورتوں کی اس طرح کی تذلیل کا حکم نہیں دیتا ہے، وہ صرف اپنے ہی معاشرے کے رسوم و رواج اور روایات کا نشانہ بنی ہیں گو یہ حقیقت ہے کہ مانویت نے عورتوں کو مردوں کے مساوی حقوق نہیں دیئے تھے۱۹۔ اس امر میں اختلاف کے باوجود عام اتفاق رائے یہ ہے کہ ہندوستانی عورتوں کو نہ تو مالی حقوق حاصل تھے اور نہ ہی شہری حقوق، انہیں زندگی بھر ظلم اور تذلیل کا نشانہ بنایا گیا۔

بابلی اور آشوری تہذیبوں میں عورتوں کی حیثیت

بابلی اور آشوری تہذیبوں میں عورتوں پر اسی طرح جبر کیا گیا اور ان کے ساتھ ذلت کا معاملہ کیا گیا جیسا دیگر قدیم تہذیبوں میں عورتوں کے ساتھ ہوا۔ ان کی روایات اور مذہبی رسومات اس بات کا ثبوت ہیں کہ عورتوں کی بشریت اور ان کے معاشرتی کردار کو تسلیم نہیں کیا گیا تھا۔ قدیم تاریخ کی کتابوں سے یہ نتیجہ خود بخود ظاہر ہو جاتا ہے جہاں ان کی زندگی کے مختلف مراحل کو قدرے تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ ان کے یہاں نوجوان عورت اپنے باپ کی ملکیت سمجھی جاتی تھی اور اسے جب بھی مالی مشکلات کا سامنا ہوتا وہ اپنی بیٹی کو جسم فروشی پر مجبور کر سکتا تھا۲۰۔ جہاں تک لڑکی کی شادی کا تعلق ہے تو اسے نیلامی کا نام دے کر بہتر طور پر بیان کیا جا سکتا ہے۔ قانون نے اس بات کا پابند کیا تھا کہ جن کی لڑکیاں شادی کی عمر کو پہنچ گئی ہیں وہ انہیں سال میں ایک مرتبہ لگنے والے بازار میں لے آئیں جہاں سارے مرد اکٹھا ہوتے ہیں۔ نیلام کرنے والا ہر عورت کے مختصر اور ضروری کوائف بیان کرتا اور ایک ایک کر کے بیچ ڈالتا۔ اچھی قیمت حاصل کرنے کے لیے وہ سب سے زیادہ

پر کشش عورت کے ساتھ نیلامی کی شروعات کرتا اور ان عورتوں کو صرف اس شرط پہ فروخت کرتا کہ خریدنے والا ان سے شادی کر لے۔۲۱؎

مزید بر آں سزا سے متعلق قوانین میں عورتوں کے ساتھ بڑی ناانصافی برتی گئی تھی۔ اس میں یہ مقرر کر دیا گیا تھا کہ کسی شخص کے ضرب لگانے سے کوئی لڑکی مر جاتی ہے تو اسے سزا نہیں دی جائے گی۔ اس کے بجائے اس آدمی کی بیٹی کو سزا دی جائے گی، اسے موت کے گھاٹ اتار دیا جائے گا۔۲۲؎

"وہ ہمیشہ اپنے ہاتھوں سے بے شمار کاموں کو انجام دینے کی ذمہ داریوں تلے دبی رہتی۔ لہٰذا اسے اپنی زندگی اپنے شوہر اور گھر کے متعلق اپنے فرائض کی انجام دہی میں ایک مستقل جد وجہد کے ساتھ گزارنی ہوتی۔ اسے روزانہ ندی یا کنویں سے پانی لانے کے لیے صبح سویرے اور دیر شام کو نکلنا پڑتا تھا۔ اسے مکئی کو پیسنا، آٹا گوندھنا، آگ پر پکانا اور سلائی بنائی کرنا پڑتا تھا اور مکان کو آراستہ کرنا بھی اسی کے ذمہ تھا۔ وہ مستقل ہر سہ سالہ دورانیہ پر مشتمل دودھ پلانے کی مدت کے بعد حالت حمل میں ہوتی تھی۔ وہ دن رات جد وجہد کرتی رہتی۔ اس کی زندگی کا واحد مثبت پہلو یہ تھا کہ اسے نقل و حرکت کی آزادی کا حاصل تھی کیونکہ وہ جب چاہتی اپنے شوہر کی اجازت کے بغیر بھی باہر جا سکتی تھی۲۳؎۔ شاید اس آزادی کی وجہ بھی اس کی گھریلو ذمہ داریوں کی نوعیت ہی تھی جس کے سبب اسے باہر جانے کی ضرورت پیش آتی تھی۔

یہی صورتحال بہت ساری عام عورتوں کو درپیش تھی۔ دوسری طرف معاشرہ کے اعلیٰ طبقات سے تعلق رکھنے والی رئیس عورتوں کو عوام کی نگاہوں سے محفوظ رکھا جاتا تھا۔ وہ مکان کے ایک علیحدہ حصے میں رہائش اختیار کرتی تھیں اور جب بھی گھر سے باہر نکلتیں تو خصی کیے ہوئے مرد محافظوں اور نوکروں کے حفاظتی حصار میں ہوتی تھیں۔ ادھر معاشرہ کے نچلے طبقہ سے تعلق رکھنے والی عورتوں کو محض بچہ جننے والی مشین سمجھ لیا جاتا تھا، خاص طور پر اس صورت میں جب وہ نہ تو جہیز لے کر آئی ہو اور نہ والدین سے وراثت میں کوئی چھوٹی سی جائیداد ہی پائی ہو، اس طرح ان کے ساتھ نوکروں اور غلاموں جیسا ہی سلوک کیا جاتا تھا۔۲۴؎

ہیروڈوٹس بیان کرتا ہے کہ بابل کے باشندے جب کسی دشمن کے محاصرے میں گھر جاتے تو اشیاء خوردنی کی بچت کے لیے اپنی بیویوں کو مار ڈالتے تھے۔۲۵؎

اگرچہ اہل بابل کا شادی سے قبل جنسی تعلق قائم کرنے کی آزادی کے تئیں نرم رخ تھا لیکن ایک بیوی کے اپنے شوہر کے ساتھ وفاداری نبھانے کے معاملہ میں وہ بے حد اصول پرست تھے۔ اگر اس سے زنا سرزد ہو جاتا تو اسے کوئی سخت سزا دی جاتی تھی یا قتل کر دیا جاتا تھا۔ "قانون میں یہ التزام تھا کہ اگر کسی کی بیوی زنا کا ارتکاب

کر لیتی ہے تو اسے اس کے عاشق کے ساتھ ہی سزا دی جانی چاہیے۔۲۶؎" اس پر مزید یہ کہ سزائے موت پر عمل درآمد کے لیے محض شک ہونا یا الزام لگایا جانا ہی کافی ہوتا تھا۔ ایک مرتبہ لوگوں نے یہ رائے قائم کرلی کہ فلاں شادی شدہ عورت نے زنا کر لیا ہے تو اسے لا محالہ شوہر کی ناموس کی حفاظت کی خاطر دریا میں ڈال دیا جاتا اگرچہ اس کے خلاف کوئی ثبوت یا گواہ پیش نہیں کیا گیا ہو۲۷؎۔ ان کی جنسی آوارگی نے اپنے پڑوسی ممالک کو حیرت و تعجب میں ڈال رکھا تھا۔ "شادی سے پہلے انہیں مکمل جنسی آزادی حاصل تھی۔ وہ اپنی خواہشات کو جب بھی اور جیسے بھی چاہتے پوری کیا کرتے۔ انہیں اپنی بدکاری کو چھپانے کا بھی خیال نہیں آتا جسے وہ "عارضی شادی" یا "آزمائشی مدت" جیسے بندوبست کے پردے میں انجام دیتے تھے۔" حقیقتاً وہ شادی کی زحمت بھی گوارا نہیں کرتے بلکہ صرف اپنی بنیادی جبلت و جنسی خواہش کی تکمیل میں مشغول رہتے۔ کورٹیس نے سن 42 بعد ولادت مسیح میں لکھا ہے کہ "ان لوگوں کے جنسی طرز عمل سے زیادہ تعجب خیز کوئی چیز نہیں ہے۔ دنیا میں ہم کہیں ایسا کوئی شہر نہیں پاتے جہاں کسی کو بھی اپنی جنسی خواہشات پوری کرنے کے لیے یہ تمام سہولیات میسر ہوں"۲۸؎۔ ول دیورانت نے تو بابل کو "زنا پرست بابل" تک کہا ہے۔

ان کی انتہائی مکروہ روایات میں سے ایک، جسے دیورانت نے "مقدس جسم فروشی" سے موسوم کیا ہے اور جس نے عورتوں کے لیے رہی سہی تمام عزت و وقار اور انسانیت کا جنازہ نکال دیا تھا، وہ یہ تھی کہ بابل کی ہر عورت کو اپنی زندگی میں کم از کم ایک بار "پھولوں کے ہیکل" میں خلوت گزیں ہونا پڑتا اور ایک مکمل اجنبی شخص کے ساتھ جماع کرنا پڑتا تھا۔ امیر عورتیں دوسری عورتوں کے ساتھ میل جول میں متکبرانہ رویہ رکھتی تھیں اور اس طرح ایک بند گاڑی میں سوار ہو کر ہیکل پہنچتیں اور وہاں نوکروں اور خدمت گاروں کی ایک بڑی تعداد کے بیچ بیٹھتیں۔ جہاں تک خواتین کی اکثریت کی بات ہے تو وہ اپنے سروں پر رسی کا تاج لے کر ہیکل میں بیٹھتیں۔ مرد ان کے سامنے سے گزرتے اور اپنی پسند کی عورت کا انتخاب کرتے۔ کسی عورت کو ہیکل چھوڑ کر جانے کی اجازت نہ تھی جب تک کہ کوئی مرد اسے منتخب کر کے اس کی گود میں چاندی کا ٹکرا نہ ڈال دے اور اس کے ساتھ جماع نہ کر لے۔ چاندی کا ٹکرا ڈالتے ہوئے وہ شخص کہتا "دیوتا تمہاری حفاظت کرے"۔ عورت کو چاندی کا ٹکرا خواہ وہ کتنا چھوٹا کیوں نہ ہو، قبول نہ کرنے یا مسترد کر دینے کا کوئی اختیار نہ تھا کیونکہ اسے مقدس اور مبارک سمجھا جاتا تھا۔ پھر وہ جیسا کہتا عورت وہی کرتی اور دیوتاؤں کے لیے اپنے مذہبی فرائض کو تکمیل تک پہنچانے کے بعد آخر کار وہ ہیکل چھوڑ کر اپنے گھر آجاتی۲۹؎۔ خوبصورت عورتیں فطری طور پہ بہت جلد گھر لوٹ آتیں کیونکہ وہ بہت جلد منتخب کر لی جاتی تھیں۔ کم خوش قسمت عورتوں کا انتظار کئی کئی مہینوں اور کبھی سالوں پر محیط ہو جاتا تھا، وہ ہیکل میں ہی قیام کرتیں یہاں تک کہ انہیں خدمت کے لیے منتخب کر لیا جاتا اور اس طرح وہ

قانون کے ذریعہ طے شدہ ذمہ داریوں کو ادا کر پاتی اور گھر لوٹ سکتی تھیں۔"کتنا عجیب یہ قانون تھا!اس کے اصول وضوابط کس قدر شرمناک تھے! یہ ہمیں شدید طور پر ورطہ حیرت میں ڈال دیتا ہے جیسا کہ اس نے ول دیورانت کو کیا تھا"میں سخت حیرت زدہ ہوں کہ اس خلاف فطرت روایت کی اصل کیا تھی؟ کیا یہ روایت جنسی اشتراکی نظام کے باقیات میں سے تھی؟ ہونے والا شوہر اپنی ممکنہ بیوی کا کنوارپن کسی اتفاقی صورتحال میں ملنے والے اجنبی کو سونپنے کی اجازت کیونکر دے سکتا تھا؟ یا یہ کوئی منت تھی جس کے ذریعہ یہ لوگ اپنی عورتوں کا آغاز شباب دیوتاؤں کو بطور نذرانہ پیش کرتے تھے۔۔کون جانتا ہے حقیقت کیا ہے؟ ۳۰؎" وجہ جو بھی رہی ہو، اس گھناؤنی اور غیر اخلاقی روایت کو اس وقت تک بابل میں روبہ عمل لایا جاتا رہا یہاں تک کہ 325 بعد ولادت مسیح میں قسطنطین نے آکر اسے ختم کردیا۔

بابل جیسے تجارتی مراکز میں عورتوں کو جو مثبت حقوق دیئے گئے تھے وہ صرف یہ تھے کہ عورتوں کو جائیداد کی ملکیت کا حق حاصل ہے، وہ اپنی دولت اور مال وراثت پر مکمل اختیار رکھ سکتی ہیں۔

فارسی تہذیب میں عورتوں کی حیثیت

فارس میں عورتوں کی حالت کافی غیر متوقع تھی، معاشرہ میں ان کی حیثیت عدم استحکام کا شکار تھی۔ عورتوں کی یہ حالت ملک کی مجموعی صورتحال اور مرد قانون سازوں اور حکمرانوں کی سوچ وفکر کے سبب بدلتی رہتی تھی، وہ قانون ساز جن کے بنائے ہوئے قوانین ایک صدی سے دوسری صدی اور ایک عہد حکمرانی سے دوسری عہد حکمرانی میں جاکر تبدیل ہو جایا کرتے تھے۔ زرتشت کی عہد حکمرانی سے قبل فارسی عورتوں سے نہایت تحقیر آمیز سلوک روا رکھا جاتا تھا، معاشرہ اس کی حیثیت تسلیم کرنے سے انکاری تھا۔ اس حکمراں نے اگرچہ اپنے ارد گرد کی عورتوں کی دیکھ بھال اور حفاظت کی لیکن تب جب کہ انہیں اغوا کرکے زبردستی ساتھ لے آیا۔ اس نے عورتوں کو متعدد حقوق دیئے، مثال کے طور پہ اپنے لیے شوہر کا انتخاب کرنے کا حق، طلاق مانگنے کا حق، ملکیت کا حق اور ان کے مالی امور پر انہی کا مکمل اختیار ہونا جیسے حقوق۔ بدقسمتی سے یہ صورتحال زیادہ دن قائم نہیں رہی۔ اس کا اختتام زرتشت کی حکمرانی کے خاتمہ کے ساتھ ہی ہو گیا اور عورتوں کے ہاتھ ایک مرتبہ پھر ذلت وخواری آئی۔

ایک عسکریت پسند قوم ہونے کے ناطے فارس کے باشندے اولاد نرینہ کے لیے پسندیدگی رکھتے تھے چونکہ وہ آگے چل کر اپنے آباء کو مالی منفعت پہنچاتے اور جنگ کی حالت میں لشکر کا اہم رکن ثابت ہوتے تھے۔

دوسری طرف والدین کو لڑکیوں سے کوئی فائدہ نہیں پہنچتا تھا لہٰذا انہیں ان کے والدین کہیں چھوڑ دیا کرتے یا کم سنی میں ہی ان کی شادی کر دی جاتی تھی۔ ایک قول ان کے یہاں عام تھا کہ "مرد خدا سے بیٹیاں نہیں مانگا کرتے اور فرشتے انہیں انسانوں کو عطا کردہ فیوض و عطیات میں شمار نہیں کرتے ہیں"۳۱۔ ایک اور حقیقت جو اس بات کی تصدیق کرتی ہے کہ فارسی تہذیب میں عورتیں نظر انداز کی گئی تھیں، وہ یہ کہ کیسنون نے فارس کی ثقافت اور تعلیمی صورت حال کا مطالعہ کرتے ہوئے عورتوں کا کہیں ذکر ہی نہیں کیا ہے۔ اس نے ان کی تعلیم اور پرورش کے تعلق سے کچھ نہیں بتایا ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ تعلیم کی فراہمی اور ذہنی نشو نما کے معاملے میں ان سے صرف نظر کیا گیا ہے، انہیں مغلوب اور معاشرتی زندگی سے بالکل کاٹ کر رکھا گیا ہے۳۲۔ ول دیورانت نے اس بات کے درست ہونے کی تائید کی ہے کہ اس معاشرے میں تعلیم لڑکوں کے لیے مخصوص تھی اور ان میں بھی خاص طور پر ان لڑکوں کے لیے جو اعلیٰ سماجی طبقے سے تعلق رکھتے تھے، انہیں عموماً پادری تعلیم دیا کرتے تھے۔۳۳

جہاں تک خاندانی نظام کے اندر عورتوں کی حیثیت کا تعلق ہے تو "ایک عورت نے وہاں پورے طور سے مرد کی بالادستی کے آگے خود حوالگی کر رکھی تھی جہاں اس مرد کو یہ حق حاصل تھا کہ چاہے تو اسے مار دے یا اپنی مرضی اور خواہش کا پابند رکھ کر اسے زندگی گزارنے کی اجازت دیدے۔ اس نے اس سے کسی سامان کی طرح سلوک کیا، تجارت کی کوئی چیز یا پرانے فرنیچر کے ایک ٹکڑے سے زیادہ اسے نہیں سمجھا"۳۴۔ مزید یہ کہ اہل فارس نے عورتوں کو جرم پر ابھارنے والی چیزوں کی فہرست میں شامل کیا جو زن، زمین اور سونے پر مشتمل تھی۔۳۵

وہ عورتوں کو حیض کے دوران اور زچگی کے بعد بھی نجس سمجھتے تھے۔ عورتوں پر دوسرے لوگوں کے ساتھ گھلنے ملنے کی پابندی تھی کیونکہ انہیں عورتوں سے نجاست کے پھیلنے کا خطرہ تھا۔ مرد اپنی بیویوں کو حتیٰ کہ ان اشیاء کو بھی نہیں چھوتے تھے جو ان کی ماہواری کے دوران ان کے آس پاس ہوتی تھی۔ عمر کحالہ نے احمد احیاف کا حوالہ دیتے ہوئے کہا ہے کہ "دوران حیض اور زمانہ پس ولادت میں عورتیں اپنے گھروں کو چھوڑ کر چھوٹے خیموں میں رہائش اختیار کر لیتی تھیں جو خاص طور پر انہیں کے لیے شہر کے مضافات میں بنایا گیا تھا، انہیں 'بے قاعدہ پن' کہا جاتا تھا"۔

یہاں تک کہ وہ خادم جو ان کو کھانا پیش کرنے کے کام پر مامور تھے، انہیں اپنی ناک اور کانوں کو بند رکھنا ہوتا تھا اور اپنے ہاتھوں کو کسی دبیز چیز میں لپیٹ کر رکھنا ہوتا تھا۔ مذکورہ احتیاطی تدابیر وہ اس خیال سے اختیار کرتے

تھے کیونکہ انہیں لگتا تھا وہ بھی نجاست سے ملوث ہو جائیں گے اگر انہوں نے حائضہ عورت کو چھو لیا یا اس کے ارد گرد موجود کسی شے بشمول ہوا سے ان کا لمس ہو گیا"۔۳۶

رومی تہذیب میں عورتوں کا مقام

رومی تہذیب میں عورتوں کی صورتحال دیگر قدیم تہذیبوں سے کسی صورت بہتر نہیں تھی۔ انہیں ہر قسم کے ظلم و ستم سے گزرنا پڑا اور اپنی معاشرتی زندگی کے تمام پہلوؤں میں دھتکار کا سامنا کرنا پڑا، "روم کے لوگ عورتوں سے نفرت کرتے، اپنے یہاں لڑکی کی پیدائش کو سخت ناپسند کرتے اور ان کی روایات میں اس بات کی چھوٹ تھی کہ ایک باپ اپنی بچی کو موت کی نیند سلا سکتا ہے۔ جبکہ دوسری طرف وہ لڑکوں کی پیدائش پر بے حد مسرور ہوتے۔ اس طرح کا سلوک ہونے کے پیچھے وجہ یہ تھی کہ کچے دیہی علاقوں میں لڑکے اپنے والدین کے لیے حصول آمدنی کا ایک ذریعہ سمجھے جاتے تھے"۔۳۷ اس کے نتیجے کے طور پر لڑکوں کو سائنسی علوم اور فنون پڑھایا جاتا تھا جبکہ لڑکیوں کی تعلیم امور خانہ داری سکھائے جانے تک ہی محدود تھی۔۳۸

رومی قانون نے عورتوں کو تاحیات ان کے شہری حقوق سے محروم کر رکھا تھا۔ شادی سے پہلے ایک عورت اپنے خاندان کے سربراہ کے ماتحت ہوتی تھی، خاندان کا یہ سربراہ اس کا باپ یا دادا ہو سکتا تھا۔ اس ماتحتی نے اسے عورت کی زندگی کے اوپر مکمل اختیار دے رکھا تھا۔ وہ اپنی ماتحت عورت کو قتل کرنے یا پھر خاندان بدر کر دینے یا کہیں فروخت کر ڈالنے تک کا حق رکھتا تھا۔ عورت کی شادی کے بعد یہ مطلق اختیار اس کے شوہر کو سونپ دیا جاتا تھا، اس طرح اپنے گھر والوں کے ساتھ اس کے تمام تعلقات اختتام کو پہنچ جاتے تھے۔۳۹

وہ اس قدر نامسعود کیفیت سے دوچار تھی کہ لوگ اسے اس کے شوہر کے ذریعہ قیمت ادا کر کے حاصل کی جانے والی کسی شے کی طرح سمجھتے تھے۔ مؤخر الذکر اس کے والد کو ایک خاص رقم ادا کرتا اور اس کے عوض میں حاصل کی جانے بیوی کو گھر کا سارا کام کرنا پڑتا تھا، اسے بغیر کوئی احتجاج کیے اور اپنی حالت پر بنا کسی سوال کے ہر طرح کے کاموں کا ذمہ اٹھانا ہوتا تھا۔ وہ اپنے شوہر کے گزر جانے کے بعد اس کے اثاثے پر اپنا دعوی پیش کرنے کا استحقاق نہیں رکھتی تھی، جبکہ شوہر اگر چاہے تو بیوی کو اس کے بعد ملنے والی کسی بھی وراثت سے یونہی محروم رکھ سکتا تھا۔۴۰

اسے اپنے شوہر کے ذریعہ کی جانے والی ناانصافی پر معترض ہونے کا بھی حق حاصل نہیں تھا، تاہم ایسا کرنا اس کے شوہر کے لیے اشتعال انگیز ضرور ہو سکتا تھا کیونکہ وہاں بیوی کو قتل کر دینا یا بیچ ڈالنا جائز امر تھا۔ قانون

نے یہ مانا تھا کہ عورتیں شعوری صلاحیت کی مالک نہیں ہو سکتیں اور نہ ہی انہیں آزادی کا حق تفویض کیا جا سکتا تھا۔۴۱

رومیوں نے عورتوں کو تخلیقی طور پر غبی اور کند ذہن بیان کیا تھا۴۲۔ حالانکہ کچھ تاریخی متون سے یہ اشارہ ملتا ہے کہ محض ایک ماں کی ہستی ان کے یہاں محترم اور قابل عزت ہوتی تھی مگر وہ بھی صرف اس صورت میں جب کہ اس نے خود کو اپنے گھر اور کنبے کے لیے وقف کر دیا ہو۔ "ماں کا احترام کیا جاتا تھا اور اسے 'مادر کنبہ' کا لقب دیا جاتا تھا۔ تاہم وہ اس محترم سلوک اور لقب کی تبھی مستحق ہو سکتی تھی جب وہ ایک بے غرض و بے لوث ماں ہو اور اپنی تمام ذمہ داریوں کو ثابت قدمی کے ساتھ پورا کرتی رہی ہو۔ اس کے اہل خانہ اس کی قبر پر تحریر کرتے کہ وہ ہمیشہ اپنے گھر میں رہی، اس سے باہر نہیں گئی۔ وہ کڑھائی اور بنائی کا مشغلہ رکھتی تھی۔ وہ یقینی طور پہ ایک مخلص گھریلو خاتون تھی"۔۴۳

یونانی تہذیب میں عورتوں کی حیثیت

یونانی تہذیب میں عورتوں کی صورتحال کسی طور تسلی بخش نہیں تھی، سماجی پائیدان پر ان کا مقام مردوں سے بہت پست تھا۔ خواتین پر کلام کرتے ہوئے یونانی شاعروں اور ادیبوں نے جو کچھ تحریر کیا وہ طنز و تعریض اور ہجو گوئی پر مبنی تھا۔ اگرچہ یونانی اپنے وقت میں فکری ترقی اور سائنسی دریافتوں کے لیے معروف تھے لیکن اس کے باوجود انہوں نے عورتوں کے ساتھ ہتک آمیز سلوک روا رکھا اور ان کے ساتھ برابر ناانصافی کرتے رہے۔ انہوں نے اس کے حق بشریت کا انکار کیا اور اس کے احساسات کو یکسر نظر انداز کر دیا۔

حالات ایسے تھے کہ ایک عورت نے اگر ایک ناقص بچے کو جنم دیدیا تو اسے موت کے منہ پہنچا دیا جاتا تھا۔ مونسیئر ٹرائلونگ بتاتے ہیں "وہ عورتیں نہایت بدقسمت تھیں جنھوں نے فوج میں بھرتی کے لیے موزوں کسی صحت مند بچے کو جنم نہیں دیا تو موت کے گھاٹ اتار دی گئیں"۔۴۴

یونانیوں کا یہ خیال تھا کہ عورتوں کی زندگی کے دو ہی مقاصد ہیں؛ بچوں کو جنم دینا اور گھریلو کام کاج انجام دینا۔ ٹرائلونگ کا مزید کہنا ہے کہ "کثرت سے بچہ جننے والی عورت اس کے شوہر سے برہنہ ہی چھین لی جائے گی ملک کے مفاد میں دیگر مردوں سے حاملہ ہو کر مزید بچے جنم دینے کے لیے"۔۴۵

گو کہ یونان کے باشندے ادب اور سائنس میں بہت آگے تھے لیکن لڑکیوں کو وہاں اکثر ان علوم کو حاصل کرنے سے روکا جاتا تھا۔ "ایتھنس میں اچھے گھرانوں کی لڑکیوں کو ان کے گھروں کے اندر ہی لکھنا اور پڑھنا

سکھایا گیا تھا۔ جہاں تک غریبوں اور کم خوش نصیبوں کا تعلق ہے تو گھریلو کام کاج کو انجام دیتے ہوئے ہی ان کی کم علم ماؤں کے ذریعہ کچھ مذہبی علم ان تک منتقل کر دیا گیا تھا۔ ایک استثنائی صورتحال صرف اسپارٹا میں ملتی ہے جہاں لڑکیوں کو تعلیم کے معاملہ میں لڑکوں کی طرح ہی پروان چڑھایا گیا تھا، اس میں موسیقی اور جسمانی ورزش کی تربیت بھی شامل تھی"۴۶۔ اسپارٹا میں عورتوں کو یہ حقوق صرف اس لیے حاصل ہوئے کہ اسپارٹا ایک عسکری اہمیت کا حامل شہر تھا جس کو مضبوط جنگجوؤں کی ضرورت تھی۔ لہٰذا انہوں نے عورتوں کو ضروری تربیت فراہم کی جس میں مختلف جسمانی ورزشیں شامل تھیں جیسے کشتی لڑنا، آہنی پلیٹ اور نیزہ و بھالا پھینکنا وغیرہ۔ جبکہ دوسری طرف ایتھنس میں عورتوں کی تعلیم و تربیت صرف گھر کے کاموں تک ہی محدود تھی۔

باپ اپنی بیٹیوں پر مکمل اختیار رکھتے تھے۔ "ایک نوجوان عورت کے اوپر اس کے سرپرست کی غیر محدود بالادستی تھی۔ وہ اس سے مشورہ طلب کیے بغیر ہی اس کی شادی کر دینے کا اہل تھا جبکہ دوسری صورت میں مذکورہ عورت کی شادی اس کے سرپرست کے رضامند ہوئے بنا غیر قانونی تصور کی جاتی تھی۔ اس کے باپ کی موت کے بعد اس کے بھائیوں کو ساری وراثت مل جاتی تھی اور اگر اس کے پاس بھائی نہ ہوں تو وہ خود مال وراثت کا حصہ بن جاتی۔ اس کا آسان مطلب یہ ہوا کہ اسے اپنے باپ کے سب سے بڑے وارث کی بیوی بننا ہوتا۔ اس کے بچے کا نام اس کے نانا کے نام پر رکھا جاتا اور اس طرح دولت اور املاک اس بچے کو منتقل ہو جاتی تھی۔ اسے دوسری طرح کہا جائے تو یہ اس کا لڑکا تھا جو اس کے (عورت کے) باپ کا وارث تھا، نہ کہ خود اس کا"۔۴۷

یہ یونانی تہذیب میں عورتوں کے ساتھ ہونے والی ناانصافیوں میں سے صرف ایک کا ذکر تھا۔ "مرد قانون سازوں نے عورت کو اس کے شہری حقوق سے محروم کر دیا تھا اور اسے اپنی زندگی کے مختلف مراحل میں مردوں کے مطلق اختیارات کے آگے مجبور کر دیا تھا۔ شادی سے پہلے وہ اپنے باپ کی ملکیت تھی اور شادی کے بعد اپنے شوہر کی"۴۸۔ ایک عورت اپنی ذمہ داری کی ادائیگی کی اہل نہیں سمجھی جاتی تھی اور اسی لیے اسے ساری عمر ایک سرپرست کی راہنمائی کی ضرورت ہوتی تھی۔ ایک نوجوان لڑکی کی حیثیت سے وہ اپنے والد کے زیر سرپرستی تھی، بطور بیوی اپنے شوہر کے جبر تلے جیتی تھی یا اپنے والد کے ورثاء کے ماتحت رہتی تھی اگر اس کے شوہر اور باپ دونوں مر چکے ہوں۔

ارسطو نے واضح کر دیا تھا کہ "پیدا کرنے اور پالنے والی فطرت نے عورتوں کو دانشورانہ صلاحیتیں عطا نہیں کی ہیں، لہٰذا ان کی تعلیم و تربیت کو صرف گھریلو کام کاج، مادریت، دیکھ بھال اور اسی طرح کے دیگر کاموں تک

محدود رکھنا چاہیے"۔ اس فلسفیانہ نظریہ کے اظہار کے بعد اس نے عورتوں کو ان بدنصیب لوگوں کی فہرست میں شامل کر دیا جن کو آزاد زندگی جینے کا کوئی حق نہیں تھا۔ "تین قسم کے لوگوں میں اپنے فیصلے لینے کی نہ اہلیت ہے اور نہ ہی صلاحیت ہے:

غلام کی کوئی مرضی نہیں ہوتی ہے۔

بچہ ناقص قوت ارادی کا حامل ہوتا ہے۔

عورت کے پاس اس کی مرضی ہوتی ہے مگر وہ بے بس اور لاچار ہوتی ہے۔"۴۹؎

افلاطون جو "عقلی دبستان" کا سرخیل ہے اس معاملے میں ارسطو سے کوئی زیادہ شعور نہیں رکھتا تھا۔ "اس نے عورتوں کی غلاموں اور بچوں کے درجے میں ہی زمرہ بندی کی۔ اس نے یہ تاثر قائم کیا کہ مرد عورتوں سے برتر ہیں جبکہ یوروپیدس نے درج کیا ہے کہ عورتیں اچھی ملازمت کرنے کے لیے ناقص اور نااہل ہیں اور وہ معاشرے کو مستقل طور پہ اپنے مذموم افعال کے ذریعہ خراب کرتی رہتی ہیں،"۵۰؎

"ایسا لگتا ہے کہ خواتین کے بارے میں یہ متکبرانہ رویہ یونانی مفکرین، ادیبوں اور فلسفیوں میں غالب تھا۔ یونانی مزاح کا سب سے بڑا نمائندہ ارسطوفان اپنے طنزیہ مذاق اور عورتوں کے سماجی تمسخر کے لیے مشہور تھا۔ اس کے مزاحیہ ڈرامہ "لیستراتا" میں اس کا ایک کردار کہتا ہے: "ہم عورتیں اپنی دانش، لپ اسٹک اور شفاف کپڑوں کے ساتھ ایک حلقے میں اکٹھے بیٹھنے کے سوا کیا کر سکتی ہیں۔۔۔؟"۵۱؎ ان کی رائے میں عورت ایک عیب دار مخلوق تھی۔ ارسطو نے کہا تھا "ایک مرد کے منہ سے نکلی ہوئی بات عورت کی بات کے مساوی نہیں ہے اور فطرت پہلے ہی عورتوں اور غلاموں دونوں کی حیثیت کو متعین کر چکی ہے"۔ الغرض کہ ان لوگوں نے ہر نقص و عیب کو عورتوں سے منسوب کر دیا تھا۔ جب وہ کسی مرد کی توہین کرنا چاہتے تو اسے "عورت" کہہ دیتے، یہ حقیقت "اِلیاذہ" میں واضح ہے"۔۵۲؎

یہ تھی یونانی تہذیب میں عورتوں کی صورتحال۔ وہ مظلوم تھیں اور اپنے حقوق سے محروم تھیں۔ وہ مردوں کے ظلم و ستم کے سامنے مکمل طور پر سر تسلیم خم کرنے کو مجبور تھیں جن کا ان کی زندگی پر مکمل اور مطلق اختیار تھا۔

مصری تہذیب میں عورتوں کا مقام

اپنی ہم عصر تہذیبوں کے برعکس مصری تہذیب میں لوگ عورتوں کے بے حد قدردان تھے اور ان کی تعظیم کرتے تھے۔ ”مصری تہذیب میں عورتوں کو عزت و وقار حاصل تھا۔ مصریوں نے اپنا ملک ان کے سپرد کر دیا تھا۔ انہوں نے انفرادی طور پر یا بالواسطہ مصر پر حکمرانی کی۔ ان حکمراں عورتوں نے قوانین بنائے، خارجہ امور کا نظم و نسق سنبھالا اور اچھے سیاستداں تیار کیے۔ مصریوں نے ان کی عظمت و قوت اور سطوت و وقار کی یاد میں مجسمے نصب کیے“۔ ۵۳؎

اگرچہ اس خوشگوار صورتحال نے مصر کی کل آبادیٔ نسواں کا احاطہ نہیں کیا تھا۔ تاہم مصری تہذیب ”واحد تہذیب رہی جس نے عورتوں کو اپنی قوم کے متفقہ تسلیم کردہ آئینی مرتبے سے سرفراز کیا۔ یہ وہ واحد تہذیب بھی تھی جس نے عورتوں کو مرد آبادی کو دیئے گئے حقوق کی طرح ہی مکمل شہری حقوق عطا کیے“ ۵۴؎۔ ”اگر شادی کے وقت اتفاق رائے ہو گیا تو اس نے اپنے کنبے کے اخراجات میں بھی حصہ ڈالا۔ بچوں اور دیگر گھریلو معاملات کے حوالے سے اس نے اپنے فیصلے آپ لیے۔ جب شوہر فوت ہوا تو اس نے کمسن بچوں پر اپنی تحویل حاصل کی اور کنبہ پر اپنا مکمل اختیار پایا، خاندانی اور حکومتی ہر دو تعلق سے“ ۵۵؎۔ عورتوں کی حیثیت کافی مستحکم رہی سوائے ان ادوار کے جب ملک کو سیاسی یا فوجی بدامنی کا سامنا رہا۔ ایک مرتبہ ملک پر منڈلاتے خطرات ٹل گئے تو عورتوں کو دوبارہ اجازت تھی کہ وہ اپنا مقام حاصل کر لیں۔

مؤرخین یہ معلومات مختلف دریافت شدہ دستاویزات، زمین کی کھدائی سے حاصل ہونے والی اشیاء اور ملبوسات سے اکٹھا کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ حاصل کیے ہوئے یہ سارے شواہد ہمیں مصریوں کے رسوم و رواج کے تعلق سے گراں قدر معلومات مہیا کراتے ہیں۔ مصر کی قدیم تہذیب پر لکھے ہوئے اپنے مقالے میں تحفہ احمد السید حندوسہ ان نقاشیوں اور مصوری پر روشنی ڈالتے ہوئے یوں تبصرہ کرتے ہیں کہ وہ ”مضبوط خاندانی رشتے کی ایک حقیقی شبیہ پیش کرتی ہیں۔ ان میں سے کچھ گھروں کے اندر کی زندگی کی عکاسی کرتی ہے جبکہ کچھ عورت کے اپنے شوہر کے ساتھ کھیت میں کام کرنے کو اور پورے کنبے کے ایک ساتھ سیر و تفریح یا شکار پر نکلنے کو دکھلاتی ہے۔ ہمارے پاس وہ عکوس بھی ہیں جن میں ایک بیوی اپنے شوہر کو دلاسہ دے رہی ہے یا اس کے ساتھ مل کر عبادت کر رہی ہے“۔ ۵۶؎

اس طرح مصری عورتوں کو دوسری قدیم تہذیبوں کی عورتوں کی طرح ذلت اور غیر انسانی سلوک کا سامنا نہیں کرنا پڑا تھا۔ فرانسیسی مصنف اکسندر موری کا کہنا ہے کہ قدیم مصری تہذیب میں عورت کو نہ تو نظر انداز کیا گیا اور نہ ہی مسترد کیا گیا تھا۔ ”اس کے برعکس وہ عزت کی نگاہ سے دیکھی جاتی تھی، وہ اپنے کنبے کے لوگوں کے

ساتھ ہی رہی باوجود اس کے کہ وہ مردوں کی طرف سے بالکل آزاد تھی۔ فرعونوں نے عورتوں کی بہت تعظیم و توقیر کی کیونکہ وہ انہیں قوم کے اتحاد و بقا اور افزائشِ تسلسل کی بنیادی وجہ سمجھتے تھے"۔۵۷

عورتوں کو "خاتون خانہ" کے خطاب سے نوازا گیا تھا۔ بیوی اپنے شوہر کے ہر اچھے برے حالات میں اس کے ہمراہ رہی، وہ تھیٹر جاتے ہوئے بھی کبھی ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوئے۔ بیوی اپنے شوہر کی شریک اور ساجھی تھی۔ انہوں نے ہمیشہ ایک دوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے ساتھ ساتھ چہل قدمی کی جیسا کہ ان کی یادگاروں اور قبروں پر موجود پینٹنگز اور نقش و نگار میں دکھایا گیا ہے۔ حکما و صلحا کے فرامین سے بھی یہ پتہ چلتا ہے کہ مصری لوگ اپنی بیویوں کے ساتھ پیار اور شفقت کا معاملہ کرتے تھے۔ حکما نے اپنے لڑکوں کو ہدایت کی کہ وہ اپنی بیویوں کے ساتھ حسن سلوک کریں اور ان کے لیے پر مسرت و آرام دہ زندگی کو یقینی بنائیں۔ بتاح حتب کہتے ہیں "اپنی اہلیہ کے ساتھ محبت و شفقت کے ساتھ پیش آؤ اور ان کی ضروریات فراہم کرو۔ عطر اور روغن اس کے جسم کے لیے دوا ہے۔ ساری زندگی اس کے قلب کو راحت پہنچاؤ۔ بلاشبہ وہ اپنے شوہر کے لیے ایک زرخیز زمین ہے"۵۸۔ آنی کا کہنا ہے "اپنی بیوی کو اس کے گھر میں حکم نہ دیں اگر آپ جانتے ہیں وہ ایک قابل عورت ہے۔ اسے نہ کہیں 'فلاں فلاں چیزیں کہاں ہیں، اسے حاضر کرو' اگر اس نے انہیں ان کی جگہوں پر رکھ دیا ہو۔ خاموشی کے ساتھ اس کے عمل کا مشاہدہ کریں"۵۹۔ بدلے میں مصری عورتیں شائستہ، محبت کرنے والی اور اپنے شوہروں کی فرمانبردار ہوتی تھیں، وہ اپنے گھر اور بچوں کی اچھی دیکھ بھال کرتی تھیں۔

> سید تحفہ احمد سید اپنے مقالے میں بعنوان "شوہروں کے تئیں خواتین کے فرائض" لکھتے ہیں کہ "مصری عورت ایک ساتھ فرمانبردار بیوی، کامل گھریلو خاتون اور ایک مثالی ماں تھی۔ ملنے والے نقش و نگار اور دستیاب قدیم متون سے یہی ظاہر ہوتا ہے۔ مذکورہ چیزیں ایک بیوی کی اپنے شوہر کے حق میں تعظیم اور اس کے احساسات کو اس طرح دکھلاتی ہیں گویا وہ اس کا آقا تھا۔ بیوی نے اپنے شوہر کے مکان کو ایک خیر مقدم کرنے والے گھر میں تبدیل کرکے رکھ دیا تھا۔ وہ شام کو گھر پہنچتا تو اپنی بیوی کو اس حال میں پاتا کہ وہ اسے پانی ڈالنے اور ہاتھ دھلانے کے لیے تیار ہوتی، پھر وہ خود سے تیار کیا ہوا کھانا شوہر کے سامنے پیش کرتی"۔۶۰

پس انہوں نے معاشرے میں اپنے اعلیٰ مقام کے باوجود اپنے شوہر کی تابعداری کی۔ "قبروں سے ملنے والی نقاشیوں سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ عورتیں شوہروں کے تئیں اپنی ذمہ داریوں کو نہایت مقدس فریضہ خیال کرتی تھیں اور خود کو ان سے کم رتبہ سمجھتی تھیں۔"

مادری نسب کے اصولوں کی پیروی کرتے ہوئے بچوں کے حسب و نسب کا تعین ماں کے شجرۂ نسب کے ذریعہ کیا جاتا تھا جو کنبہ کے افراد کے درمیان نہایت محترم تھی، حالانکہ نسب پدری کو بھی وسیع پیمانے پر مقبولیت حاصل تھی۔ اس کے پس پردہ مادریت کے اصل تصور کی ترغیب و تاثیر بھی وجہ ہو سکتی ہے، جس کے آثار کمزور سلطنتوں کے زمانے تک ملنے چاہیے۔ اس دور کی نقاشیاں یہ ظاہر کرتی ہیں کہ نانی ماں سب سے آگے چل رہی ہوتی ہے اور تمام افراد خانہ کی تقدیم کر رہی ہوتی ہے۔

مصری تہذیب میں خواتین کی اعلیٰ حیثیت کے باوجود مرد وارث بننے اور تخت نشین ہونے کے معاملے میں برتری رکھتے تھے۔ "اگرچہ عورتوں کو تخت پر بیٹھنے کا حق حاصل تھا لیکن یہ حق صرف مرد وارث کی عدم موجودگی میں ہی قابل عمل تھا۔ یہ قانون 3000 قبل مسیح میں نافذ کیا گیا تھا۔ تاریخی ریکارڈ کے مطابق مصری فرمانرواؤں میں 470 بادشاہ جبکہ 5 خواتین حکمراں گزری ہیں۔ جب ایک ملکہ تخت نشین ہوتی تو یہ محسوس کرتی کہ وہ ایک ایسے عہدے پر براجمان ہے جس پر صحیح معنوں میں اس کا حق نہیں تھا۔ لہٰذا ملکہ ہاتشوب جس نے 1550 سال قبل مسیح میں اپنے ملک پر حکمرانی کی ہے، وہ رائے عامہ کی تعمیل میں مردوں کا لباس پہننے کی پابند تھی"۔ ۶۱

اس کی اعلیٰ منصبی کے باوجود قانون اسے سخت اور کسی حالت میں نہ تبدیل ہونے والے قواعد و ضوابط کو ماننے پر مجبور کرتا تھا۔ "قانون میں یہ شرط رکھی گئی تھی کہ دوران حیض کوئی بھی عورت کو ہاتھ نہ لگائے۔ ان دنوں اسے ایک خاص جگہ "ہریری" تک محدود کر دیا جاتا تھا" ۶۲۔ مزید برآں زناکاری کو ایک بڑا گناہ سمجھا جاتا تھا، ایک عورت اگر ناجائز جنسی عمل کی مرتکب ہو جائے تو اسے موت کی سزا دی جاتی تھی ۶۳۔ درحقیقت فوجداری قانون اپنے آپ میں غیر منصفانہ تھا کیونکہ ایک عورت کی اس کے شوہر کے ساتھ وفاداری میں محض شک کی بنیاد پر ہی اسے سزائے موت دیدی جاتی تھی۔ ۶۴

مصری تہذیب میں خواتین کی اعلیٰ حیثیت کئی صدیوں تک برقرار رہی لیکن پھر یونانی ثقافت کے زیر اثر آکر تنزلی کا شکار ہو گئی۔ "اسی زمانہ میں رومی سلطنت کے زوال کے بعد زندگی سے نفرت کرنے کا رجحان پیدا ہوا، کیونکہ اس سے پہلے لوگ عیش و عشرت میں ڈوبے ہوئے تھے۔ اور لذت اندوزی و شہوت رانی میں غرق ہونے کی وجہ سے ان کی زندگی فساد و بگاڑ کی آماجگاہ بن گئی تھی، لہٰذا اب رد عمل کے طور پر انہیں اپنی زندگی اور اہل و عیال سے نفرت ہی ہو گئی۔ اس کی وجہ سے ان کے اندر زاہدانہ زندگی گزارنے کا رجحان پیدا ہوا اور یہ عقیدہ رکھا کہ انسانی جسم عام طور پر اور عورتیں خاص طور پر کوئی سراپ تھیں، لہٰذا انہیں ترک کرنا نہایت دانشمندی کی

علامت تھی۔ مصر میں پروان چڑھنے والی اس رومی الاصل فکر نے عورتوں کے معاملات کے تعلق سے مصری معاشرے میں قائم تمام چیزوں کو ختم کر دیا۔ مزید یہ کہ رومیوں کی استبدادیت نے بہت سے مصریوں کو دنیا کی غیر حقیقی اور فانی چیزوں کو ترک کر کے راہبانہ زندگی گزارنے پر مجبور کر دیا تھا۔ اس طرح مصری قانون و ضوابط کا خاتمہ عہد اسلامی سے پہلے ہی ہو گیا"۶۵۔ عمر کحالہ واضح کرتے ہیں کہ بطالسہ جنہوں نے عورتوں کو مردوں کے زیر اختیار کر دیا تھا اور انہیں ان کے حقوق سے محروم کر دیا تھا، مصر میں ان کے اقتدار سے پہلے عورتوں کی صورتحال بہتر تھی۔۶۶

حواشی:

۱۔ المرأة ذلک اللغز، مؤلفہ عباس محمود عقاد، ص۱۱ (معمولی تصرف کے ساتھ)

۲۔ قصة الحضارة، مؤلفہ ول دیورانت، جلد۴، مجلد ا، ص۲۷۲ (المرأة فی الصین)

۳۔ حوالہ سابق، جلد۴، مجلد ا، (المرأة فی الصین)

۴۔ مكانة المرأة فی الشئون الإدارية و البطولات القتالية، مؤلفہ العمید رکن محمد ضاہر وتر، ص۳۷۴

۵۔ قصة الحضارة، مؤلفہ ول دیورانت، جلد۴، مجلد ا، (المرأة فی الصین) معمولی تصرف کے ساتھ

۶۔ حوالہ سابق، ص۲۷۳ (معمولی تصرف کے ساتھ)

۷۔ الأسفار المقدسة فی الأديان السابقة، مؤلفہ علی عبدالواحد وافی، ص۱۶۸

۸۔ المرأة فی القديم و الحديث، مؤلفہ عمر رضا کحالہ، ص۱۳۷-۱۳۸

۹۔ قصة الحضارة، مؤلفہ ول دیورانت، جلد۴، مجلد ا، ص۱۷۷

۱۰۔ حوالہ سابق، مجلد۳، ص۱۱۸۱

۱۱۔ مكانة المرأة فی الشئون الإدارية و البطولات القتالية، مؤلفہ عمید رکن محمد ضاہر وتر، ص۳۴۵

۱۲۔ المرأة فی القديم و الحديث، مؤلفہ عمر رضا کحالہ، ص۱۳۶

۱۳۔ حوالہ سابق

۱۴۔ حوالہ سابق

۱۵۔ قصۃ الحضارۃ، مؤلفہ ول ڈیورانٹ، جلد ۳، ص ۱۸۱

۱۶۔ حوالہ سابق، جلد ۳، ص ۱۷۷

۱۷۔ المرأۃ فی القدیم و الحدیث، مؤلفہ عمر رضا کحالہ، ص ۱۳۶

۱۸۔ حضارۃ العرب، مؤلفہ گستاف لوبون، ص ۴۰۶

۱۹۔ المرأۃ فی القدیم و الحدیث، مؤلفہ عمر رضا کحالہ، ص ۱۳۴

۲۰۔ قصۃ الحضارۃ، مؤلفہ ول ڈیورانٹ، جلد ۲، ص ۲۳۴

۲۱۔ حوالہ سابق، جلد ۲، ص ۲۳۲

۲۲۔ حوالہ سابق

۲۳۔ المرأۃ فی القدیم و الحدیث، مؤلفہ عمر رضا کحالہ، ص ۱۳۴

۲۴۔ قصۃ الحضارۃ، مؤلفہ ول ڈیورانٹ، جلد ۲، ص ۲۳۴

۲۵۔ حوالہ سابق، ص ۲۳۲

۲۶۔ حوالہ سابق

۲۷۔ حوالہ سابق

۲۸۔ حوالہ سابق، ص ۲۳۴

۲۹۔ المرأۃ فی القدیم و الحدیث، مؤلفہ عمر رضا کحالہ، ص ۱۲۸

۳۰۔ قصۃ الحضارۃ، مؤلفہ ول ڈیورانٹ، جلد ۲، ص ۲۳۰

۳۱۔ حوالہ سابق، ص ۴۴۲

۳۲۔ المرأۃ فی القدیم و الحدیث، مؤلفہ عمر رضا کحالہ، ص ۱۳۲

۳۳۔ قصۃ الحضارۃ، مؤلفہ ول ڈیورانٹ، جلد ۲، ص ۴۴۲

۳۴۔ المرأة فی القدیم و الحدیث، **مؤلفہ عمر رضا کحالہ، ص ۱۳۲**

۳۵۔ **حوالہ سابق، ص ۱۳۲**

۳۶۔ **حوالہ سابق**

۳۷۔ قصۃ الحضارۃ، **مؤلفہ ول دیورانت، جلد ۱۱، ص ۱۱۹**

۳۸۔ المرأة فی القدیم و الحدیث، **مؤلفہ عمر رضا کحالہ، ص ۱۸۳**

۳۹۔ المرأة فی الإسلام، **مؤلفہ ڈاکٹر عبد الواحد، ص ۱۸**

۴۰۔ المرأة من خلال الآیات القرآنیۃ، **مؤلفہ عصمت الدین کرکر، ص ۲۹**

۴۱۔ مکانۃ المرأة فی الشئون الإداریۃ و البطولات القتالیۃ، **مؤلفہ عمید رکن محمد ضاہر وتر، ص ۳۴۶**

۴۲۔ المرأة ذلک اللغز، **مؤلفہ عباس محمود عقاد، ص ۱۰**

۴۳۔ قصۃ الحضارۃ، **مؤلفہ ول دیورانت، جلد ۱، ص ۱۱۹**

۴۴۔ حضارة العرب، **مؤلفہ گستاف لوبون، ص ۴۰۶**

۴۵۔ **حوالہ سابق**

۴۶۔ المرأة فی القدیم و الحدیث، **مؤلفہ عمر رضا کحالۃ، ص ۱۷۷**

۴۷۔ المرأة فی الإسلام، **مؤلفہ ڈاکٹر علی عبد الواحد، ص ۱۸**

۴۸۔ المرأة من خلال الآیات القرآنیۃ، **مؤلفہ عصمت الدین کرکر، ص ۲۷**

۴۹۔ **حوالہ سابق**

۵۰۔ المرأة فی القدیم و الحدیث، **مؤلفہ عمر رضا کحالہ، ص ۱۷۰**

۵۱۔ قصۃ الحضارۃ، **مؤلفہ ول دیورانت، ج ۲، م ۱، ص ۱۱۹ (حیاة الیونان المرأة)**

۵۲۔ المرأة فی القدیم و الحدیث، **مؤلفہ عمر رضا کحالہ، جلد ۱، ص ۱۷۶**

۵۳۔ المرأة من خلال الآیات القرآنیہ، **مؤلفہ عصمت الدین کرکر، ص ۲۵**

۵۴۔ المرأۃ فی القرآن الکریم، **مؤلفہ عباس محمود عقاد، ص۷۵**

۵۵۔ المرأۃ من خلال الآیات القرآنیہ، **مؤلفہ عصمت الدین کرکر، ص۲۵**

۵۶۔ الزواج و الطلاق و حقوق الزوجۃ و الأولاد فی مصر، **مؤلفہ تحفہ احمد السید حندوسہ (ڈاکٹریٹ کا مقالہ، ص۲۳)**

۵۷۔ المرأۃ فی القدیم و الحدیث، **مؤلفہ عمر رضا کحالہ، جلد۱، ص۱۱۲**

۵۸۔ الزواج و الطلاق و حقوق الزوجۃ و الأولاد فی مصر، **مؤلفہ تحفہ احمد السید حندوسہ (ڈاکٹریٹ کا مقالہ، ص۲۳)**

۵۹۔ **حوالہ سابق**

۶۰۔ المرأۃ فی القدیم و الحدیث، **مؤلفہ عمر رضا کحالہ، جلد۱، ص۱۲۴**

۶۱۔ **حوالہ سابق**

۶۲۔ **حوالہ سابق**

۶۳۔ المرأۃ من خلال الآیات القرآنیہ، **مؤلفہ عصمت الدین کرکر، ص۲۵**

۶۴۔ الزواج و الطلاق و حقوق الزوجۃ و الأولاد فی مصر القدیمۃ، **مؤلفہ تحفہ احمد السید حندوسہ، ص ۲۷**

۶۵۔ المرأۃ فی القرآن الکریم، **مؤلفہ عباس محمود عقاد، ص۷۵ (معمولی حذف و اضافہ کے ساتھ)**

۶۶۔ المرأۃ فی القدیم و الحدیث، **مؤلفہ عمر رضا کحالہ، جلد۱، ص۱۲۲**

دوسرا باب

یہودیت اور نصرانیت میں عورتوں کا مقام

یہودیت میں عورت کا مقام

یہودیت میں نظام زندگی پر صحرائیت اور بادیہ نشینی کے اثرات نمایاں تھے۔ ایک عرصہ تک ان کی نسلوں پر بدوی عادات و تقالید کا غلبہ رہا۔ توریت میں یہودیوں کی صحرائی اصل و بنیاد کی طرف اشارہ بھی ملتا ہے۔ قدیم صحیفہء تثنیہ میں منقول ہے[1]:

"رب کے حصہ میں آئی ان کی قوم، یعقوب اور جو میراث ان کو حاصل ہوئی۔

ایک بے آب و گیاہ سرزمین اور ایک وحشت زدہ ویرانے میں رب نے ان کو پایا۔

رب نے بلند سطح زمین پر ان کو رکھا، وہاں پر انہوں نے صحراء کے پھل کھائے، رب نے پتھر سے نکلا ہوا شہد ان کو پلایا اور چٹانوں کی تہوں سے نکلے ہوئے تیل کے ذریعہ ان کی پرورش کی۔"[2]

اس کی تائید قرآن مجید کی ایک آیت سے بھی ہوتی ہے۔ یوسف علیہ السلام کے والدین کو جب اللہ تعالیٰ نے بادیہ سے مصر پہنچایا تو اللہ کی ان نعمتوں کا تذکرہ ان کی زبان پر آیا جو انہیں اور ان کے والدین کو حاصل ہوئی تھیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "وقد أحسن بیٓ إذ أخرجنی من السجن و جآء بکم من البدو"[3] (سورہ یوسف / ۱۰۰)
(ترجمہ: میرے رب نے میرے ساتھ بڑا احسان کیا جب کہ مجھے جیل خانہ سے نکالا اور آپ لوگوں کو صحراء سے لے آیا)

قرآن کی اس آیت سے یہودیوں کے بدوی الاصل ہونے اور ان کے قبائلی نظام زندگی کی تائید ہوتی ہے۔ اسی وجہ سے بنو اسرائیل کی شریعت کی بنیاد ان امور پر قائم ہوئی جس کی ایک جنگجو قوم کے نظام زندگی کو ضرورت ہوتی ہے، یعنی عورتوں کا پوری زندگی مردوں کی حاکمیت کے تابع ہونا، افزائش نسل اور مردوں کی کثرت۔ یہ سارے امور میدان جنگ کی ضروریات میں سے ہیں جہاں عورتیں زیادہ کارآمد ثابت نہیں ہوتی ہیں۔

ان ہی وجوہات کی بنا پر یہودی شریعت عورتوں کو ان کی زندگی کے مختلف مراحل میں ان کے بیشتر شہری حقوق سے محروم کرتی ہے۔ شادی سے قبل ان کو والد اور اہل خانہ کے ماتحت رکھتی ہے اور شادی کے بعد شوہر

کی ماتحتی میں دیتی ہے۔ ان دونوں حالتوں میں عورت کی سماجی حیثیت ایک غلام کی سی ہوتی ہے، بلکہ یہودی شریعت تنگدست باپ کو اس کی اجازت دیتی ہے کہ وہ اپنی بیٹی کو غلاموں کی طرح بیچ بھی سکتا ہے۔[۳]

اس کی تائید صحیفہ الخروج کی اس عبارت سے بھی ہوتی ہے:

"جب کوئی شخص اپنی بیٹی کو فروخت کر دے گا تو اس کے لیے دیگر غلاموں کی طرح غلامی سے نکلنے کا بھی حق نہیں رہے گا۔" یعنی فروخت ہونے کے بعد وہ کبھی آزاد نہیں ہو پائے گی بلکہ تازندگی باندی ہی رہے گی۔ اس طرح یہودیت میں ایک عورت یا لڑکی کو صرف فروخت ہی نہیں کیا جاتا بلکہ تازندگی اسے غلامی کی زنجیروں میں قید کر کے رکھا جاتا ہے۔

یہود کے معاشرہ کی بنیاد ایسے خاندانی نظام پر تھی جس میں باپ کو مرکزیت حاصل ہوتی تھی۔ کتاب "قصۃ الحضارۃ" کے مصنف کہتے ہیں "عبرانیوں کا خاندانی نظام جس میں باپ کو مرکزیت حاصل ہوتی تھی، ایک بھاری بھرکم سیاسی و اقتصادی نظام پر مشتمل ہوتا تھا۔ یہ خاندان کے سب سے معمر شادی شدہ انسان، ان کی بیویوں، ان کے غیر شادی شدہ بیٹوں، شادی شدہ بیٹوں، ان کی بیویوں، ان کے بیٹوں اور غلاموں سے مل کر تشکیل پاتا تھا"[۴]۔

مذکورہ خاندانی نظام میں باپ کو مطلق اختیارات حاصل ہوتے تھے۔ خاص طور پر بیٹیوں کے تعلق سے اسے مطلق آزادی ہوتی تھی کہ وہ اپنی خواہش و ضرورت کے مطابق اس کے ساتھ جیسا چاہے سلوک و رویہ اختیار کر سکتا تھا۔ کتاب "قصۃ الحضارۃ" کے مصنف کہتے ہیں "باپ کو خاندان کے افراد پر لامحدود اختیارات حاصل ہوتے تھے، اراضی اس کی ملکیت ہوتی تھی، بیٹوں کو اسی حال میں جینے کا حق حاصل ہوتا تھا جبکہ وہ اس کے فرمانبردار بن کر اس کے حکموں کی تعمیل کریں۔ وہی خاندان کا سردار ہوتا تھا، محتاج ہونے کی صورت میں وہ اپنی نابالغ بیٹی کو بیچ بھی سکتا تھا تاکہ اسے ہمیشہ کے لیے غلامی کی زندگی جینے کے لیے چھوڑ دے، وہ اپنی مرضی کے مطابق کسی کے ساتھ بھی اسے شادی کے بندھن میں باندھنے کا حق رکھتا تھا۔ کبھی اپنے اس حق سے دستبردار بھی ہو جاتا تھا، اور بیٹی پر مہربان ہو کر شادی کے سلسلہ میں اس کی مرضی معلوم کرتا تھا"[۵]۔

چنانچہ یہودی عورت قیدی بنائی جاتی تھی، اس کی خرید و فروخت ہوتی تھی اور دیگر ساز و سامان جیسے اونٹ اور فرنیچر کی طرح میراث میں تقسیم ہوتی تھی۔ باپ کو یہ حق ہوتا تھا کہ وہ اپنی بیٹیوں کو کچھ عرصہ کے لیے کرایہ پر دے سکتا ہے اور اپنی نابالغ بیٹیوں کو غلاموں کی طرح بیچ سکتا ہے اور چاہے تو اسے قتل بھی کر سکتا ہے۔ اور اس ظلم سے اسے کوئی روک نہیں سکتا تھا۔

یہودی قوانین نے عورتوں پر ظلم وزیادتی کے معاملہ میں اسی پر بس نہیں کیا بلکہ اس سے بھی نچلی سطح پر اتر کر اس کے ساتھ بدسلوکی کی، اس کی حیثیت کو حقیر سے حقیر تر بنا دیا، اس سے دور رہنے کی تلقین کی، اس کو ایک بدترین گناہ قرار دیا۔ صحیفہ الجامعۃ میں منقول ہے:

"میرے دل کی قسم، میں نے روئے زمین کی خاک چھانی تاکہ میں اس کے بارے میں جان سکوں، تاکہ زندہ رہوں تاکہ حکمت و عقل کی باتیں معلوم کر سکوں، تاکہ یہ جان سکوں کہ شر جہالت ہے، حماقت جنون ہے۔ تو میں نے موت سے بھی زیادہ کڑوی چیز عورت کو پایا جو ایک جال کے مانند ہے، اس کا دل رسیوں سے تیار کیا ہوا پھندہ ہے، اس کے ہاتھ بیڑیاں ہیں۔ اللہ کی خوشی چاہنے والا اس سے بچے گا اور خطاکار اس کی وجہ سے قابل مواخذہ ٹھہرے گا۔ دیکھو دنیا کی خاک چھاننے کے بعد میں کس نتیجہ پر پہنچا ہوں۔ چیزوں کے احوال معلوم کرنے کے لیے ایک چیز کو دوسری چیز سے ملایا۔ ابھی تک میں تلاش و جستجو ہی میں ہوں لیکن کچھ پا نہیں سکا۔ میں نے ایک ہزار مردوں میں ایک اچھا مرد پایا۔ لیکن عورتوں کی کل تعداد میں مجھے ایک اچھی عورت نہیں ملی۔"[۲]

یہودی معاشرہ میں عورتوں کی حیثیت قدیم انسانی معاشرہ سے مختلف نہیں تھی۔ کیونکہ عبرانی معاشرہ میں عورت شادی سے پہلے باپ کی ملکیت ہوتی تھی، نکاح کے وقت اس کا سودا ہوتا تھا، کیونکہ اس کا حق مہر اس کے باپ یا بھائی کو قیمت خرید کے طور پر ادا کیا جاتا تھا، اس طرح وہ شادی کے بعد شوہر کی ملکیت ہو جاتی تھی۔ شادی کے بعد شوہر اس کا مطلق طور پر مالک ہوتا تھا، عورت اپنے شوہر کو "بعلی" کہتی تھی جس کے معنی ہیں "میرے آقا"۔ قانون کی نظر میں عقد زواج (شادی کا بندھن) غلامی کا معاہدہ ہوا کرتا تھا۔ اسی وجہ سے والد یا شوہر کی مرضی کے بغیر عورت کی نذر و قسم کی کوئی حیثیت نہیں ہوتی تھی۔ صحیفہ العدد میں منقول ہے:

"عورت نے اپنے والد کے گھر میں بلوغت سے قبل اگر اپنے رب کے لیے کوئی نذر مانی یا اپنے اوپر کوئی چیز لازم کر لی اور اس کے والد نے اس کی نذر کو یا اس کے لازم کردہ عہد کو سنا اور خاموش رہا تو اس کی نذر اور اس کی لازم کردہ چیز معتبر ہوگی اور اگر جس دن اس کے والد نے اس کی نذر یا لازم کردہ چیز کے بارے میں سنا اور اس سے روک دیا تو اس کی مانی ہوئی نذر اور لازم کردہ چیز معتبر نہیں ہوگی اور اس کے والد کے منع کرنے کی وجہ سے رب اس کو معاف کر دے گا۔ اور اگر شادی کے بعد عورت پر کچھ نذریں تھیں یا شوہر کی موجودگی میں اس نے اپنی زبان سے کوئی چیز اپنے اوپر لازم کر لی اور شوہر نے اسے سن بھی لیا، اگر وہ سننے کے بعد خاموش رہ گیا تو اس

کی نذریں اور اس کی اپنے اوپر لازم کردہ چیز معتبر ہوگی اور اگر شوہر سننے کے بعد اسے روک دے تو اس کی نذر اور لازم کردہ چیز فسخ ہو جائے گی۔ اور رب اسے معاف کر دے گا۔" ۷

یہودی شریعت میں عورت میراث کے سامان کی طرح تھی۔ میت کے ترکہ کی طرح عورت بھی کسی کی ملکیت بن جاتی تھی۔ شوہر کے مرنے کے بعد وہ دیگر سامانوں اور غلاموں کی طرح اس کے کسی وارث کی ملکیت بن جاتی تھی۔ وہ اسے بیچ سکتا تھا یا ایک غلام کی طرح اسے اپنے پاس باقی رکھ سکتا تھا، لیکن اسے دوبارہ شادی کرنے کی اجازت نہیں دیتا تھا۔ صحیفہ تثنیہ کے عہد قدیم میں منقول ہے:

"جب کئی بھائی ایک ساتھ رہ رہے ہوں، ان میں سے کسی ایک کا انتقال ہو جائے اور اس کا کوئی بیٹا بھی نہ ہو تو مرنے والے کی بیوی کو کسی اجنبی کے ساتھ شادی کرنے کا اختیار نہیں ہوگا بلکہ اس کے شوہر کا بھائی اس کو اپنے پاس رکھے گا، اسے اپنی بیوی بنالے گا۔ اور شوہر کے بھائی کی حیثیت سے اس کی ضروریات پوری کرے گا۔" ۸

اس طرح شوہر کے انتقال سے ہی اس کی بیوہ جسے یہود "یاباماہ" کہتے ہیں اپنے آپ اپنے دیور کی یا اپنے خسر کے بھائی کی بیوی بن جائے گی۔ خاص طور پر جبکہ پہلے شوہر سے اس کو اولاد نرینہ نہ ہو۔ عورت کو چاہے پسند ہو یا ناپسند شوہر کے کسی وارث کی زندگی میں خاندان سے باہر کسی سے شادی کرنے کا اختیار اسے نہیں ہوگا الا یہ کہ وارث اس عورت کو اپنی ملکیت سے آزاد کر دے۔

یہودی معاشرہ میں یہ بات بالکل واضح تھی کہ ایک عورت جو مویشی اور فرنیچر کی طرح وارثین کے درمیان بطور وراثت تقسیم ہوتی تھی، سامان وراثت میں خود اس کی کوئی حصہ داری نہیں ہوتی تھی۔ یہودی معاشرہ میں رائج قانون نے یہ صراحت کی تھی کہ اگر کوئی شخص انتقال کرتا ہے جبکہ اس کی کوئی نرینہ اولاد نہیں ہے تو اس کا متروکہ سامان اس کے بھائیوں یا اس کے دوستوں کے درمیان تقسیم ہو جائے گا، اس کی بیوی کو اس میں سے کچھ بھی حصہ نہیں ملے گا۔ توریت میں یہ صراحت آئی ہے کہ اگر کسی آدمی کے پاس کوئی نرینہ اولاد نہیں ہے تو اس کی بیٹی اس صورت میں اس کی وارث بنے گی کہ اپنے باپ کے قبیلہ اور ذات برادری میں شادی کرے۔ صحیفہ العدد میں منقول ہے:

"وہ لڑکی جسے اسرائیلی قبیلہ میں بطور وراثت کوئی زمین حاصل ہوئی ہے، اس کے لیے اپنے باپ کے قبیلہ اور ذات برادری میں شادی کرنا ضروری ہے، تاکہ ہر اسرائیلی کو اس کے باپ کی وراثت حاصل ہوتی رہے۔" ۹

”یہودی معاشرہ میں عورتوں کو فطری طور نجس وناپاک تصور کیا جاتا تھا۔ اگر عورت کسی بچہ کو جنم دیتی تو وہ سات دنوں تک نجس تصور کی جاتی تھی اور زچگی کے 33 دنوں کے بعد ہی وہ مکمل طور پر پاک قرار دی جاتی تھی اور اس مدت کے بعد ہی وہ معبد میں جا سکتی تھی۔ اگر عورت کسی بچی کو جنم دیتی تو اسے مکمل طور پر پاک ہونے کے لیے اس کی دوگنی مدت درکار ہوتی تھی۔ اس سے صاف طور پر پتہ چلتا ہے کہ یہودی لڑکے کو لڑکی پر ترجیح دیتے تھے۔ ایک عورت حیض کی مدت کے دوران بھی ناپاک تصور کی جاتی تھی۔ حیض کی مدت کے دوران اگر کوئی اسے چھو لیتا یا اس کے بیٹھنے کی جگہ کو چھو لیتا تو وہ بھی غروب آفتاب تک ناپاک تصور کیا جاتا تھا۔ ایک حائضہ عورت ٹھنڈے پانی سے غسل کرنے کے بعد ہی پاک مانی جاتی تھی۔ جب تک کوئی اس کے غسل کرنے کی گواہی نہیں دیتا اس کا شوہر اسے ہاتھ نہیں لگاتا تھا۔“ [۱۰]

عورتوں کے تعلق سے یہودی قانون آج بھی وہی ہے جو زمانہ قدیم میں تھا۔ عورتوں کے متعلق اس قانون میں مزید کئی طرح کے اصول وضوابط کا اضافہ بھی کر دیا گیا ہے:

”عورت کو جیسے ہی احساس ہو کہ اس کا حیض شروع ہونے والا ہے، اسے اسی وقت سے ناپاک تصور کر لیا جائے گا، چاہے حیض کی واضح علامت بھی ظاہر نہ ہوئی ہو، اس کے بعد سے ہی اس کا شوہر اسے چھو بھی نہیں سکتا ہے، اسے چھوٹی انگلی سے مس بھی نہیں کر سکتا ہے۔ نہ تو وہ اسے کوئی بڑی سے بڑی چیز ہاتھ میں پکڑا سکتا ہے، نہ اس کے ہاتھ سے کوئی چیز لے سکتا ہے۔ نہ ہی دونوں ہوا میں اچھال کر کوئی چیز ایک دوسرے کو دے سکتے ہیں۔ دونوں ایک ٹیبل پر بیٹھ کر کھا بھی نہیں سکتے، الا یہ کہ کوئی چیز ان دونوں کے درمیان حائل ہو جو انہیں ایک دوسرے سے علاحدہ کرتی ہو۔ بیوی کے پینے کے بعد گلاس میں بچا ہوا مشروب وہ استعمال نہیں کر سکتا، دونوں ایک بستر پر سو بھی نہیں سکتے۔ اگر دونوں ایک ہی جگہ کام کرتے ہوں تو ایک دوسرے کو چھو بھی نہیں سکتے۔ اگر کسی حائضہ عورت کا شوہر بیمار ہو جائے اور اس کی دیکھ بھال کرنے والا کوئی نہ ہو تو اس کی بیوی اس کو چھوئے بغیر اس کی دیکھ بھال اور خدمت کر سکتی ہے۔ دوسری طرف اگر حائضہ عورت بیمار ہو جائے تو اس کا شوہر اس کی تیمارداری بھی نہیں کر سکتا، اگرچہ شوہر کی طرف سے بیوی کو چھو لینے کا دور دور تک کوئی امکان بھی نہ ہو۔“

”ایک عورت بچہ کو جنم دینے کے بعد ناپاک تصور کی جاتی ہے۔ اگر اس نے بچہ کو جنم دیا ہے تو وہ سات دنوں تک ناپاک رہے گی، اگر اس نے بچی کو جنم دیا ہے تو وہ چودہ دنوں تک ناپاک رہے گی۔ لڑکا تولد ہونے کے بعد عورت چالیس دنوں تک غسل نہیں کر سکتی ہے اور لڑکی کی ولادت کے بعد وہ اسی (۸۰) دنوں تک غسل نہیں کرے گی۔“ [۱۱]

عورتوں سے متعلق یہ سارے قوانین اس بات کا واضح ثبوت ہیں کہ یہودیت میں عورتوں کو نہایت ذلت آمیز سلوک کا سامنا تھا۔ اس سے یہ اندازہ بھی لگایا جاسکتا ہے کہ یہود کے یہاں اولاد نرینہ کو اہمیت و ترجیح حاصل تھی اور ان کے معاشرہ میں عورت فطرتاً ناپاک تصور کی جاتی تھی۔ وہ عورتوں کو اولین گناہ کا قصور سمجھتے تھے اور اس کی بنا پر اسے گندگی اور غلاظت کا ڈھیر سمجھتے تھے۔ اس سے یہ بھی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ یہود کو جدید و مہذب انسانی معاشرہ کا حصہ بننے کے لیے صدیوں تک انتظار کرنا پڑا ہے۔

حواشی:

۱۔ کتاب مقدس الإصحاح ۳۲، صحیفہ تثنیہ، فقرہ ۹-۱۳، ص ۳۳۲

۲۔ حوالہ سابق، فقرہ ۹-۱۳، ص ۳۳۲

۳۔ المرأة فی الإسلام (اسلام میں عورت کا مقام)، ص ۱۵، مؤلف: عبد الواحد وافی

۴۔ قصة الحضارة، ج ۲م ا ص ۳۷۴، مؤلف: ول ڈیورانٹ

۵۔ حوالہ سابق ص ۳۷۴

۶۔ کتاب مقدس الأصحاح ۷، صحیفہ الجامع، فقرہ ۲۵-۲۸، ص ۹۸۰

۷۔ کتاب مقدس، عہد قدیم، الإصحاح ۳۰، صحیفہ العدد، فقرہ (۳-۸)، ص ۲۶۴

۸۔ کتاب مقدس، عہد قدیم، الاصحاح ۲۵، صحیفہ تثنیہ، فقرہ ۵، ص ۳۱۸

۹۔ کتاب مقدس، عہد قدیم، الإصحاح ۳۶، صحیفہ العدد، فقرہ ۸، ص ۳۷۶

۱۰۔ المرأة فی القدیم و الحدیث، ج ۱، ص ۱۸۸، مؤلفہ: عمر رضا کحالہ

۱۱۔ مجموع من القوانین الیهودية والعادات، ص ۲۲، مؤلف: حاخام ربی سلمان جوز فرائڈ

نصرانیت میں عورت کی حیثیت

نصرانیت میں عورتوں کی حالت یہودیت سے بہتر نہیں تھی۔ اس مذہب نے عورتوں کی حالت زار پر کوئی خاص توجہ نہیں دی۔ تحریف شدہ نصرانیت نے بھی عورتوں کی بدتر صورتحال کی اصلاح نہیں کی اور نہ اسے وہ حقوق

عطا کئے جس کی وہ مستحق تھی۔ اس مذہب نے بھی عورتوں کو مردوں کے ظالمانہ چنگل سے آزاد نہیں کیا اور نہ مردوں کے ظلم و زیادتی سے اسے تحفظ عطا کیا۔ اس کے برخلاف عیسائیت نے عورتوں کو مردوں کے ظالمانہ اقتدار کے آگے سر جھکانے اور آنکھ بند کر کے اس کی اطاعت کرنے پر مجبور کیا۔ پال کہتا ہے: "بیویاں خود کو اسی طرح شوہروں کے حوالہ کر دیں جس طرح خود کو مالک و معبود کے حوالہ کیا جاتا ہے۔ شوہر اپنی بیوی کا اسی طرح آقا اور سرپرست ہے جس طرح مسیح کلیسا (چرچ) کے سرپرست و مالک ہیں۔"[1]

بالکل اسی طرح کی بات پیٹر نے اپنے پہلے مکتوب میں کہی ہے: "اے غلاموں کی جماعت! مکمل احترام کے ساتھ تم اپنے آپ کو اپنے مالک کے حوالہ کر دو، تمہارے یہ رویے صرف اچھے مالکان کے ساتھ نہیں ہونا چاہیے بلکہ سخت گیر مالکان کے ساتھ بھی تمہارا یہی رویہ مطلوب ہے۔"[2] اس کے بعد وہ کہتا ہے: "بالکل اسی طرح بیویوں کو بھی اپنے شوہروں کے سامنے سر تسلیم خم کرنا چاہیے۔"

ہم دیکھتے ہیں کہ بائبل میں مردوں کا خصوصیت کے ساتھ تذکرہ آیا ہے، چونکہ نصرانیوں کا یہ عقیدہ ہے کہ مردوں کو اللہ کی صورت پر پیدا کیا گیا ہے جبکہ عورتوں کو مردوں کی پسلی سے پیدا کیا گیا ہے۔ اس وجہ سے عیسائی علماء اس بات پر متفق ہیں کہ مردوں اور عورتوں کی سماجی حیثیت یکساں نہیں ہو سکتی ہے اور اسی وجہ سے مرد کی سماجی و مذہبی حیثیت عورت کے مقابلہ میں بدرجہا اعلیٰ ہے۔ پال نے معتقدین کے نام اپنے پہلے مکتوب میں کہا ہے: "اب میں تم کو یہ بتانا چاہتا ہوں کہ ہر مرد کا سرپرست مسیح ہے، عورت کا سرپرست مرد ہے اور مسیح کا سرپرست خدا ہے۔[3]" وہ آگے کہتا ہے: "مرد چونکہ خدا کی شکل و صورت و بزرگی کا پرتو ہے اس لیے اسے اپنے سر کو چھپانا نہیں چاہیے۔ لیکن عورت مرد کی عظمت کی نشانی ہے۔ مرد عورت سے وجود میں نہیں آیا اس کے برخلاف عورت مرد سے وجود میں آئی ہے۔ مرد کو عورت کے لیے پیدا نہیں کیا گیا ہے، ہاں عورت کو مرد کے لیے پیدا کیا گیا ہے۔ اس سبب سے اور فرشتوں کی وجہ سے عورت کے سر پر مرد کی ملکیت و سرپرستی کا سایہ ہمیشہ رہنا چاہیے۔"

پال نے مردوں کو بیویوں سے محبت کرنے کا مشورہ دیتے ہوئے کہا ہے: "اے شوہرو! تم اپنی بیویوں سے محبت کرو جس طرح مسیح نے کلیسا (چرچ) سے محبت کی اور ہمیشہ خود کو اس کی خدمت کے لیے تیار رکھا۔"[4] لیکن یہ صرف ایک مشورہ ہی رہا، اس پر عملدرآمد نہیں ہو سکا۔

کلیسا (چرچ) نے اگرچہ شوہروں کو بیویوں کے ساتھ رحمدلی سے پیش آنے کی تلقین کی لیکن دوسری طرف اسے بیوی کی ذات، اس کے مال اور اس کی جائیداد پر مکمل اختیار بھی دے دیا۔

نصرانیت نے عورتوں کو ہر قسم کے شر وفساد کی جڑ قرار دیا ہے۔ ”ان کا یہ عقیدہ ہے کہ ہر عورت اولین گناہ کے لیے قصوروار ہے اور وہ جنت سے آدم کے نکالے جانے کی ذمہ دار ہے۔ عیسائیت میں عورتوں پر ظلم و زیادتی کا اہم سبب وہ قصہ ہے جو جنت میں آدم و حوا کے رہنے اور وہاں سے نکالے جانے سے متعلق ہے۔ نصرانیوں کی مذہبی شخصیت ترتیلیان کا یہ اعتقاد ہے کہ ”عورتیں شیطان کی آلہ کار اور اس کی معاون رہی ہیں۔ کیا اس نے شیطان کی پیروی اور خدا کی نافرمانی نہیں کی؟ ترتیلیان نے اس قضیے کو بڑھا چڑھا کر پیش کیا۔ صدیوں تک عیسائی عورتوں کی جو تذلیل ہوتی رہی اور اسے جس طرح دبا کر رکھا گیا، اس کے لیے یہی تھیوری ذمہ دار ہے۔“۵

علاوہ ازیں عورتوں سے یہ کہا گیا کہ وہ کلیسا کے اندر اور اس کے باہر ایک خاص طرز عمل کو یقینی بنائیں۔ پال نے سختی کے ساتھ اس حکم پر عمل کرنے کو کہا کہ ”تمہاری عورتیں ہر حال میں کلیسا کے اندر خاموش رہیں، اس لیے کہ اگر وہ کچھ سیکھنا چاہتی ہیں تو پھر انہیں بولنے کا حق نہیں ہے۔ اگر انہیں سیکھنا ہی ہے تو وہ گھر کے اندر شوہر سے معلوم کر سکتی ہیں، کلیسا میں عورت کا بولنا اس کے لیے محرومی کا سبب ہے۔“۶

نصرانی عورتوں کے تعلق سے توہمات کا شکار رہے ہیں۔ کرسٹوم کہتا ہے: ”عورت ایک یقینی شر، فطری بدروح، خانگی خطرہ، ہلاکت خیز فتنہ اور ایک پوشیدہ برائی ہے۔“

احمد خاکی نے ان توہمات کی بنیاد اور اسباب پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے کہ ”قدیم انسانی معاشرہ سے تعلق رکھنے والوں نے خون کی حقیقت و فطرت کو نہیں سمجھا، اسی لیے وہ لوگ اس سے ڈر گئے اور اسے ”مانا“ سے جوڑ دیا۔ ان لوگوں نے بھی مان لیا کہ عورتیں ایام حیض کے دوران نجس وناپاک ہو جاتی ہیں۔ ان کے تصورات کے مطابق مرد کو اپنی بیوی سے اس وقت تک دور رہنا چاہیے جب تک وہ پرندہ کے خون کے ذریعہ اس نجاست کا کفارہ ادا نہ کر دے جو اسے پہنچی ہے۔ مزید برآں ان کا یہ اعتقاد تھا کہ حائضہ عورت جس چیز کو چھو دے گی وہ ناپاک ہو جائے گی۔ اسی لیے مرد کو ہر حال میں اپنی حائضہ بیوی سے دوری بنا کر ہی رکھنا ہے۔ دونوں الگ الگ بستروں پر سوئیں، الگ کپڑے پہنیں اور الگ برتنوں سے پانی وغیرہ پئیں۔“۷

ان توہمات اور من گھڑت اعتقادات کی وجہ سے عیسائی عورتوں کی حالت ٹھیک اسی طرح کی ہو گئی جیسی یہودی عورتوں کی تھی۔ دونوں مذاہب نے عورتوں کو اس کے فطری مقام سے نیچے گرا کر اسے نجاست کا ڈھیر اور ناپاکی کا سرچشمہ بنا ڈالا۔ کچھ دینی و مذہبی شخصیات نے اس سے بھی آگے بڑھ کر عورتوں کے وجود اور اس کی انسانیت پر ہی سوالیہ نشان لگا دیا۔ کیا عورت کے اندر روح موجود ہے؟ جس کے ذریعہ اسے نجات یا ہلاکت سے

ہمکنار ہونا پڑے گا؟ ۵۸۱ء میں منعقد ہونے والے ماکون اجتماع میں یہ سولات اٹھائے گئے اور اس پر بحث و مباحثے بھی ہوئے اور مذکورہ اجتماع کے بعد بھی متعدد بار ان سوالات پر بحث ہوتی رہی ہے۔

یہودیت اور عیسائیت میں عورتوں کی صورت حال کا یہ ایک سر سری جائزہ تھا جو آپ کے سامنے پیش کیا گیا۔ ان دونوں مذاہب کی مذہبی کتابوں میں عورتوں کے تعلق سے جو باتیں درج ہیں اس کی روشنی میں یہ ساری باتیں پیش کی گئی ہیں۔ دونوں ہی مذاہب نے عورتوں کے ساتھ حقارت آمیز سلوک روا رکھا۔ تمام شعبۂ حیات میں مردوں کی بالا دستی کی تائید کی۔ ان دونوں قدیم مذاہب کی تعلیمات کے مطابق عورتوں کی کوئی دینی حیثیت نہیں، نہ اس کے شہری حقوق ہیں۔ اس کے صرف فرائض وواجبات ہیں جنہیں اسے ہر حال میں ادا کرنا ہے، اور مردوں کی حاکمیت کو تسلیم کرنا ہے۔

مختصر یہ کہ دونوں قدیم مذاہب میں بہت زیادہ تحریف و تبدیلی واقع ہونے اور معاشرہ کے لیے خود ساختہ قوانین بنا کر یہودیوں اور عیسائیوں کے ذریعہ اسے رائج کر دیئے جانے کی وجہ سے عورتوں کو تمام تر انسانی و شہری حقوق سے محروم ہو کر اس بدترین صورتحال کا سامنا کرنا پڑا۔ آج یہ لوگ جن باتوں پر عمل کرتے ہیں وہ ان الٰہی قوانین سے یکسر مختلف ہیں جو ان کے لیے آسمان سے نازل کیا گیا تھا۔ الحمدللہ اسلامی شریعت اور قوانین اس طرح کی تحریفات سے محفوظ ہیں۔ مذہب اسلام نے ہر دور میں عورتوں کو تمام دینی و شہری حقوق سے بہرہ ور کیا ہے۔ اگلے باب میں اسلام میں عورتوں کی صورتحال پر روشنی ڈالی جائے گی۔

حواشی:

۱۔ کتاب مقدس، عہد جدید، اصحاح ۵، پال کا مکتوب باشندگان افسس کے نام، فقرہ (۲۲) ص ۳۱۷

۲۔ کتاب مقدس عہد جدید، اصحاح ۲، فقرہ (۱۸)، اصحاح ۳ فقرہ (۱) پیٹر کا پہلا مکتوب، ص ۳۷۷

۳۔ کتاب مقدس عہد جدید، اصحاح ۱۱، پیٹر کا مکتوب باشندگان کورنتھوس کے نام، فقرے (۳، ۷، ۹) ص ۲۸۰

۴۔ حوالہ سابق، اصحاح ۵، پال کا مکتوب باشندگان افسس کے نام، فقرہ (۲۵) ص ۳۱۷

۵۔ المرأۃ فی مختلف العصور، ص ۳۳، مؤلفہ احمد خاکی

۶۔ ول ڈیورانت کی کتاب قصۃ الحضارۃ ج ۳ م ۳، ص ۲۷۸

۷۔ المرأۃ فی مختلف العصور، ص ۳۳، مؤلفہ احمد خاکی

تیسرا باب

اسلام سے قبل اور زمانہ جاہلیت میں عورتوں کی حالت

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ اسلام اور اس کی روشن تعلیمات و فطرت سلیمہ سے ہم آہنگ اسلامی شریعت نے عورتوں کو آزادی عطا کی اور اسے زمانۂ جاہلیت کے ظلم و جبر سے نجات دلایا، لیکن اسے سمجھنے اور اس حقیقت کو قبول کرنے کے لیے اسلام کی آمد سے پہلے زمانۂ جاہلیت میں عورتوں کی جو قابل رحم حالت تھی اسے جاننا ضروری ہے۔ جس وقت اسلام دنیا میں آیا اس وقت عربوں کی سماجی حالت یہ تھی کہ ان کا ایک بڑا طبقہ صحرا کی زندگی بسر کرتا تھا اور ان لوگوں نے بادیہ میں بود و باش اختیار کر رکھی تھی، اس کی وجہ سے بدویانہ رسوم و رواج بھی ان کے یہاں رائج تھے۔ جنگیں اور ایک دوسرے پر اچانک حملہ ان کی زندگی کا حصہ تھے۔ جسمانی طاقت کا حصول ان کی دلچسپی کا میدان تھا، کیونکہ اپنے قبیلے کے دفاع اور اپنی اراضی کے تحفظ کے لیے یہ ضروری ہوتا تھا۔ مصنف احمد خاکی نے لکھا ہے کہ اس سماجی صورتحال کی وجہ سے مردوں کو سماجی برتری حاصل تھی اور عورتوں کی حیثیت بہت کم تھی[1]۔ چونکہ اس قبائلی معاشرہ میں جان و مال کے تحفظ و دفاع کے لیے مردوں کی ضروریات زیادہ تھی لہٰذا اس صورت حال نے ان کی زندگی میں عورتوں کو بے حیثیت و بے قیمت بنا دیا تھا۔ چونکہ وہ لوگ اولاد نرینہ کو ترجیح دیتے تھے لہٰذا اس سماج میں بچیوں کو قتل کرنے یا اسے زندہ درگور کرنے کی سماجی لعنت بھی اپنے قدم جما چکی تھی۔

اگر کوئی لڑکی خوش قسمتی سے زندہ درگور ہونے سے بچ جاتی تو وہ اپنی پوری زندگی سماج کے ظلم و جبر اور ذہنی و جسمانی اذیت کو جھیلتی، شادی سے قبل والدین کی عدم توجہی کا شکار رہتی اور شادی کے بعد شوہر کی بدسلوکی کو برداشت کرتی۔ کوئی بھی شخص اسے سماجی ذلت و پستی سے باہر نکالنے کے لیے سامنے نہیں آتا تھا۔ اسے بیشتر انسانی حقوق سے محروم کر دیا جاتا تھا۔ اسے وراثت میں حصہ نہیں ملتا تھا، بلکہ وہ خود سامانوں اور فرنیچر کی طرح وراثت کے طور پر کسی کی ملکیت بن جاتی تھی۔

زمانۂ جاہلیت میں عورتوں کی عام طور پر یہی حالت تھی۔ احمد الحوفی اور ان کے جیسے کچھ اہل قلم نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ زمانۂ جاہلیت کی عورت اپنی حیثیت سے خوش اور مطمئن تھی اور اسے معاشرہ میں ایک باعزت مقام حاصل تھا لیکن ان کے علاوہ دوسرے بہت سے مصنفین اور مورخین کا یہی نظریہ ہے کہ زمانہ جاہلیت میں عورتیں عام طور پر ظلم وجبر کا شکار تھیں اور انہیں معاشرہ میں کوئی عزت ومقام حاصل نہیں تھا۲۔

اگرچہ زمانۂ جاہلیت کی عربی شاعری میں عورتوں سے متعلق رومانی داستانوں کا سراغ ملتا ہے، لیکن معاشرہ میں ان کی مجموعی حالت موافق اور بہتر نہیں تھی۳۔ عورتوں کو عام طور پر نظر انداز کیا جاتا تھا، ان پر ظلم وجبر ہوتا تھا اور انہیں اذیتناک صورتحال کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ قارئین کو آنے والی سطور میں عورتوں کی اس بدتر صورت حال کا اندازہ ہوگا۔ زمانۂ جاہلیت میں عورتوں کی نامساعد حالت کو بتانے کے لیے قرآن مجید کی آیات بھی پیش کی جائیں گی جن سے یہ معلوم ہوگا ہے کہ اسلام نے عورتوں پر ہونے والے اس ظلم وجبر کا خاتمہ کیا۔

عورتوں کی حالت زار

عہد ما قبل اسلام میں عورتیں اپنے گھروں میں اپنے والدین کے ہاتھوں ظلم وجبر، تذلیل اور استحصال کا سامنا کرنے کے لیے مجبور تھیں۔ زمانۂ جاہلیت کے عربوں کو عورتوں سے جو نفرت تھی اس کا اندازہ قرآن مجید کی آیتوں سے بھی لگایا جاسکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "ویجعلون لله ما یکرھون" (النحل/۶۲) (ترجمہ: اور وہ اپنے لیے جو ناپسند کرتے ہیں، اللہ کے لیے ثابت کرتے ہیں)

یہ بات بیٹیوں کے حوالہ سے کہی گئی ہے کہ یہ لوگ اپنے لیے تو بیٹیوں کو ناپسند کرتے ہیں لیکن اللہ کے لیے اسے ثابت کرتے ہیں۔

دوسری جگہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "ویجعلون لله البنات سبحانه و لھم ما یشتھون" (النحل/۵۷) (ترجمہ: اور وہ اللہ سبحانہ تعالیٰ کے لیے لڑکیاں مقرر کرتے ہیں اور اپنے لیے وہ جو اپنی خواہش کے مطابق ہو)

اس آیت کی تشریح کرتے ہوئے قرطبی نے لکھا ہے کہ "یہ آیت قبیلہ خزاعہ اور کنانہ کے بارے میں نازل ہوئی تھی۔ ان دونوں قبائل کے لوگ کہا کرتے تھے کہ فرشتے اللہ کی بیٹیاں ہیں۔ وہ کہتے تھے کہ بیٹیوں کو اللہ کی طرف منسوب کردو۔ اس قسم کے انتساب سے اللہ کی ذات پاک ومنزہ ہے اور اس سے عظیم تر ہے کہ اس کی

طرف اولاد کی نسبت کی جائے۔"ولھم ما یشتھون" کا مطلب یہ ہے کہ یہ اپنے لیے بیٹے پسند کرتے ہیں کیونکہ بیٹیاں انہیں ناپسند ہیں۔"[۴]

اللہ تعالیٰ نے ان کی ان من گھڑت باتوں کا جواب دیتے ہوئے ارشاد فرمایا ہے:"و جعلوا الملائکۃ الذین ھم عبادالرحمٰن إناثا أ شھدوا خلقھم ستکتب شھادتھم و یسألون" (الزخرف/۱۹) (ترجمہ: اور انہوں نے فرشتوں کو جو رحمٰن کے عبادت گزار ہیں، عورتیں قرار دے دیا۔ کیا ان کی پیدائش کے وقت یہ موجود تھے؟ ان کی یہ گواہی لکھ لی جائے گی اور ان سے اس کے بارے میں بازپرس کی جائے گی)

اس آیت سے صاف طور پر پتہ چلتا ہے کہ زمانۂ جاہلیت کے عرب معاشرہ میں عورتوں کو اہانت و تذلیل کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ وہ ظلم و جبر، بے عزتی و تحقیر اور ناانصافی کا شکار تھیں۔ خاندان کی ملکیت کا بڑا اور عمدہ حصہ مردوں کو مل جایا کرتا تھا۔ عورتوں کو صرف کھانے پینے کی بچی کھچی اور گھٹیا چیزوں میں سے حصہ ملتا تھا۔ اس تعلق سے قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:"و قالوا ما فی بطون ھٰذہ الأنعام خالصۃ لذکورنا و محرم علی أزواجنا و إن یکن میتۃ فھم فیہ شرکاء سیجزیھم وصفھم إنہ حکیم علیم" (الأنعام/۱۳۹) (ترجمہ: اور وہ کہتے ہیں کہ جو چیز ان مویشیوں کے پیٹ میں ہے وہ خالص ہمارے مردوں کے لیے ہے اور ہماری عورتوں پر حرام ہے اور اگر وہ مردہ ہے تو اس میں سب برابر ہیں۔ ابھی اللہ ان کو ان کی غلط بیانی کی سزا دیئے دیتا ہے، بلاشبہ وہ حکمت والا ہے اور بڑا علم والا ہے)

اس آیت کی تشریح کرتے ہوئے ابو جعفر طبری نے لکھا ہے کہ "اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ اگر مویشی ایک صحت مند بچہ کو جنم دیتی ہے تو اس پر صرف خاندان کے مردوں کا حق ہوگا، عورتوں کا اس میں کوئی حصہ نہیں ہوگا۔ اور اگر مویشی مردہ بچہ کو جنم دیتی ہے تو اس میں مرد و عورت برابر کے شریک ہوں گے۔ اس طرح وہ لوگ ہر معاملہ میں صرف مردوں کو ترجیح دیتے تھے اور ان ہی کی طرفداری کرتے تھے۔"

ان آیات میں "الأزواج" سے مراد عورتیں ہیں جو یا تو ان کی بیٹیاں ہوتی تھیں یا ان کی بیویاں ہوتی تھیں۔ ابو جعفر طبری نے آگے لکھا ہے کہ "اللہ تعالیٰ کے بارے میں افتراء پردازی کرنے والوں کو ضرور سزا دے گا، کیونکہ ان لوگوں نے اس چیز کو عورتوں کے لیے حرام قرار دیا تھا جسے اللہ نے حرام نہیں کیا تھا اور جسے اللہ نے حلال نہیں کیا تھا اسے ان لوگوں نے اپنے لیے حلال کر لیا تھا یعنی مردار اور جھوٹ گڑھ کے اس کا انتساب اللہ تعالیٰ کی طرف کر دیا تھا۔ اللہ تعالیٰ اپنی مخلوقات کی تدبیر میں حکمت سے کام لیتا ہے اور مخلوق کے لیے جو مفید و بہتر ہو اس کو خوب جاننے والا ہے۔"[۵]

یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ بعض مورخین نے چند عورتوں کا تذکرہ کیا ہے جو زمانہ جاہلیت میں شہرت کی حامل رہی ہیں۔ مثلاً عاتکہ بنت مرہ جو عبد مناف کی زوجہ تھی وہ حلف الفضول میں اپنا کردار ادا کرنے کی وجہ سے مشہور ہو گئی تھی، دوسری مشہور خاتون خنساء جو عربی زبان کی مشہور شاعرہ گزری ہے۔ علاوہ ازیں چند مزید عورتیں ہیں جن کو ان کے ملکوں میں اقتدار اور اثر و رسوخ حاصل ہوا، مثال کے طور پر تدمر کی ملکہ زباء اور قوم سبا کی ملکہ بلقیس، لیکن یہ چند استثنائی مثالیں ماقبل اسلام عورتوں کی بدترین حالت کے انکار کا سبب نہیں بن سکتی ہیں۔

لڑکیوں کو زندہ در گور کرنے کی روایت

ماقبل اسلام کے عرب معاشرہ میں لڑکیاں مردود و ناپسندیدہ ہو کر رہ گئی تھیں، بیٹیوں کو عام طور پر پیدائش کے بعد زندہ دفن کر کے ختم کر دیا جاتا تھا۔ قرآن مجید نے ان کے اس فعل بد کو نہایت قبیح اور شنیع قرار دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس بدبختانہ عمل کی مذمت کرتے ہوئے اس کا ارتکاب کرنے والوں کی سرزنش ان الفاظ میں کی ہے:

"و إذا بشر أحدهم باالأنثى ظل وجهه مسودا و هو كظيم يتوارى من القوم من سوء ما بشر به أ يمسكه على هون أم يدسه فى التراب ألا ساء ما يحكمون" (النحل/۵۸-۵۹) (ترجمہ: ان میں سے جب کسی کو لڑکی ہونے کی خبر دی جائے تو اس کا چہرہ سیاہ ہو جاتا ہے اور دل ہی دل میں گھٹنے لگتا ہے اس بری خبر کی وجہ سے لوگوں سے چھپا چھپا پھرتا ہے، سوچتا ہے کہ کیا اس کو ذلت کے ساتھ لیے ہوئے ہی رہے یا اسے مٹی میں دبا دے۔ آہ، کیا ہی برے فیصلے کرتے ہیں)

مذکورہ بالا آیات کریمہ واضح طور پر یہ منظر کشی کر رہی ہے کہ اس وقت کے جاہلی عرب معاشرہ میں لڑکیاں پیدا ہونے کے بعد کسی طرح اپنے خوفناک انجام کی منتظر رہتی تھیں اور ان کی پیدائش کی خبر ان کے باپ کے لیے کیسی اندوہناک خبر ہوا کرتی تھی۔ ان آیات کی تشریح کرتے ہوئے حافظ ابن کثیر نے اپنی تفسیر میں لکھا ہے کہ "اللہ تعالیٰ نے اس آیت مبارکہ میں جاہلی عربوں کے ایک خوفناک اور گھناؤنے گناہ کی خبر دی ہے۔ جب ان میں سے کسی کو لڑکی کی پیدائش کی خبر دی جاتی تھی تو اس کا چہرہ غم و اندوہ کی وجہ سے پیلا پڑ جاتا تھا۔ یہ خبر اس پر بجلی بن کر گرتی تھی، وہ لوگوں سے ملنا جلنا چھوڑ دیتا تھا۔ اس خبر سے اسے شرمندگی محسوس ہوتی تھی۔ اب یا تو وہ اپنی اس بچی سے بے توجہی برتتا اور اسے اپنی شفقت و محبت سے محروم رکھتا یا پھر زمین کھود کر اسے زندہ دفن کر دیتا"۵۔ اللہ تعالیٰ ان کے اس بہیمانہ عمل کے بارے میں ان سے سخت باز پرس کرے گا اور اس کے لیے انہیں مبتلائے عذاب بھی کرے گا۔ اللہ تعالیٰ نے بہت سخت الفاظ میں اس قبیح و شنیع فعل کی مذمت

کرتے ہوئے کہا ہے:”و إذا الموءدة سئلت بأی ذنب قتلت“ (التکویر/۸-۹) (ترجمہ: اور جب زندہ دفن کی ہوئی لڑکی سے سوال کیا جائے گا کہ کس گناہ کی وجہ سے وہ قتل کی گئی؟)

حافظ ابن کثیر اس آیت کے ضمن میں لکھتے ہیں کہ ”قیامت کے دن قتل ہونے والی بچی سے اس کے جرم کے بارے میں پوچھا جائے گا کہ آخر اسے کس جرم کی پاداش میں قتل کیا گیا ہے۔ یہ قاتل کے لیے ایک وارننگ ہوگی اور اس کے ذریعہ اسے یہ احساس دلانا مقصود ہوگا کہ اس نے نہایت قبیح و سنگین جرم کا ارتکاب کیا ہے جس کی سخت سزا اسے عنقریب ملنے والی ہے۔ اس دن مظلوم بچی سے پوچھ تاچھ اس بات کی علامت ہوگی کہ ظالم باپ کا جرم نہایت سنگین ہے جس کی سزا اس کے جرم کے مطابق ہی دردناک ہوگی۔“

عام طور پر عدالت میں مجرم سے جرم کے بارے میں سوالات ہوتے ہیں، لیکن اس آیت کریمہ سے معلوم ہوتا ہے کہ پہلے مظلوم بچی سے سوال کیا جائے گا کہ آخر تمہیں کس جرم میں قتل کیا گیا، اس کی وجہ سے قاتل کے جرم کی سنگینی میں مزید اضافہ ہو جاتا ہے۔ اس دن قاتل اپنے جرم کو، اپنے مقتول کو اور اپنے خلاف تیار ہونے والے مقدمہ کو اپنی آنکھوں سے دیکھے گا۔ قاتل کو دہشت زدہ کرنے کے لیے یہ ایک طاقتور ہتھیار ہے، قاتل کے لیے سب سے زیادہ مشکل اور خوفناک کام مظلوم کا سامنا کرنا ہوتا ہے۔ مقتول بچی کو اللہ تعالیٰ کے سامنے یہ موقع دیا جائے گا کہ وہ اپنے قاتل کا نام پیش کرے اور اس اللہ عز و جل کی عدالت میں اسے مجرم ٹھہرائے جو آسمانوں اور زمینوں کا خالق و مالک ہے۔

اللہ تعالیٰ نے تہدیدی انداز میں اس پورے معاملہ کا تذکرہ کرکے ان لوگوں کو خبردار کیا ہے جو اپنی بچیوں کو یا تو قتل کر چکے ہیں یا انہیں قتل کرنا چاہتے ہیں۔ زمانہ جاہلیت میں عرب فقر و افلاس کے ڈر سے اور کبھی سماج میں بے عزتی کی وجہ سے اپنی بیٹیوں کو زندہ در گور کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں انہیں اس مذموم عمل سے باز رہنے کی تاکید کی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:”قل تعالوا أتل ما حرم ربکم علیکم ألا تشرکوا به شیئا و بالوالدین إحسانا و لا تقتلوا أولادکم من إملاق نحن نرزقکم و إیاهم و لا تقربوا الفواحش ما ظهر منها و ما بطن و لا تقتلوا النفس التی حرم الله إلا بالحق ذلکم وصاکم به لعلکم تعقلون“ (الأنعام/۱۵۱) (ترجمہ: آپ کہیے کہ آؤ میں تم کو وہ چیزیں پڑھ کر سناؤں جن کو تمہارے رب نے تم پر حرام کر دیا ہے، وہ یہ کہ اللہ کے ساتھ کسی چیز کو شریک مت ٹھہراؤ اور ماں باپ کے ساتھ احسان کرو اور اپنی اولاد کو افلاس کے سبب قتل مت کرو۔ ہم تم کو اور ان کو رزق دیتے ہیں اور بے حیائی کے جتنے طریقے ہیں ان کے پاس مت جاؤ، خواہ وہ اعلانیہ ہوں خواہ پوشیدہ اور جس کا خون کرنا اللہ تعالیٰ نے حرام کر دیا ہے اس کو قتل مت کرو، ہاں مگر حق کے ساتھ۔ ان کا تم کو تاکیدی حکم دیا ہے تاکہ تم سمجھو)

حافظ ابن کثیر نے اس آیت کی تفسیر میں لکھا ہے کہ "یہ لوگ شیطان کے بہکاوے میں آکر جب چاہتے اپنی اولاد کو قتل کر ڈالتے تھے۔ کبھی وہ اپنی بیٹی کو سماج میں بے عزتی کے خوف کی وجہ سے قتل کر دیتے تھے اور کبھی بیٹے کو فقر و افلاس کے ڈر سے مار ڈالتے تھے۔"[7]

زمانۂ جاہلیت کے مفاخر اور کارناموں کے دفاع میں بعض مصنفین اور اہل قلم نے اگرچہ یہ بات کہی ہے کہ جاہل عرب اپنی بیٹیوں کو اس لیے مار دیتے تھے تاکہ انہیں سماج میں ذلت اور فقر کا سامنا نہ کرنا پڑے، یہ دراصل بیٹیوں کے تئیں ان کی محبت اور تکریم تھی۔ تاہم اس سلسلے میں میرا یہ کہنا ہے کہ قتل بنات کے پیچھے چاہے جو بھی محرکات ہوں قتل بہر حال ایک جرم ہے۔ مہذب سماج کا کوئی انسان اسے اچھا کام نہیں کہے گا، لہٰذا اللہ تعالیٰ نے قتل اولاد کو ان کے لیے حرام قرار دیا۔

زمانۂ جاہلیت کی ایک قبیح رسم

جاہلی عرب عورتوں کا ایک غیر شائستہ و غیر مہذب عمل یہ تھا کہ وہ برہنگی کی حالت میں کعبہ کا طواف کرتی تھیں۔ سعید بن جبیر نے ابن عباس رضی اللہ عنہ کی روایت نقل کی ہے کہ "زمانۂ جاہلیت میں عورتیں یہ کہتے ہوئے کعبہ کا طواف کرتی تھیں کہ آج مجھے کون کپڑا دے گا جس سے میں اپنی شرمگاہ کو چھپاؤں۔ نیز وہ یہ بھی کہتی تھیں:

اليوم يبدو بعضه أوكله فما بدا منه فلا أحله

(آج یا تو پورا جسم یا اس کا کچھ حصہ کھلا رہے گا، جو حصہ کھلا رہے اسے میں حلال نہیں کروں گی)

اسی ضمن میں قرآن کی یہ آیت نازل ہوئی تھی "يا بني آدم خذوا زينتكم عند كل مسجد"[8] (ترجمہ: اے بنی آدم تم مسجد کی ہر حاضری کے وقت اپنا لباس پہن لیا کرو)

امام نووی نے اس آیت کی تشریح کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "تطواف ایک قسم کی پوشاک تھی جسے زمانۂ جاہلیت کی عورتیں کعبہ کا طواف کرتے وقت پہنتی تھیں۔ زمانۂ جاہلیت کے عرب ننگے ہو کر کعبہ کا طواف کرتے تھے۔ وہ اپنے کپڑے زمین پر پھینک دیتے تھے، لوگ اسے طواف کے دوران روندتے رہتے تھے یہاں تک کہ وہ بوسیدہ ہو جاتے لیکن وہ اپنے کپڑے دوبارہ نہیں اٹھاتے تھے اس رسم بد کو "ملاقات" کا نام دیا جاتا تھا۔ لوگ اسے انجام دیتے رہے یہاں تک کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی بعثت کے بعد اس عمل قبیح کو ممنوع قرار دیا اور لوگوں کو یہ حکم دیا کہ "اب کوئی شخص برہنہ ہو کر کعبہ کا طواف نہیں کرے گا۔"[9]

ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ حجۃ الوداع سے پہلے جس حج کے موقع سے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ابو بکر رضی اللہ عنہ کو امیر الحج مقرر کیا تھا۔ ابو بکر رضی اللہ عنہ نے مجھے لوگوں کی ایک جماعت کے ساتھ بھیجا جسے یوم النحر کو یہ اعلان کرنے کا حکم دیا گیا تھا کہ "اس سال کے بعد سے کوئی مشرک حج نہیں کرے گا اور نہ کوئی شخص برہنہ ہو کر کعبہ کا طواف کرے گا۔" ۱۰

اسی طرح عورتیں زمانۂ جاہلیت میں بے پردہ اور اپنے حسن و آرائش کی نمائش کرتے ہوئے باہر نکلتی تھیں، وہ سینہ کھولے ہوئے مردوں کے درمیان سے گزرتی تھیں اور اپنی زیب و زینت کا مظاہرہ کرتے ہوئے ناز و انداز سے چلتی تھیں۔ اللہ تعالیٰ نے مسلمان عورتوں کو ان بے پردہ و بے حیا عورتوں کے نقش قدم پر چلنے سے منع کیا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:"و لا تبرجن تبرج الجاهلية الأولى" (الأحزاب / ۳۳) (ترجمہ: قدیم جاہلیت کے زمانہ کی طرح اپنے بناؤ سنگار کا اظہار نہ کرو)

شادی بیاہ

اسلام کی آمد سے قبل شادی بیاہ کی مختلف شکلیں رائج تھیں۔ خواتین کی حیثیت جنسی تسکین کے سامان کی تھی جسے صرف مردوں کی جنسی خواہشات کی تکمیل کرنے اور افزائش نسل کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔ مرد شاذ و نادر ہی عورتوں کے احساسات کو سمجھنے اور اس کی ذاتی خواہشات کی تکمیل کی کوشش کرتا تھا۔ عورتوں کے باپ ہی عام طور پر اس کے لیے شریک حیات کا انتخاب کرتے تھے اور باپ بغیر مہر کے ہی اپنی بیٹی کو کسی کے حوالہ کر دیتا تھا۔ شادی بیاہ کی ایک شکل یہ تھی دو مرد اپنی اپنی بیٹیوں کو بغیر مہر کے ایک دوسرے کے نکاح میں دے دیتے تھے، یہ نکاح شغار کہلاتا تھا۔ یہ اسی طرح کا آپسی لین دین تھا جیسے دو افراد سامانوں اور مویشیوں کا ایک دوسرے سے تبادلہ کرتے ہیں۔

عروہ بن زبیر ام المومنین عائشہ رضی اللہ عنہا کے حوالہ سے نقل کرتے ہیں کہ انہوں نے بیان کیا:"اسلام سے قبل زمانۂ جاہلیت میں چار طریقے سے شادی بیاہ کا رواج تھا، ایک تو یہی طریقہ جو آج اسلام کی آمد کے بعد مسلمانوں کے درمیان رائج ہے یعنی ایک شخص دوسرے آدمی سے اس لڑکی کا ہاتھ مانگتا تھا جو اس کے زیر کفالت ہوتی تھی یا اس کی اپنی بیٹی کا نکاح کے لیے ہاتھ مانگتا، اس کے لیے نکاح کرنے والا شخص مہر بھی ادا کرتا تھا اور اس طرح شادی ہو جاتی تھی۔

دوسرا نکاح وہ تھا جسے نکاح استبضاع کہا جاتا تھا۔ اس میں ایک شخص اپنی بیوی کو حیض سے پاک ہونے کے بعد کہتا تھا کہ تم فلاں شخص کو بلوا کر اس کے ساتھ جنسی تعلق قائم کرو، شوہر اس عورت سے کچھ دنوں کے لیے

بستر الگ کرلیتا تھا اور اسے ہاتھ نہیں لگاتا تھا، یہاں تک کہ عورت اس شخص کے ذریعہ حاملہ ہو جاتی تھی جس سے اس نے جنسی تعلق قائم کیا ہوتا تھا۔ حمل کے باقاعدہ طور پر ظاہر ہو جانے کے بعد اگر شوہر کی خواہش ہوتی تو اپنی حاملہ بیوی سے جنسی تعلق قائم کرتا تھا۔ شریف النسل بچہ کی خواہش میں اس طرح کا عمل کیا جاتا تھا۔ یہ نکاح استبضاع کہلاتا تھا۔

تیسری قسم کی شادی کا طریقہ یہ تھا کہ دس سے کم افراد کی ٹولی اکٹھا ہوتی، وہ سب اتفاق رائے سے ایک عورت کا انتخاب کرتے اور سب لوگ اس عورت کے ساتھ جنسی تعلقات استوار کرتے۔ اگر وہ حاملہ ہو جاتی اور کسی بچہ کو جنم دیتی تو بچہ کی پیدائش کے بعد وہ ان تمام لوگوں کو بلواتی جنہوں نے اس کے ساتھ جنسی تعلقات قائم کیا ہوتا، ان میں سے کوئی بھی شخص آنے سے انکار نہیں کر سکتا تھا۔ جب سارے لوگ جمع ہو جاتے تو وہ عورت کہتی تھی؛ تم سب کو پتہ ہے کہ تم نے میرے ساتھ جسمانی تعلقات قائم کیے، اب میں نے ایک بچہ کو جنم دیا ہے، اے فلاں بن فلاں یہ تمہارا بچہ ہے۔ عورت جس کا چاہتی نام لیتی اور وہ بچہ اسی شخص کا مانا جاتا تھا۔ اور وہ آدمی بچہ کو لینے سے انکار نہیں کر سکتا تھا۔

شادی بیاہ کا چوتھا طریقہ یہ تھا کہ بہت سے مرد ایک عورت کے پاس جا کر اس کے ساتھ جنسی تعلقات قائم کرتے تھے۔ وہ عورت کسی کو منع نہیں کرتی تھی۔ یہ فاحشہ وطوائف عورتیں ہوا کرتی تھیں جو بطور علامت اپنے دروازوں پر جھنڈے نصب کرتی تھیں۔ جو شخص بھی چاہتا ان کے ساتھ جسمانی تعلقات قائم کر سکتا تھا۔ اس طرح کی کوئی فاحشہ عورت جب حاملہ ہو جاتی اور بچہ کو جنم دیتی تو اس سے تعلق رکھنے والے تمام مرد اس کے پاس جمع ہوتے تھے، وہاں پر ایک قیافہ شناس کو بلایا جاتا تھا جو بچہ اور اس کے حقیقی باپ کے درمیان مشابہت کو جاننے کی مہارت رکھتا تھا۔ وہ قیافہ شناس بچہ کے اصل باپ کی پہچان کرتا تھا۔ اور وہ عورت بچہ کو اسی آدمی کی نسل سے منسوب کر دیتی تھی، وہی اس بچہ کا باپ کہلاتا تھا اور وہ آدمی اس بچہ کو اپنانے سے انکار نہیں کر سکتا تھا۔ جب نبی کریم محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہوئی تو آپ نے زمانۂ جاہلیت میں رائج شادی بیاہ کے تمام طریقوں کو باطل قرار دیا اور صرف اس ایک طریقہ کی اجازت دی جو آج معاشرہ میں رائج ہے۔"[11]

اس روایت میں زمانۂ جاہلیت میں رائج شادی بیاہ کے مختلف طریقوں کی تفصیل بیان کی گئی ہے۔ ان میں سے تینوں طریقے ایسے ہیں جن سے بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ماقبل اسلام کا جاہلی عرب معاشرہ اخلاق و کردار اور عصمت و پاکدامنی کے معاملہ میں کیسی پستی و انحطاط کا شکار ہو چکا تھا۔

جاہل عربوں کے یہاں زناکاری نہ تو کوئی مذموم عمل تھا اور نہ سماجی طور پر غیر مقبول تھا۔ زناکاری وبدکاری کو مذموم سمجھنے کے بجائے وہ اپنی عورتوں کو اس کے لیے بسا اوقات مجبور کرتے تھے۔ اگر کوئی باندی زناکاری کے ارتکاب سے انکار کرتی تھی تو اس کا مالک حصول مال کے لیے اسے زناکاری کرنے پر مجبور کرتا تھا۔ جب محمد صلی اللہ علیہ وسلم اسلامی تعلیمات کے ساتھ دنیا میں تشریف لائے تو آپ نے لوگوں کو اس فعل بد سے روکا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ”و لا تکرھوا فتیاتکم علی البغاء إن أردن تحصنا لتبتغوا عرض الحیاۃ الدنیا“ (النور/۳۳) (ترجمہ: تمہاری جو لونڈیاں پاکدامن رہنا چاہتی ہیں انہیں دنیا کی زندگی کے فائدے کی غرض سے بدکاری پر مجبور نہ کرو)

مختلف عرب قبائل میں تعدد زوجات کا بڑے پیمانہ پر رواج تھا۔ جس کے پاس جتنی زیادہ بیویاں ہوتیں وہ اتنا ہی زیادہ اس کے لیے باعث فخر ہوتی تھیں۔ تعدد زوجات کی کوئی تعداد متعین نہیں تھی اور اس کے لیے کوئی اصول وضابطہ یا کوئی قانونی بندش بھی نہیں تھی۔ عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ غیلان بن سلمہ نے جب اسلام قبول کیا تو اس وقت اس کے نکاح میں دس عورتیں تھیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا: ”تم ان میں سے صرف چار عورتوں کو اپنے نکاح میں باقی رکھو“۔ ۱۳ حارث بن قیس کی روایت ہے کہ جب میں نے اسلام قبول کیا تو اس وقت میرے نکاح میں آٹھ عورتیں تھیں۔ میں نے اس کے بارے میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو بتایا تو آپ نے فرمایا: ”ان میں سے چار کو منتخب کر لو“۔ ۱۴

اسلام نے تعدد زوجات کے لیے اصول وضابطے متعین کیے ہیں اور اہل ایمان کے لیے یہ واضح کر دیا ہے کہ جو شخص ایک سے زائد بیوی رکھنے کی جسمانی ومالی حیثیت رکھتا ہے اس کے لیے ایک سے زائد بیویوں کے درمیان مساوات قائم کرنے کی اہلیت واستطاعت بھی ہونا ضروری ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ”فإن خفتم أن لا تقسطوا فی الیتامی فانکحوا ما طاب لکم من النساء مثنی و ثلاث و رباع فإن خفتم ألا تعدلوا فواحدۃ أو ما ملکت أیمانکم ذٰلک أدنی أن لا تعولوا“ (النساء/۳) (ترجمہ: اگر تمہیں ڈر ہو کہ یتیم لڑکیوں سے نکاح کر کے تم انصاف نہ رکھ سکو گے تو اور عورتوں میں سے جو بھی تمہیں اچھی لگیں تم ان سے نکاح کر لو، دو-دو، تین-تین، چار-چار سے، لیکن اگر تمہیں برابری نہ کر سکنے کا خوف ہو تو ایک ہی کافی ہے یا تمہاری ملکیت کی لونڈی، یہ زیادہ قریب ہے کہ ایک طرف جھک پڑنے سے بچ جاؤ)

طلاق اور عدت

زمانۂ جاہلیت میں طلاق دینے کے لیے نہ کوئی ضابطہ تھا نہ کوئی رکاوٹ و بندش تھی۔ کوئی بھی شخص اپنی بیوی کو جب چاہتا اور جتنی مرتبہ چاہتا طلاق دے دیتا تھا۔ اس رواج نے معاشرہ میں عورتوں کی حیثیت کو حقیر اور کم تر بنا کے رکھ دیا تھا۔ اس کے بارے میں قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا یہ حکم نازل ہوا: "الطلاق مرتان فإمساک بمعروف أو تسریح بإحسان" (البقرہ/۲۲۹) (ترجمہ: یہ طلاقیں دو مرتبہ ہیں، پھر یا تو اچھائی سے روکنا یا عمدگی کے ساتھ چھوڑ دینا ہے)

اس آیت کی تفسیر میں قرطبی نے لکھا ہے کہ عدت (دوسری شادی سے پہلے انتظار کی متعینہ مدت) ما قبل اسلام جاہلی عرب معاشرہ میں طے شدہ تھی۔ تاہم ایک آدمی اپنی بیوی کو جتنی مرتبہ چاہتا طلاق دے دیتا تھا اور طلاق کی عدت ختم ہونے سے ذرا پہلے اس سے رجوع کر لیتا تھا۔ عہد نبوی میں ایک شخص نے اپنی بیوی سے کہا کہ میں تم کو اپنی زوجیت میں بھی نہیں رکھوں گا اور نہ ہی آزاد کروں گا۔ اس نے دریافت کیا: ایسا کس طرح کروگے؟ اس نے جواب دیا: میں تم کو طلاق دوں گا پھر عدت ختم ہونے سے ذرا پہلے تم سے رجوع کر لوں گا۔ اس خاتون نے اس کی شکایت عائشہ رضی اللہ عنہا سے کی اور انہوں نے اس کے بارے میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو بتایا تو اسی ضمن میں طلاق سے متعلق مذکورہ بالا آیت نازل ہوئی"۔ [۱۵]

عورتوں کے لیے ملکیت کا حق

زمانہ جاہلیت میں عورتوں کے لیے ملکیت کا کوئی حق تسلیم شدہ نہیں تھا۔ عام طور پر عورتیں کسی بھی چیز کی مالک نہیں ہوتی تھیں۔ عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کی ایک روایت سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے۔ انہوں نے کہا: "اللہ کی قسم! اسلام کی آمد سے پہلے زمانۂ جاہلیت میں ہم عورتوں کو قابل اعتناء ہی نہیں سمجھتے تھے، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے بارے میں وہ احکامات نازل کیے جو اس نے نازل کیے ہیں اور ان کے لیے مال اور جائیداد میں وہ حصہ متعین کیا جو اس نے متعین کیا ہے"۔ [۱۶]

عورتوں اور بچوں کا وراثت میں کوئی حق ہی نہیں تھا۔ وراثت پر مردوں کا مکمل حق ہوا کرتا تھا، کیونکہ وہ تلوار اٹھاتا، قبیلہ کا دفاع کرتا اور آراضی کا تحفظ کرتا تھا۔

واحدی نے اپنی کتاب "اسباب النزول" میں لکھا ہے کہ "جاہلی عرب معاشرہ کے لوگ وراثت میں سے عورتوں اور بچوں کو کچھ بھی نہیں دیتے تھے، اگرچہ وہ لڑکا ہی کیوں نہ ہو، وہ لوگ صرف بڑی عمر کے مردوں کو مال وراثت کا حقدار بناتے تھے اور وہ کہتے تھے کہ یہ مال وراثت صرف اسے ہی دیا جائے گا جو گھوڑی کی پیٹھ پر سوار ہو کر دشمن سے جنگ کرے گا اور اس سے مال غنیمت حاصل کرے گا"۔ [۱۷]

اسلام سے پہلے لوگوں کی قدر و قیمت اس بات سے طے ہوتی تھی کہ وہ میدان جنگ میں کتنا کارآمد ہے نیز یہ کہ مادی طور اس کے اندر انتاج کی صلاحیت کتنی ہے ۱۸۔ اس دور کے لوگ عورتوں کو بھی دیگر سامانوں کی طرح وراثت میں تقسیم کرتے تھے۔ مرنے والے کا سب سے قریبی رشتہ دار اس کے دیگر سامانوں اور غلاموں کے ساتھ اس کی بیویوں کو بھی وراثت میں حاصل کرتا تھا۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ "جب کسی شخص کا انتقال ہو جاتا تو اس کے رشتہ دار اس کی بیوی کو بطور وراثت حاصل کرنے کے حقدار ہوتے تھے، اگر اس کی خواہش ہوتی تو اس سے شادی کر لیتا یا عورت کی مرضی کے بغیر کسی اور سے اس کی شادی کرا دیتا۔ یا وہ چاہتے تو کسی سے بھی اس کی شادی نہیں کراتے، لیکن مرد کے رشتہ دار ہی عورت کے اوپر اس کے اپنے سگے رشتہ داروں سے بھی زیادہ حق رکھتے تھے۔ اس سلسلہ میں یہ آیت کریمہ نازل ہوئی: "يا أيها الذين آمنوا لا يحل لكم أن ترثوا النساء كرها و لا تعضلوهن لتذهبوا ببعض ما آتيتموهن" ۱۹۔ (ترجمہ: ایمان والو! تمہیں حلال نہیں کہ زبردستی عورتوں کو ورثے میں لے بیٹھو، انہیں اس لیے روک نہ رکھو کہ جو تم نے انہیں دے رکھا ہے اس میں سے کچھ لے لو)

تفسیر ابن کثیر میں منقول ہے: "علی بن طلحہ عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے حوالہ سے نقل کرتے ہیں کہ جب کسی کا انتقال ہو جاتا اور وہ اپنی کوئی نوجوان عورت چھوڑ جاتا تو اس کا قریبی وارث اس عورت کے اوپر کپڑا رکھ دیتا اور لوگوں سے اس کی حفاظت کرتا، اگر وہ عورت خوبصورت ہوتی تو اس سے شادی کر لیتا اور اگر وہ بدصورت ہوتی تو اسے تاحیات اپنے پاس روک کر رکھتا۔ العوفی نے نقل کیا ہے: جب کوئی شخص مر جاتا تو اس کا قریبی وارث اس کی بیوی سے شادی کرنے کا حق رکھتا تھا، دوسرا کوئی بھی شخص اس کی رضامندی کے بغیر اس عورت سے شادی نہیں کر سکتا تھا۔ یا پھر مرنے والے کا وارث اس کی بیوی کو اپنے پاس روک کر رکھتا تھا، یہاں تک کہ کوئی شخص آتا اور زر فدیہ ادا کر کے اس عورت کو آزاد کراتا تھا"۔ ۲۰۔

اسلام سے پہلے بیشتر عرب عورتوں کی یہی حالت تھی۔ لیکن اسی کے ساتھ تاریخ و سیرت نبوی کی کتابوں میں یہ بات آئی ہے کہ کچھ عورتوں کو جائیداد رکھنے کی اجازت تھی۔ اور ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ اسلام سے پہلے ہی سے خدیجہ بنت خویلد رضی اللہ عنہا کی اپنی تجارت تھی اور کئی مرد ان کے یہاں ملازمت کرتے تھے۔ تاہم ہمیں یہ نہیں معلوم کہ یہ مال و اسباب انہیں کس طرح حاصل ہوئے تھے۔ یہ چند استثنائی مثالیں جاہلی عرب معاشرہ میں عورتوں کے تعلق سے رائج اصول و ضوابط اور رسم و رواج پر اثر انداز نہیں ہوتی ہیں۔

اس باب میں عورتوں کی صورت حال سے متعلق جو باتیں گزری ہیں ان سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ اسلام کی آمد سے پہلے عورتیں معاشرہ میں بے حیثیت تھیں اور قدم قدم پر ان کی تحقیر و تذلیل ہوتی تھی۔ اگرچہ اس بات کے دستاویزی ثبوت موجود ہیں کہ اس دور کی چند عورتوں کو جائیداد رکھنے اور تجارت کرنے کی اجازت تھی، لیکن یہ استثنائی صورت حال ہے۔ بدقسمتی سے یہ چند استثنائی مثالیں جاہلی عرب معاشرہ میں عورتوں سے متعلق ظالمانہ قوانین اور رسوم و رواج پر اثر انداز نہیں ہوتی ہیں۔

اس باب میں پیش کردہ قرآنی آیات سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ معاشرہ میں مظلوم عورتوں کی حالت کو تبدیل کرنے میں اسلام کی تعلیمات نے اہم رول ادا کیا ہے۔ اسلام نے عورتوں کے حقوق کو تسلیم کیا ہے اور زمانۂ جاہلیت کے ظالمانہ رسوم و رواج سے عورتوں کو تحفظ دینے کے انتظامات کیے ہیں۔

حواشی:

۱۔ احمد خاکی کی المرأة فی العصور المختلفہ، ص ۶۳

۲۔ حبیب آفندی الدمشقی کی المرأة فی الجاہلیۃ، ص ۲

۳۔ ابوعبداللہ محمد بن أحمد الأنصاری القرطبی کی الجامع لأحکام القرآن

(النحل / ۵۷)

(الزخرف / ۱۹)

(الأنعام / ۱۳۹)

۴۔ ابوجعفر محمد بن جریر طبری کی جامع البیان فی تفسیر القرآن جلد ۱۲

(النحل / ۵۸-۵۹)

(الزخرف / ۱۷)

۵۔ حافظ عماد الدین اسماعیل بن کثیر کی تفسیر القرآن العظیم جلد ۲

(التکویر / ۸-۹)

۶۔ عبدالکریم الخطیب کی التفسیر القرآنی للقراءات جلد ۱۵، جزء ۳۰ ص ۱۴۶۹

۷۔ تفسیر ابن کثیر جلد ۲، ص۱۸۹

۸۔ شرح نووی کتاب التفسیر، جلد ۵، ص۸۷۸

۹۔ حوالہ سابق

۱۰۔ حوالہ سابق ج ۳، کتاب الحج، ص ۴۹۴

۱۱۔ ابن حجر عسقلانی کی فتح الباری جلد ۹، کتاب النکاح، ص ۱۸۲

۱۲۔ محمد علی الصابونی کی مختصر تفسیر ابن کثیر جلد ۲، ص ۶۰۴

۱۳۔ الحافظ ابو عبد اللہ محمد بن یزید بن ماجہ القزوینی کی سنن ابن ماجہ، کتاب النکاح، ص ۶۲۸

۱۴۔ حوالہ سابق

۱۵۔ القرطبی جلد ۲ ص ۹۳۴

۱۶۔ الامام ابو عبد اللہ محمد بن اسماعیل البخاری کی صحیح البخاری، تفسیر سورہ نمبر ۶ جلد ۶، ص۷۹

۱۷۔ الواحدی، ص۹۶

۱۸۔ سید قطب کی فی ظلال القرآن، تفسیر سورہ نمبر ۴

۱۹۔ ابن حجر عسقلانی کی فتح الباری جلد ۸، کتاب التفسیر، ص ۲۴۵

۲۰۔ تفسیر ابن کثیر جلد ۱، ص ۴

حصہ دوم

اسلام میں عورتوں کے حقوق

چوتھا باب

اسلام میں عورتوں کے شہری و معاشرتی حقوق

ہم نے اس کتاب کے پہلے حصہ میں قدیم تہذیبوں میں عورتوں کی صورت حال پر تفصیل سے روشنی ڈالی تھی۔ وہاں یہ بات واضح ہو گئی تھی کہ اس قدیم انسانی معاشرہ میں عورت عام طور پر ظلم وجبر کا شکار تھی۔ وہ کئی طرح کے صنفی امتیازات اور تفریق کا سامنا کرتی تھی۔ نہ تو اس کے حقوق تھے، نہ اس کے انسان ہونے کا پاس ولحاظ رکھا جاتا تھا۔ اسلام کی آمد تک یہی صورت حال برقرار رہی۔ اسلام کی تعلیمات نے لوگوں کو بتایا کہ تمام بنی نوع انسان کے ساتھ عدل و انصاف کا برتاؤ کس طرح کیا جاسکتا ہے۔ اسلام نے آکر عورتوں کو ظلم و جبر اور تذلیل و تحقیر سے بھی بچایا۔ اسلام نے آکر عورتوں سے متعلق لوگوں کی غلط فہمیوں کو دور کیا، اس نے عورتوں کے ساتھ انصاف کا نظام قائم کیا اور سماج میں عورتوں کو ایک باعزت مقام عطا کیا۔

اسلام نے ایک انسان ہونے کی حیثیت سے معاشرہ میں عورتوں کی عزت وحیثیت کو بحال کیا تاکہ وہ سماج کی تعمیر میں اپنا کردار ادا کرسکے۔ اسلام نے یہ بھی ثابت کیا کہ قوموں کی ترقی وخوشحالی میں عورتوں کی بھی ایک اہم حصہ داری ہے جس کا انکار نہیں کیا جاسکتا ہے۔

اسلام نے عورتوں کو ان کے مکمل حقوق دیئے ہیں۔ واضح نصوص کے ذریعہ عورتوں کے حقوق کو ثابت کیا ہے اور اس کا اعلان کیا ہے۔ عورتوں کے حقوق سے متعلق ان واضح ترین نصوص میں تحریف و تشکیک کی کوئی گنجائش نہیں چھوڑی گئی ہے۔ اسلام نے واضح انداز میں بچیوں کو رحم مادر میں یا پیدائش کے بعد بچپن میں قتل کرنے سے روکا ہے۔ اسلام نے بچیوں کی پرورش کرنے کی ترغیب دی ہے۔ عورتوں کی باعزت زندگی کو یقینی بنانے کے لیے اور اخراجات کے بوجھ سے اسے آزاد رکھنے کے لیے اسلام نے بہترین قوانین عطا کیے ہیں۔ گھر اور خاندان میں اس کے ساتھ شفقت و مہربانی کا معاملہ کیا جائے اور اس کی مکمل نگہداشت و خبر گیری ہوتی رہے، اسلام نے اس کے لیے واضح رہنمائی کی ہے۔

اسلام نے عورتوں کو بدنامی، تذلیل اور غلط تہمتوں سے بچانے کے لیے ایک بہترین حفاظتی نظام کو نافذ کیا ہے۔ اسلام نے عورتوں کو ہر طرح کا تحفظ عطا کیا ہے جس کی اس کو ضرورت تھی۔ لیکن صدیوں سے انہیں وہ

تحفظ حاصل نہیں تھا اور آج بھی بہت سے نام نہاد مہذب معاشرے میں جہاں حقوق انسانی کے لمبے چوڑے دعوے کیے جاتے ہیں عورتوں کو یہ تحفظات حاصل نہیں ہیں۔

انسان ہونے کا حق

"اسلام نے عورت کی انسانیت کو مسلم کیا"

اللہ تعالیٰ نے تمام انسانوں کو مکرم و معزز بنایا ہے۔ اور انہیں مخلوقات میں باعزت مقام عطا کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:"و لقد کرمنا بنی آدم و حملناھم فی البر و البحر و رزقناھم من الطیبات و فضلناھم علی کثیر من خلقنا تفضیلاً" (الاسراء/ ۷۰) (ترجمہ: یقیناً ہم نے اولاد آدم کو بڑی عزت دی اور انہیں خشکی وتری کی سواریاں دیں اور انہیں پاکیزہ چیزوں کی روزیاں دیں اور اپنی بہت سی مخلوق پر انہیں فضیلت عطا فرمائی)

اس آیت کی تشریح کرتے ہوئے سید قطب نے اپنی تفسیر فی ظلال القرآن میں لکھا ہے کہ "اللہ تعالیٰ نے جس ہیئت اور شکل میں انسان کی تخلیق کی اور جس طرح مٹی سے اس کا ڈھانچہ تیار کر کے، پھر اس میں روح پھونک کر اس کی فطرت کی تشکیل کی، اس طرح اس کے ظاہری ڈھانچہ میں آسمان اور زمین دونوں کا اجتماع ہو گیا، یہ سب اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کی تکریم کا پہلو ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کی فطرت میں صلاحیتیں ودیعت کر کے بھی اس کی تکریم کی ہے۔ اس کی وجہ سے وہ روئے زمین پر اللہ تعالیٰ کا خلیفہ بننے کا اہل ہوا، جس کے بعد وہ اپنی دنیا میں تغیر و تبدل کرنے لگا، اپنے انتاجات کو پیش کرنے لگا، کسی چیز کو بنا کر اسے وجود میں لانے لگا بایں طور کہ وہ اسے کبھی جوڑتا ہے، کبھی اسے تحلیل کرتا ہے اور اس کے ذریعہ وہ زندگی کے اس اوج کمال تک پہنچتا ہے جو اس کے لیے مقدر کیا گیا ہے۔ کائنات کی طاقتوں میں سے زمین کو اس کے لیے مسخر کر کے اس کی تکریم کی گئی ہے۔ ستاروں اور افلاک کو اس کا معاون بنا کر اس کی مدد کی گئی ہے۔ اس کے وجود کا زبردست استقبال کر کے بھی اس کی تکریم کی گئی ہے۔ اور آسمان والوں کے اس عظیم الشان اجتماع کے ذریعہ اس کی تکریم کی گئی ہے جس میں تمام فرشتوں نے اس کو سجدہ کیا اور خالق جل شانہ نے فرشتوں کے اس بھرے مجمع میں اس انسان کے مکرم ہونے کا اعلان کیا"۔[۱]

قرطبی نے اپنی تفسیر میں لکھا ہے کہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے اس طرح کی عزت افزائی صرف انسان کے لیے خاص کیا ہے، اس کے علاوہ کسی دوسری مخلوق کو یہ تکریم حاصل نہیں ہے۔ انہوں نے اس تکریم کی مزید وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے:"لقد کرمنا بنی آدم (ہم نے بنی آدم کی تکریم کی) کا مطلب یہ ہے کہ ہم نے اسے عزت و شرف و فضیلت عطا کی۔ اس تکریم میں یہ بھی شامل ہے کہ اللہ نے اس ہیئت و شکل، قدو قامت اور

بہترین شکل و صورت کے ساتھ اس کی تخلیق کی۔ اور اللہ نے خشکی اور سمندر میں سفر کرنے کی اسے صلاحیت عطا کی، اس کے لیے وہ اپنے حساب سے وسائل و ذرائع، اوقات اور صورت حال کا انتخاب کرتا ہے"۔ ۲

ابن کثیر نے اس آیت سے استدلال کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کے ذریعہ فرشتوں اور دیگر تمام مخلوقات پر انسانوں کی برتری و فوقیت کو ثابت کیا ہے۔

تمام بنی نوع انسان، چاہے وہ مرد ہو یا عورت ان کی اپنی تخلیق کے ذریعہ ہی تکریم کی گئی ہے۔ یہ عزت افزائی اللہ پاک کے علاوہ کسی اور کی عطا کردہ نہیں ہے۔ یہ تکریم تکوینی طور پر اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ ہے۔ اسے انسان نے زمین پر آکر اپنی صلاحیت سے حاصل نہیں کیا ہے۔ قرآن مجید میں اس تکریم و عزت افزائی کا تذکرہ واضح لفظوں میں موجود ہے۔ اور عزت افزائی تمام انسانوں کو بلا امتیاز رنگ و نسل و جنس و وطن عطا کی گئی ہے، اس لیے کہ تمام لوگ ایک ہی انسانی نسل سے تعلق رکھتے ہیں اور بنی نوع انسان کے لیے جس تکریم کا اعلان کیا گیا ہے، اس کے سب انسان مستحق ہیں، کیونکہ سب ایک ہی ماں باپ سے وجود میں آئے ہیں۔

ایک مرتبہ ایک جنازہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس سے گزرا، جب اس پر آپ کی نگاہ پڑی تو آپ کھڑے ہو گئے، کسی صحابی نے بتایا کہ یہ یہودی کا جنازہ ہے۔ آپؐ نے فرمایا: "تو کیا ہوا، کیا یہ انسانی جان نہیں تھا؟" ۳

اس موقعہ پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کس قدر بلیغ، حکیمانہ اور سچی بات کہی ہے جو انسانیت کی تکریم و عزت افزائی کو ثابت کرتی ہے اور اسے اس طرح تاکیدی طور پر واضح کرتی ہے کہ اس کے بعد انسانیت کی تکریم کے معاملہ میں کسی شک کی گنجائش باقی نہیں رہتی ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا عورت کا وجود ایک جان نہیں ہے؟ کیا عورت ایک انسانی جان ہونے کی وجہ سے اس تکریم کی مستحق نہیں ہے؟ یقینی طور پر عورت بھی ایک انسانی جان ہے اور وہ بھی تکریم کی حقدار ہے جیسا کہ قرآن مجید کی آیتوں اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث سے معلوم ہوتا ہے۔ اس سلسلے میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "يا أيها الناس اتقوا ربكم الذى خلقكم من نفس واحدة" (النساء/۱) (ترجمہ: اے لوگو! تم اپنے رب سے ڈرو جس نے تمہیں ایک جان سے پیدا کیا ہے) اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: "بیشک مرد اور عورتیں ایک دوسرے کے بھائی بہن ہیں۔" ۴

اوپر قرآن مجید کی جو آیت نقل کی گئی ہے وہ تاکیدی طور پر اس حقیقت کو ثابت کرتی ہے کہ تمام مردوں اور عورتوں کو ایک جان سے پیدا کیا گیا ہے۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے "اے لوگو!" کہہ کر خطاب کیا ہے۔ اس میں بلالحاظ رنگ و نسل و صنف اور مذہب و مقام تمام مرد و عورت آجاتے ہیں۔ عربی زبان میں اور قرآن

کے اندر "الناس" کا لفظ بنی نوع انسان کے لیے آیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "یا أیها الناس اتقوا ربکم الذی خلقکم من نفس واحدة و خلق منها زوجها و بث منهما رجالا کثیرا و نساءا و اتقوا الله الذی تساءلون به والأرحام إن الله کان علیکم رقیبا" (النساء/۱) (ترجمہ: اے لوگو! اپنے پروردگار سے ڈرو جس نے تمھیں ایک جان سے پیدا کیا اور اسی سے اس کی بیوی کو پیدا کر کے ان دونوں سے بہت سے مرد اور عورتیں پھیلا دیں، اس اللہ سے ڈرو جس کے نام پر ایک دوسرے سے مانگتے ہو اور رشتے ناطے توڑنے سے بھی بچو، بیشک اللہ تعالیٰ تم پر نگہبان ہے)

یہ آیت واضح طور پر اس حقیقت کو اجاگر کرتی ہے کہ تمام مردوں اور عورتوں کو ایک جان سے پیدا کیا گیا ہے۔ ان سب کی تخلیق ایک ہی نسل سے ہوئی ہے اور انسان ہونے کے معاملہ میں سب برابر ہیں۔

اس حقیقت کو ثابت کرنے کے لیے ہی "الذی خلقکم من نفس واحدة" پر "وخلق منها زوجها" کو عطف کیا گیا ہے۔ اس کے ذریعہ یہ بتانا مقصود ہے کہ مردوں اور عورتوں دونوں کو ایک ہی جان سے پیدا کیا گیا ہے۔

اس آیت کی دو طرح سے تفسیر کی گئی ہے:

(الف) پہلی تفسیر یہ ہے کہ آیت میں "منها" آیا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ آدم علیہ السلام کی جان یا روح سے ان کو پیدا کیا گیا۔ یعنی آدم علیہ السلام کی بیوی کو ان کی پسلی سے پیدا کیا گیا۔ آدم علیہ السلام سے حواء کی تخلیق کے قصہ کو بیشتر قدیم مفسرین نے نقل کیا ہے۔[۵]

ابن کثیر نے لکھا ہے کہ "اہل کتاب کے ذریعہ ہمیں یہ خبر پہنچی ہے، خاص طور پر اہل توریت کے ذریعہ یہ معلوم ہوا ہے کہ آدم علیہ السلام کو سونے کے لیے بھیج دیا گیا۔ اسی اثناء میں اللہ تعالیٰ نے ان کی بائیں پسلی کو لیا اور اسے گوشت کے لوتھڑے میں تبدیل کر دیا۔ اس کے بعد آدم علیہ السلام نیند سے بیدار ہوئے اور اپنی بیوی حواء کو جسے اللہ نے ان کی پسلی سے پیدا کیا تھا، اپنے پاس موجود پایا۔ جب آدم علیہ السلام نے بیدار ہونے کے بعد حواء کو اپنے قریب میں پایا تو اہل کتاب کے بقول آدم علیہ السلام نے کہا: "میرا گوشت، میرا خون، میری بیوی۔" اس طرح آدم علیہ السلام نے حواء پر بھروسہ کیا، اللہ تعالیٰ نے دونوں کے ایک ساتھ رہنے کو منظوری دی اور دونوں کو رشتۂ ازدواج میں منسلک کر دیا۔ لیکن اس سے پہلے اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام سے کہا تھا: "و قلنا یا آدم اسکن أنت و زوجک الجنة و کلا منها رغدا حیث شئتما و لا تقربا هذه الشجرة فتکونا من الظالمین" (البقرة/۳۵) (ترجمہ: اور ہم نے کہہ دیا کہ اے آدم! تم اور تمہاری بیوی جنت میں رہو اور جہاں کہیں سے چاہو بافراغت کھاؤ پیو لیکن اس درخت کے قریب بھی نہ جانا، ورنہ ظالم ہو جاؤ گے)

یہ بھی کہا گیا ہے کہ جب حواء علیہا السلام کی تخلیق ہوئی تو آدم علیہ السلام جنت میں ہی موجود تھے۔ سعدی نے عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ابلیس کو جنت سے نکال دیا تھا اور آدم علیہ السلام کو جنت میں رہنے کی اجازت دے دی تھی۔ آدم علیہ السلام کو جنت میں تنہائی کا احساس ہوا، وہاں ان کی کوئی بیوی نہیں تھی جس سے سکون پا سکیں۔ اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام پر نیند طاری کر دی، جب وہ نیند سے بیدار ہوئے تو اپنے سرہانے میں ایک عورت کو پایا جسے اللہ تعالیٰ نے ان کی پسلی سے پیدا کیا تھا۔ آدم علیہ السلام نے حواء سے پوچھا: تم کون ہو؟ حواء نے کہا: میں ایک عورت ہوں۔ آدم علیہ السلام نے پوچھا: تمہاری تخلیق کس لیے ہوئی ہے؟ حواء نے جواب دیا: تاکہ تم کو مجھ سے سکون حاصل ہو۔ فرشتوں نے جنہیں معلوم تھا کہ آدم علیہ السلام کو خصوصی علم عطا کیا گیا ہے، ان سے دریافت کیا: اے آدم! اس کا کیا نام ہے؟ آدم علیہ السلام نے جواب دیا: اس کا نام حواء ہے یعنی زندہ مخلوق۔ فرشتوں نے دریافت کیا: حواء نام رکھنے کی وجہ کیا ہے؟ آدم علیہ السلام نے بتایا: حواء نام رکھنے کی وجہ یہ ہے کہ ایک زندہ چیز سے اس کی تخلیق ہوئی ہے۔[٦]

دیگر اہل علم کے ساتھ استاذ بہی خولی نے اس رائے کی تائید کی ہے۔ انہوں نے اپنی کتاب "آدم علیہ السلام" میں اس رائے کی تائید کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "ہم اللہ تعالیٰ کی کتاب قرآن مجید میں اس آیت کی تلاوت کرتے ہیں: خلقكم من نفس واحدة و خلق منها زوجها (النساء/١) (ترجمہ: اللہ نے تم کو ایک جان سے پیدا کیا ہے اور اس سے اس کی بیوی کی بھی تخلیق کی ہے) بلا اختلاف اس ایک جان سے مراد آدم علیہ السلام ہیں۔ شوہر کے جسم سے بیوی کی تخلیق اور پھر بیوی کی اس سے علاحدگی فطری قوانین کے عین مطابق ہے۔ زندہ چیزوں کا آپس میں تقسیم در تقسیم کے عمل سے گزرنے کے بعد کثرت تعداد میں تبدیل ہونا پھر توالد و تناسل کے عمل کے ذریعہ کثرت تعداد میں بدل جانا، سائنسی اعتبار سے بھی ثابت شدہ ہے۔ جب قرآنی نصوص نے ہمارے لیے یہ ثابت کر دیا کہ اولین انسان کی مادہ کی تخلیق اس کے ذریعہ انقسام و انفصال کے عمل سے گزرنے کے بعد ہوئی تھی۔ پھر توالد و تناسل کے معروف طریقہ کے ذریعہ دونوں نسل انسانی کی افزائش و کثرت کا سبب بنے۔ یہ تھیوری سائنسی اعتبار سے بھی ثابت شدہ ہے اور بعض سائنسی مسلمات سے اس کی تائید ہوتی ہے۔ اس کی وضاحت اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد سے بھی ہوتی ہے: "عورت کی تخلیق پسلی سے ہوئی ہے۔"[٧]

ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "عورت پسلی سے پیدا کی گئی ہے۔ وہ تمہارے لیے بالکل سیدھی کبھی نہیں ہو سکتی ہے۔ تم اگر اس کی کجی کے ساتھ فائدہ اٹھا سکتے ہو تو فائدہ حاصل کرو۔ اگر تم اسے سیدھا کرنے چلو گے تو تم اسے توڑ دو گے۔ اس کو توڑنا اسے طلاق دینا ہے۔"[٨]

ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے ایک دوسری روایت بھی منقول ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "عورتوں کے ساتھ نرمی و مہربانی کا معاملہ کرو، عورت کو پسلی سے پیدا کیا گیا ہے، پسلی کا سب سے زیادہ ٹیڑھا حصہ اوپر کا ہوتا ہے۔ اگر تم اسے سیدھا کرنا چاہو گے تو اسے توڑ دو گے۔ اور اگر تم اسے اپنی حالت پر چھوڑ دو گے تو اس کا ٹیڑھا پن باقی ہی رہے گا، لہٰذا تم عورتوں کے ساتھ مہربانی کا معاملہ کرو"۔[9]

اس حدیث کی تشریح کرتے ہوئے امام نووی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اس حدیث میں علماء اور فقہاء کے اس قول کی دلیل ہے کہ حواء کو آدم علیہ السلام کی پسلی سے پیدا کیا گیا ہے، اس حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو یہ مشورہ دیا ہے کہ وہ عورتوں کے ساتھ مہربانی اور احسان کا معاملہ کریں اور ان کے عقل و مزاج کی کجی و کمزوری پر صبر کیا کریں۔"[10]

(ب) آیت کی دوسری تفسیر کے مطابق "منها" کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اسی مادہ سے حواء کی تخلیق کی جو بنی نوع انسان کی تخلیق کے لیے تیار کیا گیا تھا۔

اس آیت کی تشریح کرتے ہوئے امام رازی کہتے ہیں کہ اسی مادہ سے اللہ تعالیٰ نے ان کی بیوی حواء کو پیدا کیا ہے۔ یعنی آدم علیہ السلام ہی کی جنس اور مادہ سے حواء کو پیدا کیا گیا[11] جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "و الله جعل لكم من أنفسكم أزواجاً" (النحل/۷۲) (ترجمہ: اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے تم میں سے ہی تمہاری بیویاں پیدا کیں)

اوپر کی آیت "خلقكم من نفس واحدة" میں "من" ابتداء غایت کے لیے ہے، جب تخلیق کی ابتداء آدم علیہ السلام سے ہوئی تو یہ کہنا صحیح ہو گیا کہ اللہ تعالیٰ نے تمہاری تخلیق ایک جان سے کی ہے۔ اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ حواء آدم علیہ السلام کا ہی ایک جزء ہے بلکہ اس سے یہ معلوم ہوا کہ تخلیق کے معاملہ میں آدم کو اولیت حاصل ہوئی اور حواء کی تخلیق اسی مادہ سے بعد میں ہوئی۔

اہل علم میں سے یہی رائے شیخ عبد الکریم خطیب کی بھی ہے۔ وہ کہتے ہیں: "اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ نے اس ایک جان سے اور ایک ہی جنس اور مادہ سے آدم علیہ السلام کا جوڑا پیدا کیا جو خود بھی ایک جان تھی۔ ایک انسان ہونے کی حیثیت سے اسے آدم سے منسلک نہیں کیا جائے گا بلکہ اسے اس مادہ سے جوڑا جائے گا جو بنی نوع انسان کی تخلیق کے لیے تیار کیا گیا تھا۔ اسی مادہ سے آدم علیہ السلام کی تخلیق ہوئی اور اسی مادہ سے ان کی بیوی حواء کی تخلیق ہوئی اور حواء کی تخلیق کے بعد ہی آدم کی تخلیق مکمل ہوئی۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "و خلقناكم أزواجا" (النبأ/۸) (ترجمہ: اور ہم نے تمہیں جوڑا جوڑا پیدا کیا) یہ جوڑا جوڑا کر کے پیدا کرنا صرف بنی نوع انسان کے ساتھ خاص نہیں ہے بلکہ اللہ نے اپنی دوسری مخلوقات کو بھی جوڑا جوڑا کر کے پیدا کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد

ہے:"و من کل شیء خلقنا زوجین لعلکم تذکرون" (الذاریات/۴۹) (ترجمہ: اور ہر چیز کو ہم نے جوڑا جوڑا پیدا کیا ہے تاکہ تم نصیحت حاصل کرو) یہ آیت صاف طور پر بتا رہی ہے کہ ایک انسان اپنے ڈھانچہ کے اعتبار سے فطری طور پر مذکر و مونث دونوں کی خصوصیات سموئے ہوئے ہے۔ اس لیے کہ اس کے ڈھانچہ کا تعلق اس مادہ سے ہے جس سے اصلاً اس کی تخلیق ہوئی ہے۔ اس طرح مذکر کے ڈھانچہ کے اندر مذکر و مونث دونوں کا جزء ہے اور مونث کے ڈھانچہ کے اندر بھی مونث و مذکر دونوں کا جزء ہے۔ یہ ایک ثابت شدہ سائنسی حقیقت بھی ہے جسے سب سے پہلے قرآن مجید نے بیان کیا ہے۔[۱۲]

میں مندرجہ ذیل اسباب کی بناء پر آیت کی دوسری تفسیر کو ترجیح دیتا ہوں:

پہلا سبب: آدم علیہ السلام کی پسلی سے حواء کی تخلیق کی تفسیر توریت سے ماخوذ ہے، احادیث نبویہ سے اس کی تائید نہیں ہوتی ہے۔

دوسرا سبب: آیت میں یہ صراحت نہیں ہے کہ "نفس" کا تعلق صرف آدم علیہ السلام کی ذات سے ہے۔

تیسرا سبب: حدیث میں ٹیڑھی پسلی کی جو بات آئی ہے اس سے صاف طور پر یہ معلوم ہو رہا ہے کہ اس کا مقصد بیویوں کے ساتھ خیر کا معاملہ کرنے کی وصیت کرنا ہے اور عورتوں سے جو لغزشیں ہوں ان کو نظر انداز کرنے کی تلقین کرنا ہے۔[۱۳]

آیت کا یہ مفہوم امام نووی کے ذریعہ کی گئی اس حدیث کی تشریح کے عین موافق ہے جو ابھی اوپر نقل کی گئی ہے۔ نیز یہ مفہوم اوپر نقل کردہ حدیث رسول کے نص کے بھی عین موافق ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیث کا آغاز بھی عورتوں کے ساتھ حسن سلوک کی تلقین کے ساتھ کیا ہے اور آپ نے حدیث کا اختتام بھی ان الفاظ کے ساتھ کیا ہے کہ "استوصوا بالنساء خیراً" (یعنی تم لوگ عورتوں کے ساتھ بھلائی کا معاملہ کرنے کی وصیت قبول کرو) نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیث میں یہ وضاحت بھی کر دی ہے کہ عورت کو توڑنے کا مطلب اسے طلاق دینا ہے۔

آیت کی تشریح سے متعلق جو دو اقوال اوپر ذکر کیے دونوں کا ماحصل ایک ہی ہے اور وہ یہ ہے کہ عورت کا انسان ہونا ایک ثابت شدہ حقیقت ہے اور مرد و عورت دونوں کی تخلیق ایک ہی جنس اور مادہ سے ہوئی ہے۔ علاوہ ازیں اس معاملہ میں ہر طرح کے شکوک و شبہات کو دور کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے آگے ارشاد فرمایا ہے:"و بث منهما رجالا کثیراً و نساءاً" (ان دونوں کے ذریعہ اللہ نے بہت سے مردوں اور عورتوں کو پھیلا دیا)

اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ روئے زمین پر پھیلے ہوئے تمام انسان چاہے وہ مرد ہوں یا عورت وہ آدم وحواء ہی کی پیداوار ہیں اور ان دونوں کے فطری اجتماع سے وجود میں آئے ہیں۔ دونوں کی حیثیت انسانوں کے والدین کی ہے اور دونوں نے مل کر ایک انسانیت کے دونوں دھڑوں کی تشکیل کی ہے۔

ہم اختصار کے ساتھ یہ کہہ سکتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں دو حقیقتوں کو ثابت کیا ہے۔

ایک حقیقت یہ ہے کہ مردوں اور عورتوں کی تخلیق ایک ہی مادہ سے ہوئی ہے۔ دوسری حقیقت یہ کہ ایک مرد اور ایک عورت نے مل کر پوری انسانیت کی تشکیل کی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ”و اللہ جعل لکم من أنفسکم أزواجا و جعل لکم من أزواجکم بنین و حفدۃ“ (النحل / ۷۲) (ترجمہ: اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے تم میں سے ہی تمہاری بیویاں پیدا کیں اور تمہاری بیویوں سے تمہارے لیے تمہارے بیٹے اور پوتے پیدا کیے)

اس کی تشریح کرتے ہوئے سید قطب کہتے ہیں: ”اگر لوگ صرف اس ایک حقیقت کا ادراک کر لیں تو ان کی زندگی میں موجود ہر طرح کی تفریق کا خاتمہ ہو جائے جو ایک جان سے پیدا ہونے والوں کے درمیان پیدا ہو چکی ہے اور جس نے ایک رحم مادر سے پروان چڑھنے والے رشتوں کی دھجیاں بکھیر کر رکھ دی ہیں۔ انسانی ذہن و دماغ میں اگر اس حقیقت کو راسخ کر دیا جائے تو اس سے ہر طرح کی نسلی کشیدگی اور طبقاتی غلامی کا خاتمہ ہو جائے گا، جس کے کڑوے گھونٹ کو انسانیت صدیوں سے پیتی چلی آ رہی ہے اور اس کا سلسلہ آج بھی جاری ہے۔ اس ایک حقیقت کا ادراک کرنے کی وجہ سے ان بے شمار غلطیوں کا احساس ہو جائے گا جو اس سے اب تک صادر ہوتی رہی ہیں، جن کی وجہ سے اس نے عورتوں کے متعلق گھٹیا تصورات وخیالات کو جنم دیا، اسے گندگی اور نجاست کا منبع سمجھا اور اسے تمام شر وبلاء کی جڑ قرار دیا، حالانکہ اللہ تعالیٰ نے اسے فطری وطبعی طور پر پہلی جان ہی سے پیدا کیا تھا۔ اللہ نے اس کی تخلیق اس لیے کی تھی تاکہ وہ اولین انسان آدم علیہ السلام کی بیوی بنے اور تاکہ ان دونوں سے بہت سارے مردوں اور عورتوں کو روئے زمین پر پھیلا دیا جائے۔ انسانیت گمراہی کی اس وادی میں طویل عرصہ سے بھٹک رہی ہے، اس کی وجہ سے اس نے عورت کو تمام انسانی خصوصیات اور ہر طرح کے بشری و شہری حقوق سے محروم رکھا تھا۔ وہ یہ بھول گئی کہ عورت بھی ایک انسان ہے جو ایک انسان کے لیے پیدا کی گئی تھی، وہ بھی ایک جان ہے جو ایک جان کے لیے پیدا کی گئی تھی، وہ انسانیت کا نصف حصہ ہے جس سے انسانیت کے دوسرے نصف حصہ کی تکمیل ہوتی ہے۔ دونوں ایک دوسرے کے ہم مثل دو فرد نہیں ہیں بلکہ دونوں ایک دوسرے کو مکمل کرنے والا جوڑا ہے۔ اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ انسانی زندگی کی بنیاد خاندان ہے۔ اللہ کی یہ مشیت ہوئی کہ انسانی زندگی کا آغاز ایک خاندان سے ہو، اس لیے کہ اس نے ابتداء میں ایک جان کو

پیدا کیا اور اس سے اس کے ساتھی جوڑے کی تخلیق کی، اس طرح شوہر و بیوی سے ایک خاندان وجود میں آیا پھر اس شوہر و بیوی سے بہت سے مردوں اور عورتوں کو پھیلا دیا گیا۔ اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو پہلے ہی مرحلہ میں وہ بہت سے مردوں اور عورتوں کو پیدا کر دیتا اور ان کے آپس میں جوڑے بنا دیتا۔ پھر یہ پہلے ہی دن سے مختلف خاندان ہوتے"۔ ۱۴

قرآن مجید کی دوسری آیات بھی اسی مفہوم کی تائید کرتی ہیں، مثلاً اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "هو الذی خلقكم من نفس واحدة و جعل منها زوجها يسكن اليها" (الأعراف / ۱۸۹) (ترجمہ: وہ اللہ تعالیٰ ایسا ہے جس نے تم کو ایک تن واحد سے پیدا کیا اور اسی سے اس کا جوڑا بنایا تا کہ وہ اپنے اس جوڑے سے انس حاصل کرے)

دوسری آیات سے بھی بنی نوع انسان کے درمیان اخوت اور مشترکہ والدیت کا ثبوت ملتا ہے۔ اسی لیے یہ کہنا صحیح ہے کہ عورت مرد کی بہن ہے، اس لیے کہ دونوں ایک باپ اور ایک ماں سے وجود میں آئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "يا أيها الناس إنا خلقناكم من ذكر و أنثى و جعلناكم شعوبا و قبائل لتعارفوا إن أكرمكم عند الله أتقاكم إن الله عليم خبير" (الحجرات / ۱۳) (ترجمہ: اے لوگو! ہم نے تم سب کو ایک ہی مرد و عورت سے پیدا کیا ہے اور اس لیے کہ تم آپس میں ایک دوسرے کو پہچانو کنبے اور قبیلے بنا دیئے ہیں، اللہ کے نزدیک تم میں سب سے باعزت وہ ہے جو سب سے زیادہ ڈرنے والا ہے، یقین مانو کہ اللہ دانا اور باخبر ہے)

اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں "الناس" کہہ کر تمام انسانوں کو خطاب کیا ہے کہ اس نے سب کو ایک باپ اور ایک ماں سے پیدا کیا ہے۔ اس طرح اللہ تعالیٰ نے مرد و عورت کے درمیان اخوت نسبی کو ثابت کیا ہے۔ چونکہ ہر مرد و عورت ایک ہی ماں باپ کی اولاد ہے لہٰذا تمام مرد و عورت آپس میں بھائی بہن بھی ہیں۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حقیقت کو اپنے اس ارشاد کے ذریعہ ثابت کیا ہے کہ "عورتیں مردوں کی بہنیں ہیں"۔ ۱۵

اوپر کی آیت میں جو پیغام ہے وہ تمام بنی نوع انسان کے لیے عام ہے۔ اس میں رنگ و نسل اور زبان و جنس کے امتیاز کے بغیر ہر شخص سے خطاب ہے۔ گویا اللہ تعالیٰ لوگوں سے یہ کہہ رہا ہے کہ "مختلف رنگ و نسل اور گروہوں، جماعتوں اور قبائل سے تعلق رکھنے والے لوگو! تم سب کی اصل ایک ہے، تمہاری اصل ایک مرد و عورت یعنی آدم و حواء سے ہے۔ ہم نے ان ہی دونوں کے ذریعہ سے مختلف قوموں اور قبائل اور مختلف رنگ و نسل اور زبانوں کے انسانوں کو پیدا کیا ہے"۔

چونکہ ہم سب انسان ایک دوسرے کے بھائی بہن ہیں جو ایک ہی ماں اور باپ سے وجود میں آئے ہیں، لہذا کسی کو بھی ایک دوسرے کے سامنے رنگ و نسل اور زبان و وطن کی بنیاد پر تفوق و برتری کا دعویٰ کرنے کا حق نہیں ہے۔ یہ چیزیں انسان کی قدر و قیمت طے کرنے کا پیمانہ نہیں ہونی چاہئیں۔ صرف تقوی و پرہیز گاری ہی انسان کی قیمت و حیثیت طے کرنے کا پیمانہ ہے۔ صاف لفظوں میں یہ بات کہہ دی گئی ہے کہ تم میں سب سے زیادہ معزز وہ ہے جو سب سے زیادہ اللہ سے ڈرنے والا ہے۔

اس اعتبار سے ایک آدمی دوسرے آدمی سے رنگ و نسل کی بنیاد پر برتر نہیں ہو سکتا اور نہ کوئی مرد کسی عورت پر اس وجہ سے برتری جتا سکتا ہے کہ وہ مرد ہے۔ مرد ہونا عورت پر وجہ فضیلت نہیں بن سکتا ہے۔ اس کی تائید اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد سے بھی ہوتی ہے کہ "تم سب آدم کی اولاد ہو اور آدم کی تخلیق مٹی سے ہوئی تھی"۔ [١٦]

اللہ تعالیٰ نے اس حقیقت کو واضح کر دیا ہے کہ انسانوں کی تخلیق ایک مرد و عورت کے ملاپ کا نتیجہ ہے۔ ایک مرد و عورت کے اس ملاپ سے ہی نسل انسانی کا وجود ہے، ایک مرد و عورت سے ہی انسانوں کے انساب کو محفوظ کیا گیا ہے اور ایک مرد و عورت ہی سے انسانوں کی آبادی میں خاندان کا سلسلہ شروع ہوا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "و هو الذی خلق من الماء بشرا فجعله نسبا و صهرا و كان ربك قديرا" (الفرقان/٥٤) (ترجمہ: وہ ہے جس نے پانی سے انسان کو پیدا کیا، پھر اسے نسب والا اور سسرالی رشتوں والا کر دیا، بلاشبہ آپ کا پروردگار ہر چیز پر قادر ہے) اللہ تعالیٰ نے یہ باتیں دوسری آیات میں بھی ارشاد فرمائی ہیں، مثلاً ایک جگہ اس کا ارشاد ہے: "و أنه خلق الزوجين الذكر و الأنثى" (النجم/٤٥) (ترجمہ: اور یہ کہ اسی نے جوڑا یعنی نر و مادہ پیدا کیا) اللہ تعالیٰ نے آیتوں میں بار بار "الذكر" اور "الأنثى" کے الفاظ استعمال کیے ہیں۔ اس سے یہ بتانا مقصود ہے کہ دونوں کی اہمیت یکساں ہے اور ان میں سے کوئی ایک دوسرے سے کمتر نہیں ہے۔ یہ انداز بیاں رب تعالیٰ کی عظمت پر دلالت کر رہا ہے اور انسانوں کو غور و فکر اور تدبر کرنے کی دعوت دے رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "و ما خلق الذكر و الأنثى إن سعيكم لشتّٰى" (الليل/٣-٤) (ترجمہ: اور قسم ہے اس ذات کی جس نے نر و مادہ کو پیدا کیا، یقینا تمہاری کوششیں مختلف قسم کی ہیں) بیشک مرد و عورت ایک دوسرے کے شریک کار ہیں اور ایک ساتھ مل کر بنی نوع انسان کو وجود میں لانے کا ذریعہ ہیں۔

اوپر ذکر کی ہوئی تمام باتوں کا خلاصہ یہ ہے کہ قرآن مجید نے عورت کی انسانیت کو ثابت کر دیا ہے اور اس حقیقت کو کھلے الفاظ میں بیان کر دیا ہے کہ انسان ہونے میں عورت اور مرد کے درمیان کوئی فرق نہیں ہے۔

اس کے بعد مرد وعورت دونوں مل کر ایک ایسے انسانی معاشرہ کی تعمیر کے لیے ذمہ دار ہیں جو اندر سے مضبوط اور متحد ہو اور انسانی اقدار اور اخلاق فاضلہ سے آراستہ ہو، جو ایک خوشحال انسانی معاشرہ کا نمونہ پیش کرے، جس میں مرد وعورت دونوں کو یکساں حقوق حاصل ہوں۔

اسلام نے عورت کو اس لعنت سے آزاد کیا جو غلط طریقے سے اس پر تھوپ دی گئی تھی اور اس کی وجہ سے اسے بڑی اور اصلی غلطی کے لیے سزاوار قرار دے دیا گیا تھا۔ کیا یہودیوں کی مذہبی کتاب صحیفہ تکوین کے الأصحاح الثالث میں یہ مذکور نہیں ہے کہ دراصل حواء ہی نے آدم کو ممنوعہ درخت کا پھل کھانے کے لیے ورغلایا تھا؟ قرآن مجید نے حواء پر لگائی جانے والی اس جھوٹی تہمت کا انکار کیا ہے اور اس بات کی وضاحت کی ہے کہ جنت سے نکالے جانے کے لیے آدم و حواء دونوں ہی ذمہ دار تھے، اس لیے کہ ممنوعہ پھل کو کھانے کی ممانعت دونوں کو کی گئی تھی۔ اس سلسلہ میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ”و قلنا یا آدم اسکن أنت و زوجک الجنۃ و کلا منھا رغدا حیث شئتما و لا تقربا ھٰذہ الشجرۃ فتکونا من الظالمین فأزلھما الشیطان عنھا فأخرجھما مما کان فیہ“ (البقرۃ/۳۵) (ترجمہ: اور ہم نے کہہ دیا کہ اے آدم! تم اور تمہاری بیوی جنت میں رہو اور جہاں کہیں سے چاہو بافراغت کھاؤ پیو، لیکن اس درخت کے قریب بھی نہ جانا ورنہ ظالم ہو جاؤ گے)

ان دونوں ہی نے اللہ کے حکم کی نافرمانی کی اور دونوں ایک ساتھ شیطان کے بہکاوے میں آگئے۔ شیطان نے ان کو بہکانے کے لیے دونوں کے دلوں میں وسوسہ پیدا کیا تھا جبکہ قرآن سے پہلے کی آسمانی کتابوں میں صاف طور پر یہ مذکور ہے کہ شیطان نے حواء کے دل میں وسوسہ پیدا کیا اور پھر حواء نے ممنوعہ درخت کا پھل کھانے کے لیے آدم کو بہکایا تھا۔ قرآن کی آیت اس کا انکار کرتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ”فوسوس لھما الشیطان لیبدئ لھما ما ووری عنھما من سؤاتھما و قال ما نھاکما ربکما عن ھذہ الشجرۃ إلا ان تکونا ملکین أو تکونا من الخالدین“ (الأعراف/۲۰) (ترجمہ: پھر شیطان نے ان دونوں کے دلوں میں وسوسہ ڈالا تاکہ ان کی شرمگاہیں جو ایک دوسرے سے پوشیدہ تھیں دونوں کے اوپر بے پردہ کر دے اور کہنے لگا کہ تمہارے رب نے تم دونوں کو اس درخت سے اور کسی سبب سے منع نہیں فرمایا مگر محض اس وجہ سے کہ تم دونوں کہیں فرشتے ہو جاؤ یا کہیں ہمیشہ زندہ رہنے والوں میں سے ہو جاؤ)

قرآن کی بعض آیتوں میں یہ صراحت آئی ہے کہ شیطان نے صرف آدم علیہ السلام کے دل میں وسوسہ ڈالا تھا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ”فوسوس إلیہ الشیطان قال یا آدم ھل أدلک علی شجرۃ الخلد و ملک لا یبلی فأکلا منھا فبدت لھما سوءاتھما و طفقا یخصفان علیھما من ورق الجنۃ“ (طہ/۱۲۰-۱۲۱) (ترجمہ: لیکن شیطان نے اسے وسوسہ ڈالا، کہنے لگا کہ کیا میں تجھے دائمی زندگی کا درخت اور بادشاہت بتلاؤں کہ جو کبھی پرانی نہ ہو، چنانچہ ان دونوں نے

اس درخت سے کچھ کھالیا پس ان کے ستر کھل گئے اور بہشت کے پتے اپنے اوپر ٹانکنے لگے) اللہ تعالیٰ نے اس آیت کے اختتام پر یہ بات کہی ہے کہ "و عصی آدم ربہ فغوی" (طہ /۱۲۱) (ترجمہ: آدم نے اپنے رب کی نافرمانی کی پس بہک گیا)

اسلام نے اولین خاتون حواء پر لگائی جانے والی اس تہمت کی نفی کی ہے کہ جنت سے آدم کے اخراج کے لیے وہ ذمہ دار تھی۔ اوپر نقل کردہ آیت صاف طور پر بتارہی ہے کہ ممنوعہ درخت کے پھل کو کھانے کی ممانعت دونوں کے لیے تھی اور اس معاملہ میں دونوں نے رب کے حکم کی خلاف ورزی کی تھی۔

عورت کے انسان ہونے کی حقیقت کے ثابت و مسلم ہو جانے کے بعد میں اس بات کو زیر بحث لانا چاہتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے مرد و عورت کی جسمانی ساخت، بناوٹ اور مزاج و فطرت میں کچھ بنیادی فرق بھی رکھے ہیں۔ لیکن اس سے دونوں کے درمیان مساوات، دونوں کے معزز و مکرم ہونے کے تصور اور مخصوص حقوق کے لیے دونوں کی اہلیت پر کوئی حرف نہیں آتا ہے اور نہ اس کی وجہ سے ایک جنس کو دوسرے پر برتری حاصل ہوتی ہے۔ دونوں کی فطری صلاحیتیں اور خوبیاں مختلف ہیں، دونوں کا مزاج اور جسمانی ساخت بھی ایک دوسرے سے مختلف ہے۔ ان کی تخلیق میں مزاج و اجسام کا یہ فرق انہیں ان کی ایک دوسرے سے مختلف لیکن یکساں طور پر اہم ذمہ داریوں کو احسن طریقہ سے ادا کرنے کی اہلیت عطا کرتا ہے جن کے لیے ان دونوں کی تخلیق ہوئی ہے۔

عورتوں کو خاص قسم کی جسمانی اور عقلی خصوصیات عطا کی گئی ہیں جو معاشرہ میں اس کے کردار کو بہتر طریقہ سے ادا کرنے اور روئے زمین پر اس کے مشن کی تکمیل کے لیے معاون ہیں لیکن جیسا کہ بہت سے لوگ سوچتے ہیں، اس کی وجہ سے مرد کے ساتھ اس کے مساوات اور انسان ہونے کے ناطے اس کی تکریم و عزت افزائی پر کوئی فرق نہیں پڑتا ہے۔ اسلام اصول وضابطے کے ایک مجموعہ کا نام ہے جس کے ذریعہ ایک مکمل نظام حیات کی تشکیل ہوتی ہے۔ ایک بہترین انسانی معاشرہ کی تشکیل کے لیے اسلام کے عطا کردہ مکمل نظام حیات پر عمل کرنا ضروری ہے۔ اس نظام حیات میں نہ تو صرف مردوں کے مفاد کا خیال رکھا گیا ہے اور نہ صرف عورتوں کے مفادات کا تحفظ کیا گیا ہے بلکہ اس میں پوری انسانیت کے مفاد کا خیال رکھا گیا ہے اور اللہ کی ساری مخلوقات کی بھلائی کے لیے اس نظام کو برپا کیا گیا ہے۔

"اسلام میں زندگی کے کاموں اور ذمہ داریوں کی تقسیم میں ہماری انسانی فطرت کا خاص خیال رکھا گیا ہے۔ ہمارے انسانی معاشرہ کی بنیاد ایک مرد اور ایک عورت ہے۔ دونوں کی مختلف خصوصیات اور صلاحیتیں ہیں جو

انہیں سماج میں ان کے پہلے سے طے شدہ کردار کو ادا کرنے کا اہل بناتے ہیں۔ اس معاملہ میں کسی ایک صنف کو نظر انداز کر کے دوسری صنف کے مفاد کا خیال نہیں رکھا گیا ہے بلکہ اس میں انسانی زندگی کے مفاد کا خیال رکھا گیا ہے۔ اس کے ذریعہ مطلوب یہ ہے کہ اس انسانی زندگی کو قائم کیا جائے، اسے منظم کیا جائے اور ہماری ایک دوسرے سے مختلف لیکن یکساں طور پر اہم ذمہ داریوں کی ادائیگی کے ذریعہ ایک اللہ کی عبادت کی طرف اس کا رخ موڑا جائے جو کہ انسانی زندگی کے قیام کا بنیادی مقصد ہے۔

چونکہ مرد و عورت کو ایک دوسرے سے مختلف فطرت کے ساتھ پیدا کیا گیا ہے، اس کی وجہ سے ان دونوں کی ذمہ داریاں بھی ایک دوسرے سے مختلف ہیں اور معاشرہ میں ان کا رول بھی ایک دوسرے سے جداگانہ ہے۔ یہ سارا انتظام و انصرام اس عظیم الشان کاروبار حیات اور وسیع و عریض انسانی معاشرہ کی فلاح و بہبودی کے لیے ہے جسے ہم انسانی زندگی کا نام دیتے ہیں۔ ۱۷

مرد و عورت کی تخلیق اور خصوصیات میں فرق اس وجہ سے ہے کہ دونوں کو جن کاموں کا مکلف بنایا گیا ہے اور جو ذمہ داریاں سونپی گئی ہیں وہ ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ ان دونوں کے الگ کاموں کے اعتبار سے مختلف انداز میں ان کی تخلیق ہوئی ہے۔ عورتوں اور مردوں کے درمیان جسمانی اور نفسیاتی اعتبار سے واضح طور پر فرق موجود ہے جو ان کے ان کاموں اور ذمہ داریوں کے لحاظ سے بالکل موزوں ہیں جو ان کے سپرد کیے گئے ہیں۔ سائنسی اعتبار سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ عورت کی جسمانی ساخت مرد کی جسمانی ساخت سے مختلف ہے، یہاں تک کہ خلیوں اور اعضاء کی بناوٹ میں بھی یہ اختلاف موجود ہے۔ دونوں کی اینٹی باڈیز، کروموسومز اور جنسی اعضاء کے خلیے بھی ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ مردوں اور عورتوں کے اعضاء کی ظاہری اور اندرونی بناوٹ بھی ایک دوسرے سے الگ ہے۔ چنانچہ عورت کے ظاہری و پوشیدہ اعضاء، اس کے پٹھے، اس کی ہڈیاں بہت حد تک مرد کے ظاہری و پوشیدہ اعضاء کی بناوٹ سے مختلف ہیں۔ مرد کے پٹھے اور ہڈیاں سختی اور قوت برداشت کے اعتبار سے عورت کے پٹھے اور ہڈیوں سے مختلف ہیں۔ یہی حال دونوں کے دماغ کے حجم کا بھی ہے۔ مرد و عورت کے ڈھانچہ، ساخت اور اعضاء کا مختلف ہونا بے مقصد نہیں ہے۔ انسان کے جسم اور کائنات کے اندر خالق نے جو بھی چیز بنائی اس کے پیچھے ایک حکمت پنہاں ہے جس سے اکثر و بیشتر ہم ناواقف ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کو بالکل مناسب انداز میں پیدا کیا ہے۔ اسی لیے مرد و عورت کے جسمانی ساخت کا اختلاف نہ تو محض اتفاق ہے اور نہ ہی ایک معمولی واقعہ ہے۔

در حقیقت مرد کو اس انداز سے پیدا کیا گیا ہے کہ وہ گھر سے باہر جا کر زندگی گزارنے کے لیے جد وجہد کرے گا اور اپنے گھر والوں کے لیے ضروریات زندگی کو مہیا کرے گا۔ دوسری طرف عورت کو اس انداز سے پیدا کیا گیا ہے کہ وہ اپنی فطرت کے مطابق گھر کے اندر رہے گی اور اپنی اس اولین عظیم ذمہ داری کو ادا کرے گی جسے اللہ نے اس کے سپرد کیا ہے، یعنی حمل، ولادت، بچوں کی پرورش اور شوہر کے گھر کو راحت کدہ بنا کے رکھنا۔

عورت کے اندر تحمل اور قوت برداشت بھی مرد سے الگ ہے۔ والدین اپنے بچوں کے اندر شروع سے دونوں کے اس فرق کو محسوس کرتے ہیں۔ لڑکے اور لڑکیوں کے سوچنے، مشاہدہ کرنے اور برتاؤ کرنے کا انداز ایک دوسرے سے مختلف ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں عورتوں کو حیض، حمل، ولادت اور رضاعت جیسے کچھ فطری حالات کا بھی سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ۱۸

قرآنی نصوص اور احادیث نبویہ میں عورتوں کی بعض ایسی خصوصیات کا تذکرہ آیا ہے جو عورت کی پہچان اور اس کی خلقت وطبیعت کا جزء بن چکی ہیں، مثلاً شرم وحیا، سجنے سنورنے کی فطرت، لڑائی جھگڑے میں کمزور پڑنا، مکر اور غیرت، عورتوں کے اندر یہ صفات بطور خاص پائی جاتی ہیں، لیکن یہ اس کے انسان ہونے اور شرعی ذمہ داریوں کو ادا کرنے کے منافی نہیں ہے۔

اب ہم عورت کی ہر خصوصیت کا الگ الگ عنوان کے تحت جائزہ لے رہے ہیں تاکہ اس کی فطری خوبیوں اور خصوصیات کی ایک جھلک سامنے آسکے۔

(الف) حیاء

قرآن مجید میں شعیب علیہ السلام کی صاحبزادیوں کے حیاء کا تذکرہ ان الفاظ میں آیا ہے: "فجاءته إحداهما تمشي على استحياء و قالت إن أبي يدعوك ليجزيك أجر ما سقيت لنا" (القصص/۲۵) (ترجمہ: اتنے میں ان دونوں عورتوں میں سے ایک ان کی طرف شرم وحیاء سے چلتی ہوئی آئی، کہنے لگی کہ میرے والد آپ کو بلا رہے ہیں تاکہ آپ نے ہمارے جانوروں کو جو پانی پلایا ہے اس کی اجرت دیں)

شرمانے اور حیاء کرنے کی یہ خوبی عورتوں کے ساتھ خاص ہے۔ شریف اور پاک دامن عورتوں کے اندر یہ شرم وحیاء بدرجہ اتم ہوتی ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی کہا کرتے تھے کہ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پردہ میں بیٹھی ہوئی کنواری لڑکی سے بھی زیادہ حیادار تھے۔" ۱۹

ایک مرتبہ شادی سے پہلے دلہن کی مرضی معلوم کرنے کی بات آئی تو عائشہ رضی اللہ عنہا نے کہا: اے اللہ کے رسول! کنواری لڑکی زبان سے اپنی رضامندی کا اظہار کرنے میں شرماتی ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اس کی خاموشی ہی اس کی رضامندی ہے۔"[۲۰]

درحقیقت شرم وحیاء عورت کی پہچان اور اس کی تخلیقی جبلت میں سے ہے، اللہ تعالیٰ نے یہ خوبی اسے اس لیے عطا کی ہے تاکہ اس کی عصمت کی حفاظت ہوسکے۔ مرد کے اندر حیاء اگر خوبصورتی کی علامت ہے تو عورت کے اندر یہ اس کے حسن وجمال میں اور زیادہ اضافہ کرنے والی چیز ہے۔ اگر مرد کے اندر حیاء باعث فضیلت ہے تو یہ عورت کی خوبصورتی اور اس کے رونق وچمک میں مزید اضافہ کرنے والی ہے اور اس کی وجہ سے وہ مرد کے لیے ایک قیمتی مطلوبہ شے بن جاتی ہے۔ حیاء پاکدامن اور پاکیزہ کردار کا حامل ہونے کی علامت بھی ہے جبکہ بے شرمی سطحی اخلاق وکردار کا حامل ہونے کی علامت ہے۔ حیاء عزت وعصمت کی محافظ بھی ہے۔ یہ عورت کی پاکدامنی کی حفاظت کرتی ہے اور عورت کی عزت وعصمت کو پامال کرنے والے عمل سے اسے دور رکھتی ہے۔ اسی وجہ سے ہم یہ دیکھتے ہیں کہ جب ہم کسی برائی کے ارتکاب کا ارادہ کرتے ہیں یا کوئی برا لفظ اپنی زبان سے نکالنا چاہتے ہیں تو ہمارے کردار کی پاکیزگی ہمیں ایسا کرنے سے روکتی ہے۔ اس سلسلہ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: "حیاء کی وجہ سے صرف خیر کا ظہور ہوتا ہے۔"[۲۱]

عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "پہلی نبوت کے کلام میں سے لوگوں تک یہ بات پہنچی ہے کہ اگر تمہارے اندر شرم وحیاء نہ ہو تو جو چاہو کرو۔"[۲۲]

اس کا مطلب یہ ہوا کہ جرأت وبے باکی برائی اور نچلے درجہ کے کاموں کے لیے آمادہ کرتی ہے۔ یہ ایک تنبیہ بھی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "فمن شاء فليؤمن و من شاء فليكفر" (الکہف/۲۹) (ترجمہ: اب جو چاہے ایمان لائے اور جو چاہے کفر کرے)

پہلی حدیث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ حیاء سے صرف اچھی چیزوں کا ظہور ہوتا ہے اور اس کے نتیجہ میں اچھے اخلاق اور میٹھے الفاظ وجود میں آتے ہیں۔ دوسری حدیث ان لوگوں کے لیے تنبیہ ہے جو حیاء وپاکدامنی کا کوئی تصور ہی نہیں رکھتے ہیں اور جو غلط کام کرنے پر بھی شرمندگی محسوس نہیں کرتے ہیں۔

کچھ دوسری احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا کردہ شرم وحیاء عبادت کی بنیاد اور تمام اخلاق فاضلہ کی اصل ہے۔

مردوں اور عورتوں کی الگ الگ خصوصیات کا تجزیہ کرتے ہوئے ڈارون کہتا ہے: دور وحشیت میں سب سے طاقتور اور سب سے زیادہ زورآور انسان عورت کو اغوا کرکے کسی غار میں اسے قیدی بنا کر رکھتا تھا۔ غاروں میں رہنے والی عورت بہت خوبصورت اور بہت ڈرپوک ہوتی تھی جو مردوں کے لیے باعث کشش ہوتی تھی۔ اسی لیے مینڈیلین کے موروثی قانون کے مطابق اگر خاندانی طور پر منتقل ہونے والی خصوصیات کو آج بھی عورتوں اور مردوں کے درمیان تقسیم کیا جاسکتا ہے تو پھر اس کو سمجھنا آسان ہوگا کہ طاقت اور زورآوری مردوں کی خصوصیات کے طور پر باقی رہ گئی اور خوبصورتی و شرم وحیاء عورتوں کی خصوصیات کے طور پر باقی رہ گئی۔ ۲۳؎

پیرس کے کالج برائے زبان وادب کے سابق لکچرر ہنری ماریون کہتے ہیں کہ لاروشفو کو کا خیال ہے کہ عام طور پر شرم وحیاء عورت کی عزت و آبرو اور اس کی اچھی شہرت کا محافظ ہوتا ہے اور فنلون کا قول ہے کہ بدنامی کا خوف عورتوں کے اخلاق و کردار کا بہترین محافظ ہے۔ ۲۴؎

اسی وجہ سے یہ بات ہمارے لیے باعث تعجب نہیں ہے کہ اسلام نے عورتوں کے شرم وحیاء اور بدنامی کے خوف کی خصوصیات کی حفاظت کی ہے اور اسے باقی رکھنے کے لیے اس کی ہمت افزائی کی ہے تاکہ برائی کے خلاف عورتوں کی دفاعی قوت مضبوط ہو اور اس کے کردار کے بارے میں شیطانی چہ میگوئیوں کا خاتمہ ہو جائے۔ شرم وحیاء عورت کی عزت و آبرو اور اس کی شرافت و پاکدامنی کی حفاظت کرتی ہے اور جن عورتوں کے اندر بدنامی کا ڈر خوف نہیں ہوتا اور جن کے پاس پاکدامنی کا کوئی تصور نہیں ہوتا وہ گمراہی اور فتنہ کا سبب سے زیادہ شکار بنتی ہیں، وہ باآسانی گناہ کا ارتکاب کر بیٹھتی ہیں۔ ان ساری باتوں کا خلاصہ یہ ہے کہ شرم وحیاء عورت کی ایک لازمی صفت ہے اور اس کی فطری نسوانی خصوصیات میں سے سب سے خاص چیز ہے۔ عورتوں کے اندر شرم وحیاء کی صفت ودیعت کرنے کے پیچھے اللہ تعالیٰ کی عظیم حکمت کارفرما ہے جس کے کچھ حصوں پر ہم نے اوپر کی سطور میں روشنی ڈالی ہے۔

(ب) عورتوں کا سجنا سنورنا اور لڑائی جھگڑے میں کمزور ہونا

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "أو من ينشؤا فى الحلية و هو فى الخصام غير مبين" (الزخرف/۱۸) (ترجمہ: کیا اللہ کی اولاد لڑکیاں ہیں جو زیورات میں پلیں اور جھگڑے میں اپنی بات واضح نہ کر سکیں) قرطبی نے اس آیت کی تشریح کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "عورتیں جو اپنے کو بناؤ سنگار کے ساتھ رکھتی ہیں" کا مطلب یہ ہے کہ ان کی پیدائش، ان کی پرورش ونشو ونما اور ان کی زندگی کا بیشتر حصہ اس حال میں گزرتا ہے کہ وہ ریشم کے کپڑے پہنتی ہیں اور اپنے آپ کو زیورات سے آراستہ رکھتی ہیں۔ "اختلاف و جھگڑے کے وقت وضاحت کے ساتھ اپنا

موقف نہیں رکھ پاتی ہیں" کا مطلب یہ ہے کہ جب بحث و مباحثہ میں ثبوت پیش کرنے کا موقع آتا ہے تو اپنے حریف کے سامنے اپنی بات کو جامعیت اور قطعیت کے ساتھ نہیں پیش کر پاتی ہیں۔ قتادہ کا قول ہے: "عورت جب بات کرنے لگتی ہے اور اس کے پاس کوئی حجت و دلیل موجود ہوتی ہے تو وہ اسے اپنے خلاف ہی قائم کر لیتی ہے۔"۲۵؎

مفسرین نے اس آیت کی تفسیر میں بہت سی باتیں کہی ہیں۔ ان میں سے ایک مفسر ابن کثیر ہیں جو اس آیت کی تفسیر کرتے ہوئے لکھتے ہیں: عورت ناقص ہے، وہ اپنے نقص کی تلافی کے لیے بچپن ہی سے زیورات پہنتی ہے۔ جب وہ زبانی طور پر جھگڑتی ہے تو وہ اپنی بات نہیں کہہ پاتی ہے بلکہ وہ بے بس اور گونگی بن کر رہ جاتی ہے۔ وہ اپنے جسمانی نقص کی تلافی کے لیے زیورات پہنتی ہے اور سج سنور کر رہتی ہے۔ چنانچہ عورت ظاہری و باطنی ہر دو اعتبار سے ناقص ہے، جسمانی نقص کی تلافی کے لیے وہ زیورات پہنتی ہے اور زیب و زینت اختیار کرتی ہے۔ باطنی طور پر اس کا نقص یہ ہے کہ وہ بحث و مباحثہ میں کسی پر غالب آنے سے عاجز رہ جاتی ہے اور اگر جیت بھی جاتی ہے تو اس کے پاس اپنے موقف پر برقرار رہنے کی ہمت نہیں ہوتی۔۲۶؎

ہمارے عظیم امام نے آیت کریمہ کو اس طور پر سمجھا ہے کہ عورت کے اندر نقص ہوتا ہے جبکہ اللہ تعالیٰ نے عورتوں کی ان صفات کا تذکرہ صرف یہ بتانے کے لیے کیا ہے کہ عورتوں کے اندر فطری اور پیدائشی طور پر یہ صفات پائی جاتی ہیں۔ یہ اس کی کمزوری اور نقص کا پہلو نہیں ہے جیسا کہ امام ابن کثیر کا خیال ہے۔ اگر آیت کے ظاہر سے عورتوں کے ناقص ہونے کا پہلو نکلتا بھی ہے تو یہ تعبیر مشرکین کی زبان سے ہے۔

آیت کے ظاہر سے جو التباس اور غلط فہمی پیدا ہو رہی ہے اس کا ازالہ کرتے ہوئے محمد عزہ دروزہ اس کی تفسیر میں لکھتے ہیں: "آیت کے خلاصہ سے ایسا لگتا ہے کہ اس میں لڑکیوں اور عورتوں کی قدر و منزلت میں کمی کی گئی ہے اور مردوں اور لڑکوں کی بہ نسبت ان کی شان کو گھٹایا گیا ہے۔ لیکن ہمارا ذہن اس سمت جاتا ہے کہ یہاں پر اور دوسری جگہوں پر جو اس طرح کی آیات آئی ہیں وہ ایک خاص سیاق و سباق کے تحت آئی ہیں۔ اس طرح کی تمام آیات کا پس منظر یہ ہے کہ وہاں جاہلی عربوں اور مشرکین کی ذہنیت اور ان کی سوچ کے بارے میں بات ہو رہی ہے، لہٰذا آیت میں ان ہی قدیم عربوں کی ذہنیت کی تعبیر کرتے ہوئے وہ بات کہی گئی ہے۔ یہ دراصل قدیم عربوں کے ذہنوں میں رچی بسی ہوئی بات کی ترجمانی ہے جن کے شرک اور ان کے خیالات کی آیات میں مذمت بیان کی گئی ہے تاکہ یہ حجت زیادہ قوی اور مسکت ہو۔ اس لیے اسے قرآن کی اپنی تعبیر اور اس کی اپنی رائے نہیں سمجھنا چاہیے۔"۲۷؎

اس آیت کا یہ مفہوم اس وقت اور بھی زیادہ واضح ہو جاتا ہے جب ہم اس کے پہلے کی آیت کے ساتھ اسے ملا کر پڑھتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:" و جعلوا له من عباده جزءًا إن الإنسان لكفور مبين أم اتخذ مما يخلق بنات و أصفاكم بالبنين و إذا بشر أحدهم بما ضرب للرحمٰن مثلا ظل وجهه مسودا و هو كظيم أو من ينشؤا في الحلية و هو في الخصام غير مبين" (الزخرف/ ۱۵-۱۸) (ترجمہ: اور انہوں نے اللہ کے بعض بندوں کو اس کا جزء ٹھہرا دیا یقینا انسان کھلم کھلا ناشکرا ہے، کیا اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوق میں سے بیٹیاں تو خود رکھ لیں اور تمہیں بیٹوں سے نوازا، حالانکہ ان میں سے کسی کو جب اس چیز کی خبر دی جائے جس کی مثال اس نے اللہ رحمٰن کے لیے بیان کی ہے تو اس کا چہرہ سیاہ پڑ جاتا ہے اور وہ غمگین ہو جاتا ہے، کیا اللہ کی اولاد لڑکیاں ہیں جو زیورات میں پلیں اور جھگڑے میں اپنی بات واضح نہ کر سکیں؟)

اللہ تعالیٰ کا قول "أم اتخذ" استفہام انکاری ہے، اس کے ذریعہ مشرکین کی گمراہی اور ان کی فساد گوئی کی قلعی کھولی گئی ہے۔ انہیں ان کی گمراہی اس مقام پر لے گئی کہ ان لوگوں نے اللہ تعالیٰ کی طرف اولاد کی نسبت کر دی پھر وہ گمراہی اور کج فہمی کے اس مقام پر پہنچے کہ انہوں نے اللہ کے مقام و مرتبہ کو گھٹا کر اپنے برابر کر لیا۔ اللہ تعالیٰ کے حصہ میں لڑکیاں ڈال دیں اور اپنے حصہ میں لڑکوں کو رکھ لیا اور یہ کہنے لگے کہ فرشتے اللہ کی بیٹیاں ہیں۔ انہوں نے یہ نہیں سوچا کہ فرشتے مذکر بھی ہو سکتے ہیں۔ یہ ان کی بہت سطحی اور گھٹیا بات تھی جو وہ اپنی زبان سے نکالا کرتے تھے۔ ایسا کیسے ہو سکتا ہے کہ مذکر و مؤنث کی تخلیق تو اللہ تعالیٰ کے ذریعہ ہو پھر انہیں اپنی خواہش کے مطابق ان میں سے ایک کو اپنے لیے پسند کرنے کا حق حاصل ہو جائے اور ان میں سے جو انہیں ناپسند ہو اسے اللہ کے لیے چھوڑ دیں۔ اس آیت میں مشرکین اور ان کی ظالمانہ تقسیم کو احمقانہ قرار دیا گیا ہے۔ وہ مشرکین اس بات سے خوش نہیں ہوتے تھے کہ ان کے گھر لڑکی کی ولادت ہو، جب ان کو لڑکی کی پیدائش کی خبر دی جاتی تھی تو وہ غم و افسردگی میں ڈوب جاتے تھے۔ پھر وہ اللہ کی طرف اس چیز کو کیسے منسوب کرتے تھے جو ان کے لیے غم و افسردگی کا باعث تھا۔ جو اللہ تعالیٰ کے وجود کو مانتا ہو کیا اللہ کے ساتھ اس کا یہی ادب کا معاملہ تھا؟ اگر وہ اللہ کی ذات کے منکر ہوتے اور اس کے وجود کو نہیں مانتے پھر ایسی بات کہتے تو یہ سمجھ میں آتا ہے۔ وہ اللہ کے وجود کو تسلیم کرنے کے بعد اسے اس مقام تک نیچے لاتے تھے جو اپنے لیے وہ پسند نہیں کرتے تھے۔ یہی ان کی کھلی ہوئی گمراہی تھی۔

"و إذا بشر أحدهم بالأنثى" سے اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ بیٹی یا لڑکی اللہ کی نعمتوں میں سے ایک نعمت ہے اور انسان کے لیے اس کا ورود سعادت سے ہمکنار کرنے والی خوشخبری کی قبیل سے ہے، اس کی وجہ سے انسان کو شرح صدر اور قلبی مسرت کا احساس ہونا چاہیے لیکن اسلام سے پہلے کے جاہلی عرب اپنی جہالت اور

گمراہی کی وجہ سے اس نعمت کو پاکر بھی دلوں میں تنگی محسوس کرتے تھے اور بیٹیوں سے ملاقات کو اپنی شقاوت و بدبختی تصور کرتے تھے۔ "بما ضرب للرحمٰن مثلاً" سے مشرکین کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کی طرف اولاد کی نسبت کرنے کی طرف اشارہ ہے، کیونکہ ان لوگوں نے فرشتوں کو اللہ کی بیٹیاں قرار دیا تھا۔ آیت کے اندر استفہامی انداز میں مشرکین پر نکیر کی گئی ہے کہ ان لوگوں نے اللہ تعالیٰ کے لیے ضعیف پہلو تجویز کیا، یعنی لڑکیاں اور اپنے حصہ میں قوی پہلو رکھا یعنی اولاد نرینہ، کیونکہ علم حیات میں یہ بات معروف ہے کہ مذکر مؤنث سے زیادہ طاقتور ہوتا ہے اور لڑائی جھگڑے میں بھی مذکر ہی طاقت کا مظاہرہ کرتا ہے اور غالب رہتا ہے۔ آیت میں لفظ "غیرمبین" استعمال ہوا ہے۔ اس میں "الإبانۃ" سے طاقت و قوت کا مظاہرہ مراد ہے جبکہ اس کی ضرورت پیش آ جائے اور اس صلاحیت کی آزمائش کا موقع در پیش ہو۔ ٢٨ے

اس تفسیر سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ عورتوں کی یہ دونوں صفات جن کا تذکرہ اوپر کی آیت میں آیا ہے یہ عورتوں کی شان کو گھٹانے کے لیے نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کے بارے میں ایسا سوچا بھی نہیں جا سکتا ہے کہ وہ عورتوں کی شان کو گھٹائے گا جبکہ اس نے بہت سی آیات میں عورتوں کے مکرم و معزز ہونے کا اعلان کیا ہے۔ اس طرح کی تمام آیات بحث کے شروع میں نقل کی جاچکی ہیں۔ بلکہ ان دونوں صفات کے تذکرہ سے یہ بتانا مقصود ہے کہ یہ دونوں صفات ہر عورت کے ساتھ لازم و ملزوم ہے۔ زیب و زینت اختیار کرنا عورتوں کو فطری طور پر پسند ہوتا ہے۔ عورتیں ہر ماحول میں اور ہر زمانے میں زیورات پہنتی رہی ہیں تاکہ اس کے ذریعہ اپنی خوبصورتی میں اضافہ کر سکیں۔ وہ یہ زیورات اظہار زینت کے ساتھ اظہار تفاخر کے لیے بھی پہنتی ہیں۔ خاص طور پر اس صورت میں جبکہ اللہ تعالیٰ نے عورتوں کے لیے سونا، ریشم اور ہیرا کا استعمال حلال کیا ہے۔ حدیث شریف میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: "اللہ تعالیٰ نے میری امت کی عورتوں کے لیے سونا اور ریشم حلال کیا ہے اور ہماری امت کے مردوں کے لیے اسے حرام قرار دیا ہے"۔ ٢٩ے

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "و هو الذی سخر البحر لتأكلوا منه لحماً طریا و تستخرجوا منه حلیۃً تلبسونها" (النحل / ١٤) (ترجمہ: اور دریا بھی اسی نے تمہارے بس میں کر دیئے ہیں کہ تم اس میں سے نکلا ہوا تازہ گوشت کھاؤ اور اس میں سے اپنے پہننے کے زیورات نکال سکو) رازی نے اس کی تفسیر میں کہا ہے کہ "زیور سے مراد لؤلؤ و مرجان (دو قیمتی پتھر) ہیں جو سمندر سے نکالے جاتے ہیں، آیت میں مردوں سے خطاب ہے کہ تم اسے پہنتے ہو، اس سے مراد ان کی عورتوں کا پہننا ہے نہ کہ مردوں کا، اس لیے عورتیں مردوں ہی کا حصہ ہیں اور وہ اپنے مردوں کو خوش کرنے کے لیے ہی زیورات پہنتی ہیں۔ اس طرح مرد و عورت دونوں ان زیورات سے محظوظ ہوتے ہیں اور فائدہ اٹھاتے ہیں"۔ ٣٠ے

زیب و زینت اختیار کرنا اور زیورات پہننا عورتوں کی ایک مطلوبہ صفت ہے۔ مرد عورتوں کے اندر اس صفت کی چاہت رکھتا ہے اور اس کے ذریعہ وہ مرد کی نگاہ میں محبوب اور پسندیدہ بن جاتی ہے۔ یہ کوئی انوکھی بات نہیں بلکہ دنیا میں رائج طریقہ ہے۔

جھگڑے اور اختلاف کے وقت عورت کا کمزور ہونا

جھگڑے اور اختلاف کے وقت عورت کی کمزوری کا جہاں تک سوال ہے تو ایسا اس وجہ سے ہے کہ اللہ تعالیٰ نے عورتوں کو خاص جسمانی و نفسیاتی خصوصیات کے ساتھ پیدا کیا جو اس کے سپرد کی گئی ذمہ داری کے حسب حال ہے۔ اسی لیے ہم پاتے ہیں عورتوں کی صفت اس کی اس ڈیوٹی کے لیے ضروری ہے جس کے لیے اس کی تخلیق ہوئی ہے۔ عورتوں کو نرم دل، جذباتی، حساس طبیعت اور بہت جلد متاثر ہونے والی بنایا گیا ہے، اسی وجہ سے وہ جھگڑے اور اختلاف کے وقت کمزور پڑ جاتی ہے، اس وقت اس کے اعصاب اضطرابی کیفیت میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور ان کے دلوں کی دھڑکنیں بڑھ جاتی ہیں، اس کی وجہ سے وہ اپنی حجت و دلیل کو بھی کھو بیٹھتی ہیں اور مدمقابل کے سامنے کمزور پڑ جاتی ہیں۔ عورتوں کی یہ صفات ماں بننے کی اس کی اصلی ذمہ داری کے لیے ضروری بھی ہے۔ یہ عورت کی شخصیت کا عیب نہیں ہے جیسا کہ بعض لوگ سمجھتے ہیں۔ یہاں تک کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی عورتوں کی رقت، اسکی نازک اندامی اور اس کے احساسات کی شفافیت کو کنایتاً بیان کرنے کے لیے انہیں "قواریر" (نازک آبگینے) کہا ہے۔ یہ عورت کی وہ خصوصیت ہے جسے مرد سراہتا ہے، اس لیے کہ مرد خود کو برتر اور طاقتور سمجھتا ہے۔ مرد اس وقت فخر محسوس کرتا ہے اور اندر سے اسے اطمینان کا احساس ہوتا ہے جب وہ اپنی بیوی کے کمزور ہونے کا تجربہ کرتا ہے اور اسے محسوس ہوتا ہے کہ بیوی کو اس کی ضرورت ہے۔ مرد اس وقت خوش ہوتا ہے جب بیوی اس سے مدد کی طالب ہوتی ہے اور جب وہ شوہر کے پاس مدد اور تحفظ کے لیے آتی ہے۔ یہ مرد کی فطرت ہے کہ وہ اپنے آپ کو طاقتور اور فیملی کا محافظ و سرپرست سمجھے۔ اسے مرد کی مردانگی کا نام دیا جاتا ہے۔ مختصر یہ کہ قرآن نے عورتوں کی ان صفات کا تذکرہ ان کی تنقیص کے لیے نہیں کیا ہے۔ بھلا ایسا کیسے ممکن ہے جبکہ قرآن ہی نے عورت کی انسانیت اور مذہبی اہلیت کو ثابت کیا ہے اور اس معاملہ میں اسے مرد کے برابر قرار دیا ہے۔

(ج) غیرت

کسی کی خاص چیز میں دوسروں کی مشارکت کے سبب دل میں جو ناگواری ہوتی ہے اور اس کی وجہ سے غصہ بھڑک اٹھتا ہے، اسی کا نام غیرت ہے۔ یہ غیرت شوہر و بیوی کے درمیان سب سے زیادہ ہوتی ہے۔ یہ تو انسانی

غیرت کا معاملہ ہے۔ اللہ تعالیٰ کو غیرت تب ہوتی ہے جب کوئی مومن کسی حرام کام کا ارتکاب کر بیٹھتا ہے۔ ایک قول یہ بھی ہے کہ غیرت حمیت وخودداری کا نام ہے[۳۱]۔ قرآن مجید اور سنت نبویہ کی طرف رجوع کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ غیرت کی صفت صرف عورت کے ساتھ خاص نہیں ہے بلکہ یہ ایک مشترکہ صفت ہے۔ اسی لیے اہل علم نے اسے غیرت محمود اور غیرت مذموم کے درمیان تقسیم کیا ہے۔ اگر حق کے معاملہ میں غیرت ہو تو یہ قابل تعریف ہے اور اگر ناحق ہو اور حق سے تجاوز کر جائے تو یہ مذموم ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ذات سے منسوب ہو کر بھی غیرت کا ذکر آیا ہے اور اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور عمرو، زبیر و سعد بن عبادہ جیسے افاضل صحابہ کرام کے ساتھ منسوب ہو کر بھی اس کا ذکر آیا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے غیرت کے اظہار کے معاملہ میں کسی کو برا نہیں کہا۔ یہ حقیقت ہے کہ یہ صفت غیرت عورتوں کے اوپر زیادہ چسپاں کی جاتی ہے اور اس کی ذاتی سرگرمیوں میں اس کا زیادہ مظاہرہ ہوتا ہے۔

امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنی صحیح میں ایک باب "الغیرۃ" کے نام سے قائم کیا ہے اور دوسرا باب "غیرۃ النساء و وجدھن" (عورتوں کی غیرت اور ان کا غصہ) کے نام سے قائم کیا ہے۔ پہلے باب کے تحت انہوں نے بہت سی حدیثیں ذکر کی ہیں جن میں غیرت کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف بھی کی گئی ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف بھی کی گئی ہے۔ ایک مرتبہ سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ نے کہا تھا کہ اگر میں اپنی بیوی کو کسی غیر مرد کے ساتھ دیکھ لوں تو میں اس شخص کو معاف کیے بغیر تلوار سے اس کا کام تمام کر دوں گا، یہ سن کر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "کیا تم لوگ سعد کی غیرت پر تعجب کر رہے ہو، میں سعد سے بھی زیادہ غیرت مند ہوں اور اللہ تعالیٰ کو مجھ سے بھی زیادہ غیرت آتی ہے"۔[۳۲]

ایک دوسری حدیث میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: "اللہ تعالیٰ سے زیادہ غیرت مند کوئی نہیں ہے"[۳۳]۔ ایک دوسری حدیث میں اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کی غیرت کی وضاحت کی ہے۔ ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "بلاشبہ اللہ تعالیٰ کی غیرت کو للکارا جاتا اور اللہ تعالیٰ کی غیرت یہ ہے کہ مومن حرام کام کو انجام دے"[۳۴]۔ اس حدیث کی تشریح کرتے ہوئے حافظ ابن حجر نے اللہ تعالیٰ کی غیرت کے بارے میں ان الفاظ میں اظہار خیال کیا ہے: غیرت کا مطلب ہے ایک حالت سے دوسری حالت کی طرف بدلنا اور غصہ ہونا، اللہ تعالیٰ کے حق میں اس کی تاویل اس کے شایان شان کرنا ضروری ہے، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کے لیے ایک حال سے دوسری حالت میں بدلنا محال ہے، اسی لیے علماء نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے حق میں اس کی تاویل اس کی وعید اور گناہ پر بندوں کو سزا دینے سے کی جائے گی۔ جہاں تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی غیرت کی بات ہے تو اس کے بارے میں آپ نے فرمایا:

”انسانوں میں سب سے زیادہ غیرت مند رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، آپ اللہ کے لیے اور اس کے دین کے لیے غیرت کا مظاہرہ کرتے تھے۔ آپ اپنی ذات کے لیے انتقام نہیں لیتے تھے“۔۳۵؎

شوہر اور بیوی کے درمیان جو غیرت ہوتی ہے وہ پیدائشی ہے اور انسان کی طبیعت میں اسے شامل کیا جاتا ہے۔ یہ غیرت ایک مطلوبہ صفت ہے جب تک کہ وہ ایک دوسرے پر بلاوجہ شک و شبہ کرنے تک نہ پہنچ جائے۔ مردوں کی غیرت کی مثالیں حدیث میں ذکر کی گئی ہیں۔ ان میں سے ایک حدیث اوپر نقل کی جاچکی ہے جو صحابی رسول سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ کی غیرت کے بارے میں ہے۔ بعض احادیث میں عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کی غیرت کا تذکرہ آیا ہے۔ جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”میں جنت میں داخل ہوا، جب میں جنت میں پہنچا تو میں نے وہاں ایک محل دیکھا، میں نے دریافت کیا کہ یہ کس کا محل ہے؟ فرشتوں نے کہا کہ یہ عمر بن خطاب کا محل ہے، میں نے اس محل میں داخل ہونے کا ارادہ کیا، لیکن مجھے تمہاری غیرت کے بارے میں معلوم تھا صرف اسی وجہ سے میں محل کے اندر داخل نہیں ہوا، یہ سن کر عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے کہا: اے اللہ کے رسول! میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں، اے اللہ کے نبی! کیا میں آپ کے وہاں جانے پر غیرت کرتا“۔۳۶؎

اس حدیث سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے اندر یہ غیرت موجود تھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی ان کی اس غیرت کو تسلیم کیا، اس پر خاموشی اختیار کی اور اس کی وجہ سے ان پر نکیر نہیں کی۔ نیز اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس معاملہ میں صحابہ کرام کی حد درجہ رعایت کرتے تھے۔

اس ضمن میں صحابی رسول زبیر بن عوام رضی اللہ عنہ کی غیرت کا تذکرہ بھی روایتوں میں آیا ہے۔ ان کی پہلی شادی جب اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ عنہا سے ہوئی تو وہ اس وقت بہت محتاج تھے، ان کے پاس مال واسباب نہیں تھے۔ ان کی بیوی اسماء رضی اللہ عنہا زبیر رضی اللہ عنہ کے کھیت سے کھجور کی گٹھلیاں چن کر اپنے سر پر رکھ کر لاتی تھیں۔ وہ زمین نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے زبیر رضی اللہ عنہ کو دی تھی جو ان کے گھر سے دو میل کے فاصلہ پر واقع تھی۔ ایک دن جبکہ اسماء رضی اللہ عنہا کھجور کی گٹھلیاں اپنے سر پر رکھے ہوئے کھیت سے آرہی تھی راستہ میں ان کی ملاقات نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور کچھ صحابہ کرام سے ہوئی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اسماء رضی اللہ عنہا کو اپنی سواری کے اونٹ پر پیچھے بیٹھ جانے کو کہا تو اسماء رضی اللہ عنہا کو ان کے شوہر زبیر رضی اللہ عنہ کی غیرت کا خیال آیا تو انہوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سواری پر پیچھے بیٹھنے سے معذرت کر دی۔۳۷؎

جہاں تک عورتوں کے اندر پائی جانے والی غیرت کی بات ہے تو صحیح حدیث میں بعض امہات المؤمنین مثلاً ام سلمہ اور عائشہ رضی اللہ عنہما کی غیرت کا تذکرہ آیا ہے۔ یہ خواتین اسلام، ایمان اور تقویٰ میں جس بلند مقام پر فائز تھیں وہ سب کو معلوم ہے۔ ام سلمہ رضی اللہ عنہا کی یہ روایت نقل کی گئی ہے کہ انہوں نے بیان کیا: اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم میرے پاس آئے اور مجھے نکاح کا پیغام دیا۔ اگرچہ مجھے اس سے خوشی ہوئی لیکن میں نے کہا: میرے پاس ایک بچی ہے جو میرے زیر کفالت ہے اور فطرتاً میں غیرت مند بھی ہوں۔ یہ سن کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب دیا: ”ہم اللہ سے درخواست کریں گے کہ وہ اس ذمہ داری سے اسے آزاد کر دے اور میں اللہ سے یہ دعا بھی کروں گا کہ وہ اس کی غیرت کو دور کر دے“۔۳۸؎

بہت سی احادیث میں عائشہ رضی اللہ عنہا کی غیرت کا تذکرہ بھی آیا ہے۔ ایک روایت میں ہے کہ انہوں نے کہا: ”مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کسی بیوی پر اتنی غیرت نہیں آئی جتنی خدیجہ پر غیرت آئی، کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کا کثرت سے تذکرہ کرتے تھے اور ان کی بہت زیادہ تعریف کیا کرتے تھے۔ نیز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ وحی کی گئی تھی کہ آپ خدیجہ کو جنت میں کھوکھلے موتی سے بنے ایک گھر کی خوشخبری سنا دیں“۳۹؎۔ عائشہ رضی اللہ عنہا کی غیرت صرف سیدہ خدیجہ ہی پر نہیں تھی بلکہ ان کی غیرت ان تمام خواتین پر تھی جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے قریب تھیں۔ وہ کہا کرتی تھیں: مجھے ان تمام عورتوں پر غیرت آتی تھی جنہوں نے خود کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ہبہ کر دیا تھا۔۴۰؎

”عورت کی غیرت اور اس کے غصہ“ سے متعلق باب کی تشریح کرتے ہوئے امام ابن حجر کہتے ہیں: عورتوں کے اندر غیرت ان کی فطرت اور طبیعت کا حصہ ہے، اگر اس میں حد سے زیادہ اضافہ ہو جائے تو قابل ملامت ہے۔ یہی حال مردوں کی غیرت کا ہے۔ غیرت سے متعلق شرعی ضابطہ ایک دوسری حدیث میں موجود ہے، وہ جابر بن عتیک رضی اللہ عنہ کی مرفوع روایت ہے کہ ایک غیرت وہ ہے جو اللہ کو پسند ہے اور ایک غیرت وہ ہے جو اللہ کو ناپسند ہے۔ جو غیرت اللہ کو پسند ہے وہ شک کی بنیاد پر غیرت ہے اور جو غیرت اللہ کو ناپسند ہے وہ بغیر شک کے پیدا ہونے والی غیرت ہے۔ عورت اپنے شوہر کے معاملہ میں غیرت کا اظہار کرتی ہے جبکہ وہ کسی حرام کردہ کام کو انجام دیتا ہے چاہے وہ زنا ہو یا اس کی سوتن کی وجہ سے اس کے حق کی ادائیگی میں کمی یا اس پر ظلم و زیادتی ہو۔ اگر شوہر کے اندر یہ باتیں ثابت ہو جائیں یا قرائن سے اس کے صحیح ہونے کا پتہ لگ جائے تو یہ مشروع غیرت ہے۔ لیکن اگر وہ غیرت دلیل کے بغیر محض وہم کی بنیاد پر ہو تو وہ بغیر شک کے پیدا ہونے والی غیرت ہے جو اللہ کو ناپسند ہے۔ رہی یہ صورت کہ شوہر عدل و انصاف کرنے والا ہو اور دونوں بیویوں کے حقوق ادا کرنے والا ہو، اس کے بعد بھی اگر دونوں بیویاں غیرت کا اظہار کرتی ہیں تو اگر یہ فطری غیرت ہو جس سے

کوئی عورت محفوظ نہیں ہوتی تو پھر اس معاملہ میں بیوی معذور سمجھی جائے گی جب تک کہ اس کی غیرت حرام کردہ قول یا عمل کا سبب نہ بنے۔ قرون اولیٰ کی خواتین اسلام کی غیرت کے تعلق سے جو کچھ منقول ہے اسے اسی ضابطہ پر محمول کیا جائے گا۔ ۴۱؎

امام ابن حجر کی اس تفصیلی وضاحت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ غیرت جو ممنوع بات زبان سے نکالنے یا ممنوع عمل انجام دینے کا سبب نہ بنے وہ نقصان دہ نہیں ہے۔ اس صورت میں غیرت کا اظہار کرنے والے مرد یا عورت کو قابل مواخذہ نہیں قرار دیا جائے گا۔ بلکہ اس کے ساتھ حکمت و تحمل کے ساتھ معاملہ کیا جائے گا۔ انس رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ ایک مرتبہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنی ایک زوجہ کے گھر میں تھے تو امہات المؤمنین میں سے ایک نے وہاں آپ کے لیے ایک برتن میں کھانے کی کوئی چیز بھیجی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم جس زوجہ کے گھر میں موجود تھے انہوں نے کھانا لانے والے غلام کے ہاتھ پر مار دیا جس کی وجہ سے کھانے کا برتن گر کر ٹوٹ گیا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اس ٹوٹے ہوئے برتن کے ٹکروں کو چننے لگے اور گرے ہوئے کھانا کو بھی جمع کرنے لگے۔ اس موقع پر آپ نے فرمایا: تمہاری ماں کو غیرت آگئی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے غلام کو روک کر رکھا یہاں تک کہ ایک صحیح وسالم برتن اس زوجہ کے گھر سے لایا گیا جہاں آپ مقیم تھے اور وہ صحیح سالم برتن اس زوجہ کو دیا گیا جن کا برتن ٹوٹ گیا تھا اور ٹوٹے ہوئے برتن کو آپ نے اس گھر میں رکھوا دیا جہاں وہ ٹوٹا تھا"۔ ۴۲؎

اس حدیث کی تشریح کرتے ہوئے امام ابن حجر کہتے ہیں کہ اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ غیرت کا اظہار کرنے والی عورت کو معذور سمجھا جائے گا۔ اس لیے کہ غیرت آنے پر وہ غصہ کی وجہ سے اندھی ہو جاتی ہے۔ ابویعلی نے عائشہ رضی اللہ عنہا سے مرفوعاً نقل کیا ہے کہ "غیرت مند عورت وادی کی بلندی سے وادی کے بالکل نچلے حصہ کو نہیں دیکھ پاتی ہے"۔ ۴۳؎

اس سے یہ معلوم ہوا کہ غیرت مرد و عورت کی ایک ایسی صفت ہے جو فطری طور پر ان دونوں کے اندر پائی جاتی ہے۔ اسلام نے اس کا اعتبار کیا ہے اور جب تک یہ صفت غیرت حد سے تجاوز نہ کر جائے انسان کو معذور قرار دیا ہے۔ یہ الٰہی حکمت کس قدر حیرت انگیز ہے کہ ایک غیرت مند مرد یا عورت کو قابل مواخذہ قرار نہیں دیتی ہے کیونکہ غیرت کے اظہار کے وقت غصہ اور جذبات کی وجہ سے ان کی عقلوں پر پردہ پڑ جاتا ہے۔ چنانچہ معتدل قسم کی غیرت جو شک اور بے اعتمادی تک نہ پہنچتی ہو، محبت و الفت سے دلوں کو آباد رکھنے کا سبب بنتی ہے اور اس کی وجہ سے گھر اور خاندان کی فضا خوشگوار پر سکون اور الفت و محبت و رحمدلی کے جذبات سے معمور

رہتی ہے۔ زوجین میں سے ہر ایک کو اپنے ساتھی کی طرف سے محبت و تعلق کا احساس ہوتا ہے۔ لیکن وہ غیرت جسے مذموم قرار دیا گیا ہے وہ تباہی، جھگڑے، رشتوں کے اندر دڑاریں اور طلاق کی تلخیاں لے کر آتی ہے۔ اسی وجہ سے اسے مذموم قرار دیا گیا ہے۔

(د) مکر و حیلہ گری

اس کے لیے عربی زبان میں "کید" کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ اس کا مطلب ہے حق یا باطل کے ذریعہ تدبیر کرنا، نہاں خانۂ دل میں جو بات ہے اس کے برخلاف موقف کا اظہار، ڈھیل دینا، چال چلنا، کسی معاملہ کو حل کرنا اور حیلہ و بہانہ کرنا وغیرہ۔ مکر و حیلہ گری کا اطلاق انسان کی بہت ساری صفات اور سرگرمیوں پر ہوتا ہے، ان میں سے کچھ محمود اور کچھ مذموم ہیں۔ عربی زبان کا ایک جملہ ہے "الحرب مكيدة" یعنی جنگ مکر و فریب اور چال چلنے کا نام ہے۔ قرآن مجید میں کید بمعنی مکر کا استعمال بہت سی جگہوں پر ایک صفت کے طور پر ہوا ہے۔ کچھ جگہوں پر اس کا استعمال اللہ عزوجل کی ذات کے لیے اور کچھ جگہوں پر اس کا استعمال انسانوں کے لیے ہوا ہے جن میں کچھ نیک و مومن مرد عورتیں بھی ہیں اور کچھ کفار و مفسدین بھی شامل ہیں، نیز اس صفت کا استعمال شیطان کے لیے بھی ہوا ہے۔

اس اعتبار سے کید بمعنی مکر ایک مشترکہ انسانی صفت ہے۔ اور ہم دیکھتے ہیں کہ عورتوں کے اندر یہ صفت بطور خاص پائی جاتی ہے اور اس کی شخصیت کا ایک لازمی جزء ہے۔ ایسا اس وجہ سے ہے کہ یہ صفت عورت کی خلقت و طبیعت سے میل کھاتی ہے۔ عام طور پر عورت اپنی مراد کو پانے اور اپنے ہدف کو حاصل کرنے کے لیے اس صفت کا استعمال کرتی ہے۔ اسے ہم حیلہ و تدبیر کا نام بھی دے سکتے ہیں۔

قرآن مجید میں عورتوں کی اس صفت کو عظیم کہا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "فلما رأى قميصه قدّ من دبر قال إنه من كيدكن إن كيدكن عظيم" (یوسف/۲۸) (ترجمہ: خاوند نے جب دیکھا کہ یوسف کا کرتا پیچھے کی جانب سے پھاڑا گیا ہے تو صاف کہہ دیا کہ یہ تو تم عورتوں کی چال بازی ہے، بیشک تمہاری چال بازی بہت بڑی ہے) اسی سورہ یوسف میں عورتوں کے کید یعنی مکر و فریب کا تذکرہ کئی بار آیا ہے۔ ایک جگہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "قال رب السجن أحب إلىّ مما يدعونني إليه و إلاّ تصرف عني كيدهن أصب إليهن و أكن من الجاهلين فاستجاب له ربه فصرف عنه كيدهن إنه هو السميع العليم" (یوسف/۳۳-۳۴) (ترجمہ: یوسف علیہ السلام نے دعا کی کہ اے میرے پروردگار! جس بات کی طرف یہ عورتیں مجھے بلا رہی ہیں اس سے تو مجھے جیل خانہ بہت پسند ہے، اگر تو نے ان کا فن فریب مجھ سے دور نہ کیا تو میں تو ان کی طرف مائل ہو جاؤں گا اور بالکل نادانوں میں جا ملوں گا، اس

کے رب نے اس کی دعا قبول کرلی اور ان عورتوں کے داؤ پیچ اس سے پھیر دیئے، یقیناً وہ سننے والا جاننے والا ہے)

سورہ یوسف کی ایک دوسری آیت میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:"و قال الملک ائتونی به فلما جآءه الرسول قال ارجع إلیٰ ربک فاسألہ ما بال النسوة اللاتی قطعن أیدیھن إنّ ربیّ بکیدھن علیم" (یوسف/۵۰) (ترجمہ:اور بادشاہ نے کہا یوسف کو میرے پاس لاؤ، جب قاصد یوسف کے پاس پہنچا تو انہوں نے کہا اپنے بادشاہ کے پاس جا اور اس سے پوچھ کہ ان عورتوں کا حقیقی واقعہ کیا ہے جنہوں نے اپنے ہاتھ کاٹ لیے تھے؟ ان کے حیلے کو صحیح طور پر جاننے والا میرا پروردگار ہی ہے)

مذکورہ بالا آیات میں عورتوں کے مکر و فریب کا واشگاف لفظوں میں تذکرہ موجود ہے۔ ان آیات میں بڑے دلنشین انداز میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ عورت کیسے مرد کی کمزوری کی جگہوں سے اس کے دل میں اترنے کی کوشش کرتی ہے، اس کے لیے اپنی خوبصورتی، فتنہ انگیزی اور ناز و انداز کی جادوگری کو استعمال کرتی ہے اور اپنی مسحور کن گفتگو کا سہارا لے کر مرد کو مشکلات اور آزمائش کے جال میں پھنسا دیتی ہے۔ پھر مرد اس کے بچھائے ہوئے جال میں پھنس جاتا ہے۔ اسی لیے یوسف علیہ السلام نے اس آزمائش سے بچنے کے لیے اللہ تعالیٰ سے اس کی پناہ طلب کی اور اللہ سے دعا کی کہ وہ ان عورتوں کے مکر و فریب سے انہیں نجات دے تاکہ وہ ہلاکت کے گڑھے میں گرنے سے بچ جائیں اور ان عورتوں کے مکر و فریب کا شکار نہ بنیں۔ رب تعالیٰ نے ان کی دعا قبول کی اور انہیں فتنہ میں پڑنے سے بچایا اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کی تدبیر بہر حال تمام انسانی تدبیروں پر بھاری ہے۔

عورتوں کے اندر پائی جانے والی یہ صفت کید یعنی مکر و حیلہ کوئی عیب نہیں ہے جس سے اس کی شخصیت داغدار ہوتی ہو بلکہ یہ عورتوں کی فطری صفات میں سے ہے، اس صفت کو حاصل کرنے یا نہ کرنے پر اس کا کوئی اختیار نہیں ہے۔

عورتوں کی جن صفات کا یہاں تذکرہ ہوا یہ ان کی کل صفات نہیں ہیں، ان کے علاوہ عورتوں کے اندر دوسری صفات بھی پائی جاتی ہیں۔ ان میں سے چار صفات کو میں نے بطور مثال منتخب کیا تھا تاکہ ان پر روشنی ڈالی جائے۔ عورتوں کی یہ صفات انہیں انسانیت کے دائرہ سے باہر نہیں کرتی ہیں بلکہ وہ ان تمام صفات کے ہوتے ہوئے بھی احترام و عزت افزائی کی مستحق ایک انسان ہی ہے۔ واللہ أعلم۔

حواشی:

ا۔ فی ظلال القرآن، مؤلفہ سید قطب، جلد ۴، ص ۲۲۴۱ (تفسیر سورۃ الإسراء)

٢۔ الجامع لأحكام القرآن، مؤلفہ ابو عبد اللہ محمد بن أحمد الأنصاری القرطبی، جلد ۵، ص ۳۹۰۹

۳۔ صحیح مسلم (شرح النووی)، جلد ۲، ص ۶۲۳-۶۲۴، کتاب الجنائز، باب القیام للجنازة

۴۔ سنن الترمذی، جلد ا، باب ۸۲، ص ۱۹۰ (أبواب الطهارة)

۵۔ دیکھئے تفسیر طبری، جلد ا، ص ۵۱۳، تفسیر قرطبی، جلد ا، ص ۲۵۷، تفسیر رازی، مجلد ۵، ص ۱۶۷

٦۔ تفسير القرآن العظيم، مؤلفہ ابن کثیر، جلد ا، ص ۸۰ (تفسیر سورة البقرة)

۷۔ صحیح مسلم (شرح النووی)، جلد ۳، ص ٦۵٦، (کتاب الرضاع، باب الوصية بالنساء)

کتاب آدم، مؤلفہ البہی الخولی، ص ۱٦۸

۸۔ صحیح مسلم (شرح النووی)، جلد ۳، ص ٦۵٦-٦۵۷، (کتاب الرضاع، باب الوصية بالنساء)

۹۔ حوالہ سابق

۱۰۔ حوالہ سابق

۱۱۔ تفسير الرازی، جلد ۵، ص ۱٦۷

۱۲۔ التعارف القرآنی للقرآن، مؤلفہ عبد الکریم خطیب، الکتاب الثانی، ص ٦۸۲-٦۸۴

۱۳۔ المرأة فی القرآن و السنة، مؤلفہ محمد عزة دروزة، ص ۴۷

۱۴۔ فی ظلال القرآن، مؤلفہ سید قطب، جلد ا، ص ۵۷۴

۱۵۔ سنن الترمذی، جلد ا، باب ۸۲، ص ۱۹۰ (أبواب الطهارة)، مسند الإمام احمد بن حنبل، جلد ٦، ص ۲۵٦، الإسلام و المرأة المعاصرة، مؤلفہ البہی الخولی، ص ۲۰

۱٦۔ فيض القدير شرح الجامع الصغير، جلد ۵، ص ۱۳۷

۱۷۔ دستور الأسرة، مؤلفہ احمد فائز، ص ۳۳

۱۸۔ عمل المرأة فی المیزان، مؤلفہ دکتور محمد علی البار، ص ۵۷ تا ۹۸

۱۹۔ فتح الباری شرح صحیح البخاری، جلد ٦، ص ۵٦٦، (کتاب مناقب النبی ﷺ، باب صفة النبی ﷺ)

۲۰۔ صحیح البخاری، جلد ٦، ص ۱۳۵، (کتاب النکاح، باب لا ینکح الأب و غیره البکر و الثیب إلا برضاھا)

۲۱۔ صحیح البخاری، جلد ۱۰، ص ۵۲۱، (کتاب الأدب، باب الحیاء)

۲۲۔ حوالہ سابق

۲۳۔ مجلة لواء الإسلام، شمارہ ۹، ص ٦۱۰

۲۴۔ حوالہ سابق

۲۵۔ تفسیر القرطبی، جلد ۸، ص ۵۸۹۳

۲۶۔ تفسیر القرآن العظیم، مؤلفہ ابن کثیر، جلد ۴، ص ۱۲۵

۲۷۔ التفسیر الحدیث، مؤلفہ محمد عزۃ دروزۃ، جلد ۴، ص ۲۰۳

۲۸۔ التفسیر القرآنی للقرآن، مؤلفہ عبد الکریم الخطیب، کتاب ۱۳، ص ۱۱٦

۲۹۔ مسند الإمام أحمد بن حنبل، جلد ۳، ص ۳۴

۳۰۔ التفسیر الکبیر، مؤلفہ امام فخر الدین رازی، جلد ۲۰، ص ٦ (تفسیر سورۃ النحل)

۳۱۔ فتح الباری شرح صحیح البخاری، مؤلفہ ابن حجر عسقلانی، جلد ۹، ص ۳۲۰، (کتاب النکاح، باب الغیرۃ)

۳۲۔ فتح الباری، جلد ۹، ص ۳۱۹

۳۳۔ حوالہ سابق

۳۴۔ حوالہ سابق

۳۵۔ فتح الباری، جلد ۹، ص ۳۳۲

۳٦۔ فتح الباری، جلد ۹، ص ۳۲۰

۳۷۔ فتح الباری، جلد ۹، ص ۳۲۹

۳۸۔ الإصابة فی معرفة الصحابة، مؤلفہ ابن حجر عسقلانی، جلد ۴، ص ۴۵۹ (ام سلمہ رضی اللہ عنہا کی سیرت)

۳۹۔ فتح الباری، جلد ۹، (کتاب النکاح، باب غیرة النساء لأزواجھن)

۴۰۔ فتح الباری، جلد ۹، ص ۳۳

۴۱۔ حوالہ سابق

۴۲۔ فتح الباری، جلد ۹، ص ۳۲۰

۴۳۔ حوالہ سابق

پانچواں باب

حق زواج وامومت کا حق

عورتوں کے لیے شوہر سے نفقہ حاصل کرنے، اپنی اولاد کو دودھ پلانے، اس کی پرورش کرنے اور اسے تعلیم و تربیت سے آراستہ کرنے کا حق اسلام میں موجود ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کی سخت الفاظ میں مذمت کی ہے جو بچی کی پیدائش کو نحوست قرار دیتے ہیں۔ اس کے برخلاف اللہ تعالیٰ نے والدین کی ہمت افزائی کی ہے کہ وہ بچی کی پیدائش پر خوشی کا اظہار کریں، اس کی مناسب دیکھ بھال کریں اور اس کی پرورش کرنے اور اسے تعلیم و تربیت سے آراستہ کرنے کی ذمہ داری سنبھالیں۔

اسلام دنیا میں آنکھ کھولنے والے ہر بچہ کو تحفظ عطا کرتا ہے، چاہے وہ لڑکا ہو یا لڑکی۔ اسلام نے بچہ کی پرورش پر خرچ کرنے کا ذمہ دار باپ کو بنایا ہے، یہاں تک کہ اگر بچہ رحم مادر ہی میں ہے تب بھی باپ ہی کے ذمہ اس کا خرچ ہے۔ اگر حالت حمل میں کسی عورت کو طلاق ہو جاتی ہے تب بھی وہ مطلقہ عورت بچہ کے باپ سے نفقہ حاصل کرنے کی حقدار ہے۔ اس بچہ کی پیدائش تک اس کے باپ کو اس بچہ کا خرچ اٹھانا ہوگا اور وہ خرچ مطلقہ عورت کو ادا کرنا ہوگا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "و إن كن أولات حمل فأنفقوا عليهن حتى يضعن حملهن" (الطلاق/٦) (ترجمہ: اور اگر وہ حمل سے ہوں تو جب تک بچہ پیدا ہولے انہیں خرچ دیتے رہا کرو)

امام ابن کثیر اس آیت کی تشریح کرتے ہوئے کہتے ہیں: "بہت سارے علماء جن میں عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ اور سلف وخلف کی ایک جماعت شامل ہے، کہتے ہیں کہ آیت میں طلاق بائن پانے والی خاتون کا تذکرہ ہے کہ اگر وہ حاملہ ہوگی تو ولادت ہونے تک شوہر کو اس کا خرچ اٹھانا ہوگا۔ اور طلاق رجعی کی صورت میں مطلقہ کو شوہر سے نفقہ حاصل کرنے کا حق ہر حال میں ہوتا ہے، چاہے وہ حاملہ ہو یا غیر حاملہ "۔[1]

بچہ کی پیدائش کے بعد اس کی رضاعت کا مرحلہ آتا ہے۔ اس مرحلہ میں بھی مطلقہ کا خرچ بچہ کے باپ کے ذمہ ہے، کیونکہ وہ اس کے بچہ کو دودھ پلا رہی ہے۔ اس مرحلہ میں بچہ کی ماں کو جو اسے دودھ پلا رہی ہے، رضاعت کے لیے ضروری صحت بخش غذا فراہم کرنا باپ کی ذمہ داری ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "فإن أرضعن لكم فآتوهن أجورهن و ائتمروا بينكم بمعروف" (الطلاق/٦) (ترجمہ: پھر اگر تمہارے کہنے سے وہی دودھ پلائیں تو تم انہیں ان کی اجرت دے دو اور باہم مناسب طور پر مشورہ کر لیا کرو)

احمد المراغی اس آیت کی تشریح کرتے ہوئے کہتے ہیں: ”عدت ختم ہونے کے بعد مطلقہ کو یہ اختیار ہوتا ہے کہ وہ بچہ کی رضاعت کے لیے تیار ہو جائے یا اس کے لیے انکار کر دے۔ اگر وہ دودھ پلانے کی ذمہ داری قبول کر لیتی ہے تو وہ بچہ کے باپ سے رضاعت کی اجرت پانے کی حقدار ہو گی۔ یہ اجرت کتنی ہو گی؟ اسے بچہ کے والدین یا سرپرست باہم اتفاق رائے سے طے کریں گے۔ بچہ اور اس کی ماں کو خوراک اور پوشاک فراہم کرنا بچہ کے باپ کی ذمہ داری ہے“۲۔ اس کی ضرورت اس وجہ سے پڑتی ہے کہ بچہ کے لیے ماں کا دودھ ہر چیز سے زیادہ صحت بخش اور مقوی ہوتا ہے۔۳

اللہ تعالیٰ نے بچہ کو دودھ پلانے کی مدت دو سال مقرر کی ہے، اس مدت کے دوران بچہ کی ماں کو دودھ پلانے کی اجرت ملتی رہے گی۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ”و الوالدات یرضعن أولادهن حولین کاملین لمن أراد أن یتم الرضاعة و علی المولود له رزقهن و کسوتهن بالمعروف“ (البقرۃ/۲۳۳) (ترجمہ: مائیں اپنی اولاد کو دو سال کامل دودھ پلائیں جن کا ارادہ دودھ پلانے کی مدت بالکل پوری کرنے کا ہو اور جن کے بچے ہیں ان کے ذمہ ان کا روٹی کپڑا ہے جو مطابق دستور کے ہو)

امام ابن کثیر اس آیت کی تشریح کرتے ہوئے کہتے ہیں: ”یہ بچے کی ماؤں کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہدایت ہے کہ وہ اپنی اولاد کی رضاعت مکمل کریں جو کہ دو سال کی مدت ہے۔ اس مدت کے بعد کی رضاعت کا اعتبار نہیں ہے۔ بچہ کے والد کے ذمہ دودھ پلانے والی ماؤں کے کھانے اور پہننے کا خرچ ہے جس کی ادائیگی معروف طریقہ سے کی جائے گی، یعنی اس شہر میں اس حیثیت کی عورتوں کی جو خوراک اور پوشاک ہونی چاہیے اس کے مطابق ان دونوں اخراجات کی ادائیگی ہو گی، نہ تو بے جا اسراف کے ساتھ اور نہ بے جا تنگی کے ساتھ، بچہ کے باپ کی قدرت و حیثیت کے مطابق، خوشحال ہے تو خوشحال کی طرح، متوسط ہے تو متوسط کی طرح اور تنگ دست ہے تو اسی حساب سے“۔۴

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: ”صرف اسی رضاعت کا اعتبار ہے جس سے بچہ کی ہڈیاں تشکیل پائیں اور جو اس کے جسم کے گوشت پوست میں اضافہ کرے“۵۔ اس کی تائید ام سلمہ رضی اللہ عنہا کی اس روایت سے بھی ہوتی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”اسی رضاعت سے حرمت ثابت ہوتی ہے جبکہ پستان سے دودھ پلایا جائے جو شیر خوار بچہ کی آنتوں کو پھاڑے یعنی اس کے لیے غذائیت کا سبب بنے اور یہ رضاعت دودھ چھڑانے سے پہلے پہلے ہو، یعنی دو سال کی مدت کے دوران“۔۶

یہ شیر خوار بچوں کے لیے اللہ تعالیٰ کا بنایا ہوا نظام ہے جو ماؤں کو اس بات کے لیے آمادہ کرتا ہے کہ وہ اپنا دودھ اپنے بچوں کو پلائیں۔ اسلامی شریعت نے تمام ماؤں کو یہ ذمہ داری دی ہے کہ وہ اپنے بچوں کو دو سال تک اپنا دودھ ہر حال میں پلائیں۔ بیشتر معالجین کا اس پر اتفاق ہے کہ ایک شیر خوار بچہ کے لیے غذائیت کے نقطۂ نظر سے ماں کے دودھ سے زیادہ کوئی دوسری چیز مفید نہیں ہے۔ علاوہ ازیں رضاعت کے نفسیاتی فوائد بھی ہیں جو بوتلوں کے ذریعہ ڈبہ بند دودھ پلانے سے حاصل نہیں ہوسکتے ہیں۔ ابھی حالیہ چند برسوں سے پوری دنیا کے معالجین فطری رضاعت کی اہمیت پر زور دینے لگے ہیں۔ بہت ساری بین الاقوامی صحت تنظیموں نے اس کے لیے مہم چلائی ہے اور ایسے کتابچے تقسیم کیے ہیں جن میں فطری رضاعت کی اہمیت کو اجاگر کرتے ہوئے اس کے لیے ماؤں کی ہمت افزائی کی گئی ہے۔

ڈاکٹر محمد علی البار کہتے ہیں: قرآن کو نازل ہوئے چودہ سو سال گزر چکے ہیں اور ہم اب تک رضاعت کے معاملہ میں تاریکی میں بھٹک رہے ہیں۔ بیسویں صدی کی عظیم الشان انسانی تہذیب نے بچہ کو دودھ پلانے والی ماؤں کو اجرت دیئے جانے کے امکان کو ابھی تک تسلیم نہیں کیا ہے۔ لیکن اسلام نے آج سے چودہ سال قبل اس کی وضاحت کی ہے اور اپنے پیروکاروں سے اس پر عملدرآمد بھی کرایا ہے۔[۷]

فطری رضاعت کے فوائد حیران کن ہیں، ان میں سے چند یہ ہیں:

۱۔ ماں کا دودھ قدرتی طور پر تیار شدہ ہے جو بچہ کو بآسانی ہضم ہوتا ہے۔ اس کی وجہ سے بچہ کی بار بار آنت اترنے اور سوزش ہونے کا امکان کم ہو جاتا ہے جبکہ بوتل کا دودھ پینے والے بچے اس عارضہ میں بکثرت مبتلا ہوتے ہیں۔

۲۔ ماں کا دودھ خالص قدرتی دودھ ہوتا ہے، اس میں کوئی دوسرا دودھ ملا نہیں ہوتا ہے، مثلاً گائے، بھینس اور بھیڑ کے خشک دودھ کی آمیزش سے پاک ہوتا ہے۔ ماں کا دودھ قدرتی طور پر تیار شدہ ہوتا ہے جو شیر خوار بچہ کی غذائی ضرورت کو پورا کرتا ہے۔ ولادت کے بعد ماں کے پستان سے جو زرد رنگ کا سیال خارج ہوتا ہے اس میں بڑی مقدار میں پروٹین اور جراثیم سے لڑنے والا اینٹی باڈی مادہ ہوتا ہے۔ ابتدائی مرحلہ کا یہ پیلا گاڑھا دودھ ماں سے بچہ کے اندر قوت مدافعت کو بھی منتقل کرتا ہے۔

۳۔ ماں کا دودھ پینے والے بچہ کی افزائش بہت تیزی کے ساتھ بھرپور طریقہ سے ہوتی ہے بہ نسبت ان بچوں کے جو بوتل کا دودھ پیتے ہیں۔

۴۔ بوتل کا دودھ پینے والے بچہ کی بہ نسبت ماں کا دودھ پینے والے بچے جسمانی طور پر زیادہ صحت مند ہوتے ہیں۔

ماں باپ کی علاحدگی کی صورت میں بچہ کس کی سرپرستی و نگہداشت میں رہے گا؟ اسلام نے اس مسئلہ کو بھی حل کیا ہے۔ چونکہ ایک نوعمر بچہ کو نگہداشت، تحفظ اور ماں کے سایۂ عاطفت کی سب سے زیادہ ضرورت ہوتی ہے اس لیے چھوٹے بچوں کی پرورش کا حق ماں کو دیا گیا ہے۔ عبد اللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ ایک خاتون نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئی اور کہنے لگی: اس بچہ کو میں نے اپنے پیٹ میں رکھا، اپنی گود میں سلایا اور اپنا دودھ پلا کر اس کی پرورش کی، اب اس کے باپ نے مجھے طلاق دیدی ہے اور میرے بچہ کو مجھ سے چھیننا چاہتا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس خاتون کو جواب دیا: "جب تک تم دوسری شادی نہ کرو، اس بچے کو تمہیں اپنے پاس رکھنے کا حق ہے" ۸۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے اس خاتون کو بچہ کی پرورش کرنے کا حق دیا۔ جب پرورش کے معاملہ میں ماں کو اولیت حاصل ہے تو اس کی وجہ سے فقہاء نے یہ کہا ہے کہ ماں کی قرابت داری باپ کی قرابت داری پر مقدم ہے۔ ۹

چھوٹے بچہ کی حضانت و پرورش کا حق ماں کو دینے کی جو حکمت ہے اسے بیان کرتے ہوئے ڈاکٹر محمد سلام مدکور کہتے ہیں: اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ماں کے اندر بچہ کے لیے جو محبت و شفقت رکھی ہے اس کی کوئی حد نہیں ہے۔ اس کی وجہ سے ماں اپنے بچہ کی حفاظت کرنے اور اس کی دیکھ بھال کرنے کے لیے خود کو اس طرح وقف کر دیتی ہے کہ اسے اپنی ذات تک کا کوئی خیال نہیں رہتا۔ اس کے لیے وہ ہر طرح کی محنت و مشقت کو ہنسی خوشی برداشت کرتی ہے، اس راہ میں اسے اکتاہٹ و تھکاوٹ کا احساس بھی نہیں ہوتا ہے۔ شارع نے ماں کو پرورش وحضانت کا حق بچہ کی عمر کے اس مرحلہ میں دیا ہے جس میں اسے عورتوں کی خدمت اور دیکھ بھال کی حد سے زیادہ ضرورت ہوتی ہے۔ اس لیے کہ عورتوں کے اندر بچوں کے لیے شفقت و محبت کا جذبہ بدرجہ اتم موجود ہوتا ہے اور ماں کے اندر تو یہ صفت اور بھی زیادہ پائی جاتی ہے۔ اسی وجہ سے ماں بچہ کی خاطر راتوں کو جاگنے اور اس کی پرورش کی مشقت برداشت کرنے پر زیادہ قادر ہوتی ہے۔ ماں کی گود بچہ کے لیے سب سے زیادہ محفوظ پناہ گاہ ہوتی ہے۔ اسی لیے شارع چھوٹے بچہ کی حضانت کے معاملہ میں ماں کے علاوہ کسی دوسرے کو صرف اسی وقت ترجیح دیتے ہیں جبکہ اس کی ناگزیر ضرورت درپیش ہو، مثلاً لڑکا یا لڑکی جب اس عمر کو پہنچ جاتے ہیں جب انہیں عورتوں کی خدمت اور دیکھ بھال کی ضرورت نہیں رہتی تو اس مرحلہ میں لڑکے یا لڑکی کی مکمل نگرانی کی ذمہ داری باپ کی ہوتی ہے یا جو سرپرستی میں اس کے قائم مقام ہو اس کی ہوتی ہے۔ اس لیے کہ لڑکپن

کی عمر عبور کرنے کے بعد اسے ایسے شخص کی ضرورت ہوتی ہے جو اس کی صحیح رہنمائی کر سکے اور اسے ہر طرح کے انحراف و بگاڑ سے بچا سکے۔ اس خدمت کو انجام دینے کے لیے باپ ہی سب سے زیادہ موزوں ہوتا ہے۔ ۱۰؎

اوپر ذکر کی ہوئی باتوں سے ہمیں اندازہ ہو سکتا ہے کہ اسلام میں ایک بچہ کا جبکہ وہ جنین ہو یا شیر خوار ہو یا لڑکپن کی عمر میں ہو، کس قدر خیال رکھا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے خاص طور پر شیر خوار بچی کی پرورش پر لوگوں کو ابھارا ہے۔ اس نے ان بچیوں کو بہتر تعلیم و تربیت دے کر ایک باعزت مقام دینے کا حکم دیا ہے۔ اور ان ہدایات و احکام پر عمل کرنے والوں کے لیے اس نے بڑے اجر و ثواب کا وعدہ کیا ہے۔ اس سلسلہ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: ”جو شخص بلوغت کی عمر کو پہنچنے تک دو بچیوں کی پرورش کرے گا، قیامت کے دن وہ اور میں ان دو انگلیوں کی طرح ایک ساتھ ہوں گے، آپ نے اپنی انگلیوں کو ملا کر بتایا“ ۱۱؎۔ اس حدیث رسول میں لوگوں کو بیٹیوں کی پرورش اور کفالت پر ابھارا گیا ہے تاکہ وہ ایک اچھی زندگی جی سکیں۔ اسلام نے اس طرح کے اجر و ثواب کا اعلان کر کے بچیوں کو زمانہ کی دست درازیوں اور گھر والوں کے ظلم و ستم سے بچایا ہے۔ اسلام نے اس پرورش، تربیت اور خرچ کرنے کے بدلہ اللہ تعالیٰ کے انعام و اکرام اور اجر و ثواب کا اعلان کیا ہے۔ جو باپ اپنی بیٹی کی کفالت کرے گا اور اس پر اپنے مال کو خرچ کرے گا اللہ تعالیٰ اسے بدلہ میں جنت الفردوس سے نوازیں گے اور وہ بھی آخری نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی معیت میں، کیا اس اجر عظیم کے بعد بھی کوئی اجر ہو سکتا ہے۔ ۱۲؎

اس اندیشہ کی وجہ سے کہ کہیں لوگ لڑکے کو لڑکی پر ترجیح نہ دینے لگیں شارع نے اس کے لیے ایک نئی ضمانت دی ہے تاکہ بچی کے احساسات و جذبات کی حفاظت ہو سکے اور اسے زندگی کے کسی مرحلہ میں نقص یا تحقیر کا احساس نہ ہو اور اس کے بھائی کو اس پر ترجیح و فوقیت نہ دی جائے جس کی وجہ سے وہ احساس کمتری کی شکار ہو کر رہ جائے، اس کے لیے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: ”جس کے پاس کوئی بچی ہو، اس نے اس بچی کو نہ تو زندہ درگور کیا، نہ اسے نظر انداز کیا اور نہ بیٹے کو اس پر ترجیح دی۔ اللہ تعالیٰ اسے جنت میں داخل کرے گا“۔ ۱۳؎

لڑکیوں کے ساتھ حسن سلوک اور ان کی بہترین پرورش پر ابھارنے والی احادیث میں سے ایک یہ حدیث شریف بھی ہے کہ بیٹی سے محبت و شفقت کا معاملہ کرنے والی ماں کے لیے جہنم سے گلوخلاصی اور جنت میں داخل کیے جانے کی ضمانت ہے۔ عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت ہے کہ میرے پاس ایک محتاج عورت آئی، اس کے ساتھ اس کی دو بیٹیاں تھیں، میں نے اسے کھانے کے لیے تین کھجور دیئے، اس نے دونوں بیٹیوں کو ایک

ایک کھجور دے دیا اور ایک کھجور خود کھانے کے لیے منہ تک لے گئی، اتنے میں دونوں بیٹیوں نے اس کھجور کو بھی کھانے کے لیے مانگ لیا، اس نے کھجور کے دو ٹکڑے کیے اور اپنی دونوں بیٹیوں کو دے دیا۔ مجھے اس کی یہ ادا بہت پسند آئی، میں نے اس کا تذکرہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا تو آپ نے فرمایا: ”اللہ تعالیٰ نے اس کے اس عمل کے بدلہ اس کے لیے جنت واجب کر دی یا فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے اسے جہنم سے آزاد کر دیا“۔ ۱۴؎

اوپر جو آیات اور احادیث گزری ہیں ان سے واضح طور پر معلوم ہو جاتا ہے کہ اسلام نے عورتوں کی صورت حال پر خصوصی توجہ دی ہے اور زندگی کے ہر مرحلہ میں اس کی نگہداشت اور تحفظ کا خیال رکھا ہے۔ بطور جنین، شیر خوار، چھوٹی بچی، جوان عورت، بیوی اور ماں ہر حیثیت سے اس کے تحفظ و تکریم کے لیے احکامات جاری کیے ہیں۔ کوئی دین، کوئی تہذیب، کوئی قانون اور کوئی شریعت ایسی نہیں ہے جس نے عورتوں کو وہ حقوق دیئے ہوں جو اسلام نے انہیں عطا کیے ہیں، بلکہ بیسویں صدی کی تہذیب میں بھی اسے وہ حقوق و مراعات حاصل نہیں ہیں جو اسلامی شریعت میں اسے حاصل ہیں۔

حواشی:

۱۔ تفسیر القرآن العظیم، مؤلفہ ابن کثیر، جلد ۴، ص ۳۸۴ (تفسیر سورۃ الطلاق)

۲۔ تفسیر المراغی، مؤلفہ مصطفی المراغی، جلد ۲۸، ص ۱۴۶

۳۔ الإسلام و الأسرة و المجتمع، مؤلفہ محمد سلام مدکور، ص ۱۵۰

۴۔ تفسیر القرآن العظیم، مؤلفہ ابن کثیر، جلد ۱، ص ۲۸۴ (تفسیر سورۃ البقرۃ)

۵۔ عون المعبود شرح سنن ابی داؤد، مؤلفہ علامہ شمس الحق عظیم آبادی، جلد ۶، ص ۶۱-۶۲ (باب رضاعۃ الکبیر)

۶۔ سنن الترمذی، جلد ۳، ص ۹۴۹ (کتاب الرضاع)

۷۔ عمل المرأۃ فی المیزان، مؤلفہ محمد علی البار، ص ۹۶

۸۔ عون المعبود شرح سنن ابی داؤد، جلد ۶، ص ۳۷۱ (کتاب النکاح، باب من أحق بالولد)

۹۔ فقہ السنۃ، مؤلفہ السید سابق، جلد ۲، ص ۳۳۸

۱۰۔ الإسلام و الأسرة و المجتمع، مؤلفہ محمد سلام مدکور، ص ۱۵۵-۱۵۶

۱۱۔ صحیح مسلم (شرح النووی)، جلد ۵، ص ۴۸۶ (کتاب البر و الصلة و الآداب، باب فضل الإحسان للبنات)

۱۲۔ مسند الامام احمد بن حنبل، جلد ۳، ص ۱۴۸

۱۳۔ عون المعبود شرح سنن ابی داؤد، جلد ۱۴، ص ۵۵

۱۴۔ صحیح مسلم (شرح النووی)، جلد ۵، ص ۴۸۶

چھٹاباب

عورتوں کے لیے تعلیم کا حق

اسلام میں علم دین کی اہمیت بہت بلند ہے۔ علم کا حصول ہر مسلمان مرد و عورت پر فرض ہے۔ اسلام حصول علم پر ابھارتا ہے اور علماء کی قدر و منزلت کو بلند کرتے ہوئے معاشرہ میں ان کے لیے عظیم الشان مقام و مرتبہ کا اعلان کرتا ہے، لہٰذا اس سے حیرت نہیں ہونی چاہیے کہ قرآن کی بہت سی آیات میں اہل علم کی تعریف کی گئی ہے۔ علم اور اہل علم کی بلند قدر و منزلت قرآن کی مندرجہ ذیل آیات سے بالکل واضح ہو جاتی ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:"یرفع اللہ الذین آمنوا منکم و الذین أوتوا العلم درجات" (المجادلۃ/۱۱) (ترجمہ: اللہ تعالیٰ تم میں سے ان لوگوں کے جو ایمان لائے ہیں اور جو علم دیئے گئے ہیں، درجے بلند کردے گا)

عالم کو غیر عالم پر جو فضیلت حاصل ہے، اللہ تعالیٰ نے اسے بھی کھول کر بیان کر دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:"قل ھل یستوی الذین یعلمون و الذین لا یعلمون إنما یتذکر أولوا الألباب" (الزمر/۹) (ترجمہ: بتاؤ تو علم والے اور بے علم کیا برابر کے ہیں؟ یقیناً نصیحت وہی حاصل کرتے ہیں جو عقلمند ہوں) اسی طرح اللہ تعالیٰ نے علماء کی شہادت کو اپنی اور فرشتوں کی شہادت سے جوڑ دیا ہے، یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے علماء کا تزکیہ ہے اور ان کے ثقہ و عادل ہونے کی گواہی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کے ذریعہ علماء کی شان کو بلند کیا ہے اور ان کے فضل کا اعتراف کیا ہے۔ ارشاد ہے:"شھد اللہ أنہ لا إلہ إلا ھو و الملائکۃ و أولوا العلم قائما بالقسط لا إلہ إلا ھو العزیز الحکیم" (آل عمران/۱۸) (ترجمہ: اللہ تعالیٰ، فرشتے اور اہل علم اس بات کی گواہی دیتے ہیں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور وہ عدل کو قائم رکھنے والا ہے، اس غالب اور حکمت والے کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں ہے)

آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر قرآن کی جو پہلی آیت نازل ہوئی اس میں بھی علم کی اہمیت پر زور دیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:"اقرأ باسم ربک الذی خلق خلق الإنسان من علق إقرأ و ربک الأکرم الذی علم بالقلم علم الإنسان ما لم یعلم" (العلق/۱-۵) (ترجمہ: پڑھ اپنے رب کے نام سے جس نے پیدا کیا، جس نے انسان کو خون کے لوتھڑے سے پیدا کیا، تو پڑھتا رہ تیرا رب بڑے کرم والا ہے جس نے قلم کے ذریعہ علم سکھایا جس نے انسان کو وہ سکھایا جسے وہ نہیں جانتا تھا)

یہ اولین آیات اس لیے نازل ہوئیں تاکہ اس دین کے نقوش واضح ہو جائیں جس کی بنیاد علم پر ہے اور دنیا یہ جان لے کہ اسلام میں علم کو اولین اور بلند مقام حاصل ہے۔ چنانچہ وحی الٰہی جو انسانوں کے لیے دائمی دستور حیات ہے، اس کا پہلا کلمہ جسے جبریل نے اپنی زبان سے ادا کیا وہ "إقرأ" ہے یعنی پڑھو۔ یہ قرأت (پڑھنا) علم کی کنجی ہے۔ چونکہ کتابت (لکھنا) قرأت کی تکمیل کرنے والی ہے اور اسی پر علم کی بنیاد کھڑی ہوتی ہے اس لیے اللہ تعالیٰ نے "علم بالقلم" کہہ کر کتابت کی طرف اشارہ کر دیا۔ قلم ہر زمانہ میں علم کی حفاظت اور دوسروں تک اس کی منتقلی کا اہم ہتھیار اور انسانی زندگی پر سب سے گہرا اور وسیع اثر ڈالنے والا تعلیمی ذریعہ و وسیلہ رہا ہے اور آگے بھی اس کی یہی اہمیت باقی رہے گی[۱]۔ قرأت و کتابت ہی وہ عمل ہے جس کے ذریعہ انسان علم کی دولت کو اپنے دامن میں سمیٹتا ہے۔ یہ علم انسانوں کے خالق و مالک کے ذریعہ اسے سکھایا گیا ہے۔ اسی نے انسانوں کو عقل اور حواس خمسہ عطا کیا ہے جس کے ذریعہ وہ حصول علم پر قادر ہوتا ہے۔

"دین" سے متعلق آیت میں کتابت کا بھی تذکرہ آیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "يا أيها الذين آمنوا إذا تداينتم بدين إلى أجل مسمى فاكتبوه و ليكتب بينكم كاتب بالعدل و لا يأب كاتب أن يكتب كما علمه الله فليكتب۔۔۔إلى آخر الآية" (البقرہ/۲۸۲) (ترجمہ: اے ایمان والو! جب تم آپس میں ایک دوسرے سے میعاد مقرر پر قرض کا معاملہ کرو تو اسے لکھ لیا کرو اور لکھنے والے کو چاہیے کہ تمہارا آپس کا معاملہ عدل سے لکھے، کاتب کو چاہیے کہ لکھنے سے انکار نہ کرے جیسے اللہ تعالیٰ نے اسے سکھایا ہے۔۔۔)

اوپر کی آیت لکھنے کے علم کو حاصل کرنے کی اہمیت کو تاکیدی طور پر اجاگر کرتی ہے۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ ہمیں لکھنے کا حکم دے رہا ہے "اسے لکھ لو"، "ایک لکھنے والا اسے لکھ دے"، "اس لیے انہیں اسے لکھ لینا چاہیے"۔ آیت میں لکھنے والے کاتب کی اہمیت کو بھی اجاگر کیا گیا ہے۔ ایک ہی آیت میں دو مرتبہ کاتب کا تذکرہ آیا ہے "ایک کاتب اسے لکھ دے"، "کسی کاتب کو لکھنے سے انکار نہیں کرنا چاہیے"۔ لکھنے کا علم بھی اللہ تعالیٰ کا عطا کردہ تحفہ اور عطیہ ہے۔

اللہ تعالیٰ نے ہمیں یہ حکم دیا ہے کہ ہم اپنے قرضہ جات کی تفصیلات اور معاہدوں کو تحریری شکل میں محفوظ کیا کریں، اسی وجہ سے لکھنے کا علم سیکھنا ضروری ہے اور جو لوگ لکھنا اور پڑھنا جانتے ہوں ان کی ہمارے معاشرہ میں ضرورت ہر ضرورت سے بڑھ کر ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت سے ہمیں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے بدر کے ہر قیدی کا فدیہ دس مسلمانوں کو لکھنا پڑھنا سکھانا مقرر کیا تھا[۲]۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد بھی ہے کہ "حصول علم ہر مسلمان پر فرض ہے"[۳]۔ اس حدیث میں مذکور لفظ "مسلم" مرد و عورت دونوں کو شامل ہے۔ علماء کا اس پر اتفاق ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ہر عمومی حکم مسلمان مرد و عورت دونوں کے لیے

ہے ۴۔ مکلف ہونے کے معاملہ میں مرد و عورت دونوں برابر ہیں۔ مرد کے ساتھ ساتھ عورت کو بھی اس بات کا مکلف بنایا گیا ہے کہ وہ نماز پڑھے، روزہ رکھے، زکاۃ ادا کرے، حج کرے، اپنے عقیدہ کی اصلاح کرے، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی ذمہ داری ادا کرے، نیک کام کرنے میں دوسرے کے ساتھ سبقت کرے۔ قرآن و سنت کا ہر وہ عمومی حکم جو مسلمانوں کے لیے آیا ہے اس کی تعمیل کے لیے مرد کے ساتھ عورت بھی مکلف ہے۔ مسلمان عورت اس بات کی بھی مکلف ہے کہ وہ اپنے حقوق وواجبات کو جانے اور دین کے جس حکم کا اسے علم ہو جائے اس پر عمل کرے اور دوسروں کو اسلام کی تعلیمات سے روشناس کرانے کی کوشش کرے۔ جب یہ بات تسلیم شدہ ہے کہ اسلام عبادت، قیادت، سیاست، معاشرت، اقتصاد اور زندگی کے مختلف میدانوں میں حرکت ونشاط کا نام ہے تو پھر کسی انسان کو ان ساری چیزوں کا علم خود بخود نہیں ہو سکتا ہے، اس کے لیے تعلیم و تعلم اور حصول علم کا نظام ضروری ہے۔ اسلام ایک وسیع، جامع، عمیق اور متنوع علم و آگہی کا نام ہے ۵۔

علاوہ ازیں عورتیں معاشرہ کے نصف حصہ کی نمائندگی کرتی ہیں۔ اسی وجہ سے وہ مردوں کے ساتھ مل کر معاشرہ کی تعمیر و تشکیل کی ذمہ داری ادا کرتی ہیں۔ عورتوں کی انفرادی اور اجتماعی ذمہ داریاں بھی ہیں جن کی بہتر طور پر ادائیگی کے لیے اچھی تعلیم اور وافر مقدار میں علم و آگہی ضروری ہے۔ تبھی وہ اپنی انفرادی ذمہ داری کو ادا کرنے کے ساتھ ایک ابھرتے ہوئے اسلامی معاشرہ میں اپنا صحیح کردار ادا کر سکتی ہیں ۶۔ عورتوں کا تعلیم یافتہ ہونا معاشرہ کی اہم ترین ضرورت ہے کیونکہ وہ معاشرہ کو اچھے افراد مہیا کرنے کا ذریعہ ہے۔ ماں کی گود بچے کے لیے وہ پہلی تربیت گاہ ہے جہاں وہ انسانیت کی بنیادی باتیں اور اخلاقیات کی بنیادی تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ عورت معاشرہ کو یا تو اچھے افراد فراہم کرتی ہے یا برے افراد مہیا کراتی ہے۔ حافظ ابراہیم رحمہ اللہ نے ان خیالات کی سچی ترجمانی کی ہے:

من لی بتربیة البنات فإنها　　فی الشرق علة ذلک الإخفاق

الأم مدرسة إذا أعددتها　　أعددت شعبا طیب الأعراق

الأم روض إن تعهده الحیا　　بالری أورق أیما إیراق

أنا لا أقول دعو النساء سوا فراً　　بین الرجال یجلن فی الأسواق

ربوّ البنات علی الفضیلة إنها　　فی الموقفین لهن خیر وثاق ۷

کون ہے جو میرے لیے بیٹیوں کی تربیت کرے گا۔ مشرق میں جو ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا ہے اس کا سبب یہی بیٹیوں کا غیر تعلیم یافتہ ہونا ہے۔

ماں ایک تعلیم گاہ ہے، جب تم اسے اس معیار کے مطابق تیار کروگے توتم اس کے ذریعہ اعلیٰ نسل کی ایک قوم کو تیار کر سکوگے۔

ماں پھولوں کی ایک کیاری ہے۔ اگر اس کیاری کو حیا سے سیر اب کر دیا گیا تو اس سے جو پھول پتیاں ظاہر ہوں گی وہ لاجواب ہوں گی۔

میں یہ نہیں کہتا کہ عورتوں کو مردوں کے درمیان بے پردہ چھوڑ دو کہ وہ بازاروں میں مٹر گشتیاں کرتی پھریں۔

تم بیٹیوں کو عمدہ اخلاق کی تربیت دو، ہر دو حالت میں یہ ان کے لیے بہترین سہارا ہو گا۔

اسی ضمن میں شاعر معروف رصافی نے بھی عمدہ بات کہی ہے:

هى الأخلاق تنبت كالنبات　　إذا سقيت بماء المكرمات

تقوم إذا تعهدها المربى　　على ساق الفضيلة مثمرات

و لم أر للخلائق من محل　　يهذبها كحضن الأمهات

فحضن الأم مدرسة تسامت　　بتربية البنين أو البنات

و هل يرجى لأطفال كمال　　إذا نشأوا بحضن الجاهلات

أليس العلم فى الإسلام فرضاً　　على أبناءه و على البنات

و كانت أمنا فى العلم بحرا　　تحل لسائليها المشكلات

و علمها النبى أجل علم　　فكانت من أجل العالمات

اخلاق پودوں کی طرح اگتا ہے جب اسے شرافت کے پانی سے سیر اب کیا جاتا ہے۔

جب مربی اس کی خبر گیری کرتا ہے تو یہ پھلدار بن کر فضیلت کے تنے پر کھڑا ہو جاتا ہے۔

میں نے مخلوقات کے لیے ماں کی گود جیسی کوئی جگہ نہیں دیکھی جو اسے تہذیب و شائستگی سے آراستہ کر سکتی ہے۔

ماں کی گود ایک تعلیم گاہ ہے، بیٹوں اور بیٹیوں کی عمدہ تربیت کرنے کی وجہ سے اس نے بلندی کو چھو لیا ہے۔

کیا ان بچوں کے لیے فضل و کمال کی امید کی جاسکتی ہے جبکہ وہ جاہل ماؤں کی گود میں پرورش پائے ہوں۔

کیا اسلام میں بیٹے اور بیٹیوں سب پر حصول علم فرض نہیں ہے۔

ہماری ماں علم میں سمندر تھی جو مسائل دریافت کرنے والوں کی مشکلات کو حل کرتی تھیں۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں اعلیٰ و افضل علم سکھایا تھا تو وہ اعلیٰ و افضل عالمہ بن کر سامنے آئیں۔

اسلام کے اولین دور کی مسلم خواتین نے تعلیم کی اہمیت و فضیلت کو سمجھا۔ چنانچہ وہ علم دین کے جاری سرچشمہ سے سیراب ہونے لگیں اور اس میدان میں ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کرنے لگیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کے لیے ان کی ہمت افزائی فرماتے تھے اور انہیں علم سیکھنے کی مجلسوں میں حاضر ہونے کی اجازت دیتے تھے۔ ایسا کیونکر نہ ہوتا جبکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو آپ کے رب نے علم میں اضافہ کے لیے یہ دعا سکھائی تھی "و قل رب زدنی علما" (طہ /۱۱۱) (ترجمہ: آپ کہیے کہ اے میرے رب! میرے علم میں اضافہ فرما)

مسلم خواتین نے زبان نبوت سے یہ حدیث بھی سنی تھی: "اللہ تعالیٰ جس کے ساتھ خیر کا ارادہ فرماتا ہے اسے دین کا گہرا فہم عطا کرتا ہے"۸۔ انہیں یہ بات سمجھ آگئی تھی کہ مردوں کے ساتھ انہیں بھی دین کا علم حاصل کرنے کا حق ہے۔ یہ میدان صرف مردوں کے لیے خاص نہیں ہے جیسا کہ کچھ لوگوں کا گمان ہے، اسی لیے مسلم خواتین بھی دین کا گہرا علم حاصل کرنے لگیں اور خیر کے کاموں میں ایک دوسرے سے مقابلہ آرائی کرنے لگیں۔ اسی تعلق سے عائشہ رضی اللہ عنہا نے یہ بات کہی ہے: "انصار کی عورتیں سب سے اچھی ہیں۔ دین کا گہرا علم حاصل کرنے میں شرو حیاء ان کے لیے رکاوٹ نہیں بنی"۔۹

مسلم خواتین کی علم کی مجلسوں میں پابندی کے ساتھ شریک ہوتی رہیں، ان علمی مجلسوں میں وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مختلف طرح کے علمی سوالات بھی پوچھتی تھیں، بعض عام قسم کے سوالات ہوتے تھے اور بعض سوالات صرف عورتوں کے مخصوص مسائل سے تعلق رکھتے تھے۔ ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ کچھ مسلمان خواتین نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا: آپ سے علم سیکھنے کے معاملہ میں مرد ہم پر غالب آگئے، آپ اپنی طرف سے ہم لوگوں کے لیے ایک دن خاص کر دیں۔ آپ نے ان سے

ہفتہ میں ایک دن کا وعدہ کر لیا، آپ اس دن ان خواتین سے ملتے، انہیں وعظ و نصیحت کرتے اور دین کے احکامات سے انہیں آگاہ کرتے تھے۔ آپ نے ایک دن انہیں تعلیم دیتے ہوئے فرمایا: "تم میں سے جو عورت اپنے تین بچوں کو آگے بھیجے گی وہ اس کے لیے جہنم کی آگ سے رکاوٹ بن جائیں گے۔ ایک خاتون نے دریافت کیا: اگر کسی کے دو بچے فوت ہوئے تو اس کا کیا حکم ہے؟ آپ نے فرمایا: جس کے دو بچے اس کی زندگی میں فوت ہوئے اور اس نے اس مصیبت پر صبر کر لیا تو اس کے لیے بھی یہی انعام ہے"۔ ۱۰؎

اس طرح رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حصول علم کے لیے عورتوں کے ساتھ نرمی اور توجہ کا معاملہ کیا اور اس کے لیے ان کی ہمت افزائی کرتے ہوئے ان سے ایک دن خاص کرنے کا وعدہ کیا، ان کے پاس تشریف لائے اور انہیں دین کی وہ باتیں سکھائیں جو ان کے لیے نفع بخش تھیں۔ اسلام میں مطلوب یہ ہے کہ مرد و عورت دونوں دین کا علم حاصل کریں۔ اسلام کی ایک اور خوبی قابل ذکر ہے کہ اسلام نے حصول علم کو صرف آزاد مرد و عورت کے لیے خاص نہیں کیا ہے۔ بلکہ اس نے مسلمانوں کو غلام و باندی کو بھی تعلیم سے آراستہ کرنے پر ابھارا ہے اور اس فضل و شرف کے حصول کے معاملہ میں اسے نظر انداز نہیں کیا ہے۔ حدیث شریف میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد منقول ہے: "جس شخص کے پاس کوئی باندی ہو، پھر اس نے اسے اچھی تعلیم دی اور ادب و اخلاق سے آراستہ کیا، پھر اسے آزاد کر کے اس سے شادی کر لی تو اس شخص کے لیے دوہرا اجر ہے" ۱۱؎۔ اسی مفہوم کی ایک دوسری حدیث میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: "جس شخص کی کوئی باندی ہو، اس نے اسے علم سکھایا اور حسن سلوک کیا پھر اسے آزاد کر کے اس سے شادی کر لی تو اس کے لیے دوہرا اجر ہے"۔ ۱۲؎

صحابیات رضی اللہ عنہن ایک جگہ جمع ہوتی تھیں اور زبان رسالت سے علم دین کو سن کر حاصل کرتی تھیں۔ وہ مسجد آکر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ باجماعت نماز ادا کرتی تھیں، حالانکہ انہیں یہ معلوم تھا کہ ایک مسلمان عورت کا گھر میں نماز پڑھنا مسجد میں نماز ادا کرنے سے بہتر ہے۔ اس کے باوجود وہ مسجد صرف اس لیے آتی تھیں تاکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے نکلنے والے دینی احکامات ان کے کانوں تک پہنچیں۔

دینی تعلیم کو حاصل کرنے، احادیث نبویہ کو یاد کرنے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حوالہ سے ان احادیث کو دوسروں تک پہنچانے کے معاملہ میں سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی جو فضیلت ہے اس سے تاریخ و سیر کی کتابیں بھری پڑی ہیں۔ عطاء بن ابی رباح کا قول ہے: "عائشہ رضی اللہ عنہا سب سے بڑی فقیہ، سب سے بڑی عالمہ اور عوامی مسائل میں سب سے بہترین رائے دینے والی تھیں"۔ زہری کا قول ہے: "اگر عائشہ رضی اللہ عنہا

کا سارا علم جمع کیا جائے اور اس کے ساتھ تمام امہات المومنین اور دیگر تمام صحابیات کا علم جمع کیا جائے تو عائشہ رضی اللہ عنہا کا علم افضل و برتر ہوگا"۔ ہشام بن عروہ اپنے والد کا قول نقل کرتے ہیں: "میں نے عائشہ رضی اللہ عنہا سے بڑا فقیہ، طب اور شاعری کا کوئی عالم نہیں دیکھا"۔ ۱۳

اسلام کے اس اولین دور کی خواتین نے کتابت (لکھنا) سیکھنے میں بھی غیر معمولی دلچسپی کا مظاہرہ کیا۔ روایت میں یہ آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مرضی سے ہجرت کرنے والی خاتون شفاء بنت عبد اللہ قریشیہ عدویہ نے ام المومنین حفصہ رضی اللہ عنہا کو لکھنا سکھایا۔ ۱۴

مسلم خواتین نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بلاواسطہ احادیث کی روایت کرنے میں بھی اپنی حصہ داری ادا کی ہے۔ اس لیے کہ علماء حدیث کے نزدیک حدیث کی روایت کے لیے مرد ہونا شرط نہیں ہے۔ محدثین کے یہاں روایت حدیث کے لیے صرف عقل، ضبط، عدالت اور اسلام کی شرط ہے۔ اگر یہ چار شرطیں کسی انسان کے اندر موجود ہوں تو اس کی روایت قابل قبول ہوگی، اگرچہ روایت کرنے والی کوئی عورت ہی کیوں نہ ہو۔

حدیث کی کتابیں خواتین محدثات اور راویات حدیث کے ناموں سے بھری ہوئی ہیں۔ ان میں صحابیات بھی ہیں اور تابعیات بھی۔ بعض علماء نے اپنی کتابوں میں خواتین کی روایتوں کے لیے علاحدہ اجزاء خاص کئے ہیں، مثلاً ابن سعد کی "الطبقات"، "الإصابة في تمييز الصحابة" اور "أسد الغابة في معرفة الصحابة" میں۔

پچھلی چند صدیوں میں عورتیں حصول علم سے محروم تھیں جس کی وجہ سے عورتوں کے درمیان ناخواندگی اور جہالت میں زبردست اضافہ ہوا۔ گزشتہ پچیس سالوں سے یہ صورت حال تبدیل ہونی شروع ہوئی ہے۔ پہلے باپ اپنی بیٹیوں کو لکھنے پڑھنے سے روکتے تھے۔ لڑکیوں کو گھر کے کاموں تک محدود رکھا جاتا تھا۔ کوئی باپ اگر اپنی بیٹی کو تعلیم دلانا چاہتا تو وہ اسے صرف پڑھنا سیکھنے کی اجازت دیتا تھا، اس لیے کہ ان کا ایسا ماننا تھا کہ لکھنا سیکھنا عورتوں کے لیے ممنوع ہے۔ ایک باپ اپنی بیٹی کو کسی معلم کے حوالہ تبھی کرتا تھا جب وہ اس کی یقین دہانی کراتا کہ اس کی لڑکی کو لکھنا نہیں سکھائے گا۔ اس سلسلہ میں کچھ لوگوں کا یہ خیال تھا کہ اسلام نے عورتوں کو دینی و دنیوی دونوں طرح کی تعلیم حاصل کرنے سے منع کیا ہے۔ ان لوگوں نے اسلام پر یہ جھوٹی تہمت لگا رکھی تھی کہ اسلام نے عورتوں کے لیے لکھنا پڑھنا حرام قرار دیا ہے۔ اس کے لیے وہ ایک جھوٹی حدیث کا سہارا بھی لیتے تھے جس میں آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "تم اپنی بیٹیوں کو کمروں میں سکونت اختیار کرنے کی اجازت نہ دو اور نہ انہیں لکھنا سکھاؤ"۔ حال ہی میں علماء نے اور محققین نے اس کی توثیق کی ہے کہ

لڑکیوں کو لکھنا پڑھنا سکھانے سے روکنے والی روایت پوری طرح من گھڑت ہے، یہ روایت ناقابل اعتبار ثابت ہو چکی ہے۔ اب اس سے استدلال کرنا صحیح نہیں ہے۔

صحیح یہ ہے کہ مرد کی طرح عورت کو بھی لکھنا پڑھنا سیکھنے کا حق ہے اور دین، اخلاق، اصول صحت، تدبیر خانہ، بچوں کی تربیت، علوم وفنون، صحیح عقائد، تفسیر، سیرت، تاریخ، حدیث، فقہ وغیرہ کے موضوع پر لکھی گئی کتابوں کا مطالعہ کرنے کا اسے حق ہے۔ ان کتابوں کا مطالعہ عورتوں کے لیے بہت مفید ہے۔ اس کے ذریعہ انہیں جہالت کی تاریکی سے علم و آگہی کی روشنی کی طرف نکل کر آنے کا موقع ملے گا۔ کوئی عقلمند انسان اس کی افادیت کا انکار نہیں کر سکتا ہے۔ لیکن اسی کے ساتھ ایک مسلم خاتون کو شرم وحیاء اور اپنی عزت و آبرو کی حفاظت کا لحاظ رکھنا بھی ضروری ہے اور اجنبی مردوں کے ساتھ اختلاط سے بچنے کی بھی تاکید ہے۔ صحابۂ کرام اور تابعین عظام کی خواتین نے ان سارے علوم وفنون کو بھرپور طور پر حاصل کیا، ان میں مشہور محدثات اور فقیہات پیدا ہوئیں۔ علوم وفنون کے میدان میں خواتین کی خدمات کے موضوع پر علماء کی مؤلفات بھی ہیں جن کا تذکرہ اس مختصر کتاب میں ممکن نہیں ہے، یہاں تک کہ جب شام و عراق سے خوشنما خطاطی میں لکھے ہوئے مصاحف آئے تو ان میں سے بعض خواتین کی خطاطی کا نمونہ تھے۔ ان میں سے بہت ساری خواتین فطری فصاحت وبلاغت میں بھی شہرت یافتہ ہوئی ہیں۔ [۱۵]

اسی کے ساتھ مسلم خواتین کو کن علوم کو حاصل کرنا چاہیے، اس معاملہ میں علماء دو گروہوں میں تقسیم نظر آتے ہیں:

ایک گروہ خواتین کی تعلیم کو ضروری دینی امور میں محدود کرتا ہے، ان کے نزدیک دینی علوم کے ساتھ وہ گھر کے نظم وضبط اور ایک ماں ہونے کی حیثیت سے اس کی جو اصل ذمہ داری ہے اسی سے متعلق علوم کو حاصل کرے۔ اس کے لیے علم کیمیاء، طبیعات، ریاضیات اور انجینئرنگ وغیرہ کو سیکھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ مصر میں عورتوں کی تعلیم کے تعلق سے اسی طرح کی صورت حال پیدا ہوئی۔ بہت سے اہل علم نے اس کے لیے آواز بلند کی جن میں سے ایک ہاشم ابراہیم بھی تھے۔ ان کا یہ کہنا تھا کہ ایک نوجوان مسلم خاتون کی اصل جگہ اس کا گھر ہے، اس لیے اسے ایسے علوم وفنون سے آراستہ کیا جائے جو اسے اس کی نسوانیت کے دائرہ سے باہر نہ کر دے، اسے ایسی تعلیم دی جائے جو اس کے لیے ایک ہوشمند خاتون خانہ بننے میں معاون ہو، اس لیے عورتوں کے لیے خانگی امور سے متعلق تعلیم ہی ضروری ہے۔ [۱۶]

دوسرے گروہ کی رائے یہ ہے کہ عورتوں کو ہر طرح کی تعلیم حاصل کرنی چاہیے، اسے کسی استثناء کے بغیر دنیا کے تمام علوم وفنون کی جانکاری ہونی چاہیے، اگرچہ بعض مضامین اس کی فطرت، اس کی جسمانی ساخت اور معاشرہ میں اس کے بنیادی کردار کے برخلاف ہی کیوں نہ ہوں۔ اس گروہ میں نام نہاد حریت نسواں کی تحریک کے علمبردار بھی شامل رہے ہیں جن میں سرفہرست قاسم امین کا نام آتا ہے۔

تعلیم نسواں کے تعلق سے دونوں نقطۂ نظر میں کچھ نہ کچھ خامیاں ہیں۔ پہلے نقطۂ نظر کے رد میں ہمارا یہ کہنا ہے کہ عورت کو تمام علوم کی مبادیات کو سیکھنے کی ضرورت ہے تاکہ دنیا میں اس کے آس پاس جو کچھ پیش آ رہا ہے اس سے اسے مکمل واقفیت ہو۔ تمام رائج علوم کی مبادیات کو جاننے کی وجہ سے اسے زندگی کے میدان میں درپیش مسائل کو حل کرنے میں مدد ملے گی۔ مثال کے طور پر اگر وہ تمام علوم کی مبادیات سے واقف ہوگی تو سب سے پہلے وہ اس کے ذریعہ اپنے بچوں کو فائدہ پہنچائے گی، وہ اپنے بچوں کو اسکول کے اسباق یاد کرائے گی اور ان کے ہوم ورک کو کرنے میں ان کی رہنمائی کرے گی۔ عام طور پر گھروں کے اندر مائیں ہی بچوں سے متعلق اس ذمہ داری کو انجام دیتی ہیں، کیونکہ باپ عام طور پر ملازمت یا تجارت کے سلسلہ میں گھر سے باہر ہی رہتا ہے۔

دوسرے نقطۂ نظر کے رد میں ہمارا یہ کہنا ہے کہ پلاننگ اور منصوبہ بندی کے بغیر عورتوں کا تمام علوم کو پڑھنے کی طرف متوجہ ہونا، خاص طور پر ان علوم کو جو ان کی تخلیق، جسمانی ساخت اور سماجی ذمہ داریوں سے ہم آہنگ بھی نہیں ہیں، وقت اور محنت کی بربادی ہے، کیونکہ اس طرح کی بے مقصد تعلیم کا کوئی فائدہ حاصل نہیں ہو سکتا ہے۔ اس کی وجہ سے اس کے گھر، خاندان اور اس کے خالق کے تئیں اس کی جو ذمہ داریاں ہیں اسے ادا کرنے میں کوتاہیاں ہوں گی۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: "عورت اپنے شوہر کے گھر میں نگراں ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک اپنے ماتحتوں کے بارے میں جواب دہ ہے"۔ [۱۷]

اس زیر بحث مسئلہ کا حل دونوں نقطہائے نظر کے درمیان بیچ کی راہ ہے۔ اسلام نے کسی بھی مفید علم کو حاصل کرنے کی راہ کو مسدود نہیں کیا ہے۔ اس کے برخلاف اسلام نے عورتوں کو لامحدود علم حاصل کرنے کا حق دیا ہے۔ اسلام نے عورتوں کو کسی چیز کا انتخاب کرنے اور فیصلہ لینے کا بھی حق دیا ہے۔ اب یہ اس کی ذمہ داری ہے کہ وہ صحیح چیز کا انتخاب کرے جو اس کی فطری تخلیق، جسمانی ساخت اور معاشرہ میں اس کے فطری کردار کے موافق ہو۔ اس کا یہ انتخاب کسی بھی حال میں ایک ماں اور ایک بیوی کی حیثیت سے اس کا جو کردار ہے اس سے اسے دور کرنے والا نہیں ہونا چاہیے۔ ان حقائق کے پیش نظر مرد وعورت دونوں کے لیے ایک حسب

حال نصاب تعلیم ہونا چاہیے جس میں ان تخصصات اور مہارتوں کا خیال رکھا جانا چاہیے جو دونوں صنفوں کے لیے مناسب ہوں تاکہ وہ تعلیم ان دونوں کو زندگی کی ذمہ داریوں کو بہتر طور پر ادا کرنے کا اہل بنا سکے۔

اسی لیے فقہاء نے کہا ہے کہ عورتوں کے لیے دو طرح کی تعلیم کا حصول ضروری ہے:

۱۔ ایک وہ تعلیم جس کا حصول اس کے لیے فرض عین ہے، اس سے مراد وہ تعلیم ہے جس سے اس کی عبادات، عقیدے اور اخلاق و کردار کی اصلاح ہو سکے اور جس کے ذریعہ وہ اپنے گھر کے نظم و نسق اور اپنے بچوں کی تربیت بطریق احسن کر سکے۔

۲۔ دوسری تعلیم اس کے لیے فرض کفایہ ہے، یعنی وہ تعلیم جس کی مسلم معاشرہ کو ضرورت ہو مثلاً خاتون ڈاکٹرز، خاتون نرس اور خاتون ٹیچرز؛ اگر مسلمانوں کو بچوں اور عورتوں کے علاج کے لیے خاتون ڈاکٹروں کی ضرورت ہو، یا انہیں مریض عورتوں کی دیکھ بھال کے لیے خاتون نرسوں کی ضرورت ہو یا نوجوان لڑکیوں کو تعلیم دینے کے لیے خاتون اساتذہ کی ضرورت ہو تو پھر عورتوں کی صفوں میں ڈاکٹرز، نرسیں اور ٹیچرز تیار کرنا ضروری ہو گا۔ اور اس صورت حال میں عورتوں کے لیے ان علوم کو پڑھنا واجب ہو گا۔

آج کے دور میں جسے غلط طور پر علم کا نام دیا جاتا ہے، مثلاً رقص، موسیقی اور پتھروں کو تراش کر مجسمے بنانے کا علم وغیرہ جسے آج کی کافر و فاجر قوموں نے علوم کا نام دے دیا ہے، یہ کسی بھی طرح سے علم کے دائرہ میں نہیں آتا ہے بلکہ یہ عین باطل پرستی ہے، مسلمان عورتوں کو ان علوم سے دور رہنا چاہیے، اس لیے کہ یہ اسلامی و انسانی اقدار و اصول کے بھی منافی ہے۔

حواشی:

۱۔ فی ظلال القرآن، مؤلفہ سید قطب، جلد ۶، ص ۳۹۳۲

۲۔ الرحیق المختوم، مؤلفہ صفی الرحمٰن مبارکپوری، ص ۲۵۶

۳۔ سنن ابن ماجہ، جلد ۱، ص ۸۰

۴۔ حقوق النساء فی الإسلام، مؤلفہ رشید رضا، ص ۱۸

۵۔ المرأة فی التصور الإسلامی، مؤلفہ عبد المتعال الجبری، ص ۵۸

٦۔ **حوالہ سابق**

٧۔ استاذ المرأة، **مؤلفہ الشیخ محمد البجانی، ص ٦٣**

٨۔ **صحیح البخاری، جلد ٢، ص ٤١ تا ٤٨** (باب القول و العمل)

٩۔ **صحیح البخاری، جلد ١، ص ٤١** (باب الحیاء فی العلم)

١٠۔ **صحیح البخاری، جلد ١، ص ٣٤** (کتاب العلم، باب هل یجعل للنساء یوماً علی حدة فی العلم)

١١۔ **صحیح البخاری، جلد ٩، ص ١٢٦** (کتاب النکاح، باب اتخاذ السراری و من أعتق جاریة ثم تزوجها)

١٢۔ **صحیح البخاری، جلد ٥، ص ١٧٣** (کتاب العتق، باب فضل من أدّب جاریته و علّمها)

١٣۔ الإصابة فی تمییز الصحابة، **مؤلفہ ابن حجر عسقلانی، جلد ٤، ص ٣٦٠**

١٤۔ الإصابة فی تمییز الصحابة، **مؤلفہ ابن حجر عسقلانی، جلد ٤، ص ٣٤١**

١٥۔ منع الاختلاط، **مؤلفہ شیخ عبداللہ بن زید آل محمود**

١٦۔ الحرکة النسائیة، **مؤلفہ دکتورہ اجلال خلیفہ، ص ١١٤**

١٧۔ **صحیح البخاری، جلد ٥، ص ١٨١** (کتاب العتق، باب العبد راع فی مال سیده)

ساتواں باب:

اپنے شوہر کے انتخاب کا حق

اسلام نے عورتوں کو شان و شوکت عطا کیا ہے، انہیں شوہر کے انتخاب کا حق دیا ہے، ان کے حقوق کو بحال کیا ہے اور کافی حد تک انہیں شوہر کے انتخاب کا حق دیا ہے، چنانچہ ہر عورت کو اپنے منگیتر کو قبول کرنے یا ٹھکرانے کا کامل حق دیا گیا ہے، یہ بات حقیقت پر مبنی ہے کہ آج سے چند سالوں قبل عورتوں کو اپنے شوہر کے ہاتھوں بازار کے سامان کی مانند فروخت کیا جاتا تھا، نہ تو ان سے مشورہ طلب کیا جاتا تھا نہ انہیں اطلاع بہم پہنچائی جاتی تھی کہ ان کی شادی فلاں شخص سے کر دی گئی ہے۔

لیکن واضح اسلامی تعلیمات کے باوجود آج بھی بہت سارے باپ اپنی بیٹیوں کو شادی پر مجبور کرتے ہیں، اور یہ بات انہی لوگوں کے ساتھ خاص نہیں ہے جو دور دراز اور دیہاتی علاقوں میں رہتے ہیں، بلکہ ایسا شہری علاقوں میں بھی ہوتا ہے، اگر ایک بالغ اور نوجوان لڑکی صدائے احتجاج بلند کرتی ہے اور اپنے فطری حقوق کا دفاع کرتی ہے، تو اس پر گستاخی، شوخی، نافرمانی اور اپنے معاشرے اور اس کے رسم و رواج اور قانون کی توہین کا الزام عائد کیا جاتا ہے، کسی بھی عورت کو اس کی مرضی کے بغیر شادی پر مجبور کرنا اسلامی تعلیمات کی خلاف ورزی ہے اور نبی ﷺ کے ارشادات کی مخالفت اور ان کے حدود سے تجاوز کرنا ہے، چنانچہ آپ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے: "ایک بیوہ عورت کی شادی اس کے مشورہ کے بغیر اور ایک کنواری لڑکی کی شادی اس کی اجازت کے بغیر نہ کی جائے"، صحابہ کرام نے دریافت کیا: "اے اللہ کے رسول ہمیں کنواری لڑکی کی اجازت کی کیفیت کیسے معلوم ہوگی؟ آپ نے فرمایا، اس کی خاموشی ہی اس کی اجازت پر دلالت کرتی ہے" (صحیح بخاری: ج، 6، ص 135)

حضرت عائشہؓ نے اس بات کو بایں طور بیان کیا ہے، کہتی ہیں کہ: "اے اللہ کے رسول ﷺ، کنواری لڑکی شرماتی ہے، تو اس پر آپؐ نے کہا کہ اس کی رضامندی اس کی خاموشی میں مضمر ہے" (حوالہ سابق: صحیح بخاری)

(شوہر دیدہ) سے مراد وہ عورت ہے جو طلاق یافتہ ہو یا پھر اس کا شوہر انتقال کر گیا ہو، اور اس سے مشورہ لینے کا مطلب یہ ہے کہ اس کی اجازت طلب کی جائے، کیونکہ اس کے بغیر شادی ناجائز اور غیر درست

ہے، اور "باکرہ" سے مراد وہ کنواری لڑکی ہے جس کی اب تک شادی نہ ہوئی ہو، اس کی بھی شادی اس کی مرضی اور اجازت کے بغیر مناسب نہیں ہے، اگر وہ لب کشائی نہیں کرتی ہے، یا پھر شرم و حیا کے پیش نظر اگر رضامندی ظاہر نہیں کرتی ہے تو پھر اس کی خاموشی بھی رضامندی تسلیم کی جائے گی اور یہ کافی ہو گی۔

عبد اللہ بن عباسؓ نے اللہ کے رسولؐ کا قول نقل کیا ہے، چنانچہ آپؐ فرماتے ہیں:" ایک شادی شدہ عورت اپنی ذات کا کامل حق رکھتی ہے، اور ایک کنواری لڑکی سے اجازت طلبی ضروری ہے، اور اس کی خاموشی ہی اس کی اجازت ہے" ﴿صحیح مسلم بشرح نووی: ج/۳، کتاب النکاح، ص/۵۷۶﴾

اس قول کی وضاحت کرتے ہوئے علامہ نووی رقم طراز ہیں:" اس کا مفاد یہ ہے کہ عورت اپنی ذات پر زیادہ حق رکھتی ہے اور اس کا سرپرست اور ولی بھی حق رکھتا ہے، بہر کیف عورت کا حق زیادہ ہے اور فیصلہ کن بھی، اگر ولی کسی ایسے شخص سے اس کی شادی کرانا چاہے جسے وہ ناپسند کرتی ہو جبکہ ولی پسند کرتا ہو تو اس صورت میں ولی اسے مجبور نہیں کر سکتا، اس کے برعکس اگر وہ کسی کو پسند کرتی ہے، اور اپنے لیے مناسب تصور کرتی ہے، اور ولی اس بات پر راضی نہیں ہے تو پھر ولی کو منظوری دینے کے لیے کہا جائے گا، اگر انکار کرتا ہے تو پھر قاضی اس عورت کو ولی کی رضامندی کے بغیر شادی کی اجازت دے گا، چنانچہ اس کا حق بحال کیا جائے گا اور اس کی برتری تسلیم کی جائے گی، اور جہاں تک کنواری لڑکی کی بات ہے، تو اس سے مشورہ ضرور لیا جائے گا اور اس مشورہ لینے کے عمل کو دو ناحیے سے سمجھا گیا ہے: الشافعی، ابن ابی لیلی، احمد اور اسحاق رحمہم اللہ کے یہاں اس کا مفہوم یہ ہے کہ کنواری لڑکی کے سرپرست کو اجازت لینے کا حکم دیا جائے گا، اگر سرپرست والد محترم یا دادا جان ہیں تو انہیں اجازت لینی چاہیے، اگر بغیر اجازت شادی کر دیتے ہیں تو بھی شادی منعقد ہو جائے گی، کیونکہ باپ یا دادا کی ہمدردی بیٹی یا پوتی کے تئیں بہت زیادہ اور حتمی ہوتی ہے، اور صدق و صفا پر مبنی بھی۔

دوسری طرف، امام اوزاعی، ابو حنیفہ اور دیگر کوفی علما کا نقطہ نظر یہ ہے کہ سرپرست حضرات کو ہر بالغ اور نوجوان لڑکی سے اجازت لینی چاہیے اور اس کی خاموشی ہی اس کی اجازت ہے اور یہ ایسی شرط ہے جو ہر بالغ لڑکی اور اس کے سرپرست کے ساتھ وابستہ ہے، ایسی صورتحال میں سرپرست حضرات کو سمجھنا چاہیے کہ بالغ عورت کی خاموشی کلی طور پر کافی ہے، جہاں تک بات طلاق یافتہ اور بیوہ عورت کی ہے، تو انہیں اپنی رضامندی کا

اظہار لفظوں میں کرنا چاہیے، خواہ سرپرست ان کے والد ہی کیوں نہ ہوں"﴿صحیح مسلم بشرح نووی، کتاب النکاح، باب الاستئذان، ج/۳، ص/۵۷۵﴾

مذکورہ بالا باتوں کے پیش نظر ایک بالغ اور نوجوان لڑکی سے شادی کے متعلق اجازت لینے کے تعلق سے دو نظریے ہیں، پہلے نظریہ کو مندرجہ ذیل طریقہ سے بطور خلاصہ پیش کیا جاسکتا ہے:

۱- بالغ لڑکی سے اجازت طلبی ایک مستحب فعل ہے۔

۲- باپ کے لیے بالغ بیٹی کی اجازت کے بغیر اس کی شادی کرنا جائز ہے۔

۳- بحیثیت سرپرست باپ کی عدم موجودگی میں اجازت طلبی واجب ہے۔

دوسرا نظریہ اس اعتقاد پر قائم ہے کہ بالغ لڑکی سے اجازت طلبی ناگزیر ہے خواہ سرپرست باپ ہو یا کوئی اور۔

میں ذاتی طور پر دوسرے نقطہ نظر کی جانب مائل ہوں اور اس کے متعدد وجوہات ہیں جنہیں بعد میں پیش کیا جائے گا۔

پہلے گروہ نے باپ یا دادا کے "کمال شفقت" پر اعتماد کیا ہے، اور یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ بالغ لڑکی سے اجازت طلبی ناگزیر نہیں ہے، یہ سوچ قائم کرنا بالکل غیر منطقی معلوم ہوتا ہے کہ باپ یا دادا ہمیشہ اپنی بیٹی یا پوتی کے تئیں کمال ہمدردی کا اظہار کریں گے، بسا اوقات، باپ یا دادا معاشرہ کے رسم ورواج کی زد میں آجاتے ہیں، ذاتی خواہشات سے مغلوب ہو جاتے ہیں، اور فقط اپنے ذاتی مفادات کے حصول کو ترجیح دینے لگتے ہیں، اس لیے کنواری لڑکی سے اجازت طلبی کو مشروط قرار دینا اس کی ذات کے مفاد اور وجود کے تحفظ کا ضامن ہے۔ نبیؐ نے واضح طور پر یہ حق ہر عورت کو فراہم کیا ہے تاکہ اس کا باپ یا دادا اس کی قسمت کا مالک نہ بن بیٹھے، یا محض اپنے ذاتی مفادات کی تکمیل کے لیے اس کی شادی کر کے اذیت وتکلیف اور کلفت وپریشانی کا باعث نہ بن جائے۔

متعدد احادیث میں یہ بات ذکر کی گئی ہے کہ ایک کنواری لڑکی، ایک بیوہ خاتون یا ایک طلاق یافتہ عورت کی شادی اس کی مرضی کے بغیر کی جاتی ہے تو وہ نکاح فسخ ہو جائے گا تا آنکہ وہ عورت اپنی رضامندی کا اظہار نہ کر دے، خنساء بنت خدام انصاریہؓ سے مروی ہے کہ ان کے والد محترم نے ان کی شادی ان کی اجازت

کے بغیر کر دی، حالانکہ وہ شوہر دیدہ تھیں، اور اس شادی سے ناخوش تھیں، اس شادی کے متعلق انہوں نے دربار نبوت میں شکایت کی، آپؐ نے فی الفور اس نکاح کو فسخ کر دیا﴿ صحیح بخاری، ج/٦، ص/١٣٥﴾

اسی طرح حضرت ابو بریدہؓ نے نقل کیا ہے کہ ایک نوجوان عورت رسول اللہ ﷺ کے پاس تشریف لائی، اور عرض پرداز ہوئی کہ: "میرے والد محترم نے میری شادی اپنے بھتیجے سے کر دی ہے تاکہ معاشرہ میں اپنے مقام کو بلند کر سکیں" آپؐ نے اس عورت کو اس بات کا اختیار دیا کہ اگر چاہے تو شادی کو قبول کرے، یا پھر اسے مسترد کر دے، اس عورت نے کہا کہ جو کچھ میرے والد محترم نے کیا ہے میں اس سے اتفاق رکھتی ہوں، میرا مقصد عورتوں کو یہ بتلانا تھا کہ شادی کے معاملے میں انہیں کلی اختیار ہے اور سرپرست حضرات کے فیصلے کا اس میں کوئی عمل دخل نہیں ہے" ﴿سنن ابن ماجہ، ج/١، کتاب النکاح، ص،602﴾

یہ احادیث واضح طور پر اسلامی قانون وشریعت کی رفعت وبلندی اور عظمت وتقدس پر دلالت کرتی ہیں۔ اپنی بچی کی بلوغت سے قبل اور اس کی اجازت کے بغیر کسی سے شادی کرنے کے متعلق باپ کے حق کو لیکر اکثر علما اس بات پر متفق ہیں کہ باپ ایسا کرنے کا حق رکھتا ہے، اس بات کو پایہ ثبوت تک پہنچانے کے لیے وہ آپؐ کی حضرت عائشہ سے شادی کو بطور دلیل پیش کرتے ہیں، چنانچہ امام بخاری، امام مسلم، ابن ماجہ اور بہت سارے دیگر مشائخ نے مندرجہ ذیل حدیث کو نقل کیا ہے: "حضرت عائشہ کا بیان ہے کہ نبی ﷺ نے ان کے ساتھ چھ سال کی عمر میں نکاح کیا اور شب زفاف کا اہتمام کیا جبکہ ان کی عمر نو سال کی ہوگئی، اور وہ نبی ﷺ کے ساتھ آپ کی موت تک نو سال رہیں" ﴿ صحیح بخاری: ج/٦، کتاب النکاح، ص،١٣٥﴾

یہی روایت مسلم شریف میں کچھ یوں ہے: "حضرت عائشہ کا بیان ہے کہ نبی ﷺ نے مجھ سے چھ سال کی عمر میں شادی کی، اور نو سال کی عمر میں مجھے آپؐ کے حجرہ مبارک میں داخل کیا گیا"، وہ مزید گویا ہیں "ہم مدینہ آئے، اور مجھ پر ایک مہینہ تک بخار کا حملہ رہا، میرے بال میرے بھنو تک آگئے تھے، ام رومانؓ (میری والدہ) میرے پاس آئیں، اس وقت میں اپنے سہیلیوں کے ساتھ جھولا جھول رہی تھی، انہوں نے مجھے زور سے آواز دی، میں ان کے پاس گئی، لیکن بلانے کی وجہ سمجھ نہ سکی، انہوں نے میرا ہاتھ پکڑا، اور دروازے تک لے گئیں، میں ہاہا کر رہی تھی، (گویا کہ میں ہانپ رہی تھی)، یہاں تک کہ میرے دل کی حرکت رک سی گئی، ام رومان مجھے لیکر ایک گھر کے پاس آئیں، جہاں انصار کی کچھ عورتیں اکٹھی تھیں، ان سب نے مجھے مبارک باد دی،

اور خوش قسمتی کی تمنا کیں یہ کہتے ہوئے " خیر و بھلائی میں آپ کا بھی حصہ ہو"، ام رومان نے مجھے ان کے حوالے کر دیا، ان عورتوں نے میرا سر دھویا، مجھے زیب و زینت سے مزین کیا، اور مجھے کسی چیز نے خوف میں مبتلا نہیں کیا، نبی ﷺ وہاں بوقت صبح تشریف لائے، اور مجھے آپ کے حوالہ کر دیا گیا" ﴿صحیح مسلم بشرح نووی: ج/۳، کتاب النکاح، ص/۵۷۹﴾

امام نوویؒ اس حدیث پر تبصرہ کرتے ہوئے رقم طراز ہیں: " یہ بات کہ اللہ کے رسول ﷺ نے مجھ سے اس وقت نکاح کیا جبکہ میری عمر چھ سال تھی۔۔۔" اور دیگر نسخہ میں " جبکہ میری عمر سات سال کی تھی" ، واضح طور پر اس بات کی جانب اشارہ کرتی ہے کہ والد کو اپنی کم سن بچی کو اس کی اجازت کے بغیر شادی کرنے کا حق حاصل ہے، کیونکہ اس چھوٹی سی عمر میں اس کے پاس دینے کے لیے بطور مشورہ کچھ بھی نہیں ہوتا ہے" ﴿حوالہ سابق﴾

ان خیالات کے حاملین بطور دلیل قرآن کریم کی اس آیت (واللائی لم یحضن) کو بھی پیش کرتے ہیں، یعنی وہ عورتیں جو مرحلہ حیض کو نہیں پہنچی ہیں، اس آیت سے اس چھوٹی بچی کی عدت کا ادراک ہوتا ہے جو مرحلہ حیض کو نہیں پہنچی ہے، اور یہ ان کی شادی کے جواز پر دلیل ہے، کیونکہ عدت فقط حقیقی شادی کے بندھن ٹوٹنے کے بعد ہی ہوتی ہے۔ مذکورہ بالا نظریہ سے اتفاق رکھنے والے علما کی اکثریت اپنے افکار کی بنیاد اوپر مذکور حدیث پر رکھتی ہے، لیکن وہ لوگ بھی اس حدیث کو سمجھنے کے لحاظ سے دو خانوں میں منقسم ہیں ﴿کتاب الفقہ علی المذاھب الاربعۃ؛ عبد الرحمن الجزائری، ج/۴، کتاب النکاح، ص،۲۹﴾ ایک فریق کسی بھی سرپرست کو کمسن بچی کی شادی کرنے کا حق دیتا ہے، اس فریق میں امام اوزاعی اور امام ابو حنیفہ سر فہرست ہیں ﴿حاشیہ رد المحتار لابن عابدین، ج/۳، کتاب النکاح، ص/66﴾، دوسرا فریق محض باپ یا دادا ہی کو کمسن بچی کی شادی کرنے کا حق دیتا ہے اس اعتقاد کے ساتھ کہ اگر کوئی دوسرا شادی کراتا ہے تو یہ جائز نہ ہو گا، اس فریق میں امام شافعی، امام مالک اور جمہور علما کا نام آتا ہے ﴿الام للشافعی، ج/۸، کتاب النکاح، ص/۱۶۳۔ المنتقی شرح موطا مالک للباج، ج/۳، کتاب النکاح، ص/۲۶۶۔ منتھی الارادات لتقی الدین الحنبلی القسم الثانی- کتاب النکاح فصل فی شروط النکاح ص،۱۵۹﴾

اس طرح ہم مشاہدہ کرتے ہیں کہ دونوں فریق ایک باپ کو اپنی کم سن بچی کی شادی کا حق فراہم کرتے ہیں، بہر حال، امام شافعی اور ان کے پیروکاروں کا کہنا ہے کہ ایسا کرنا اس وقت تک مناسب نہیں ہے جب تک کہ لڑکی بلوغت کی عمر کو نہ پہنچ جائے، جب لڑکی اس مرحلہ کو پہنچتی ہے تو پھر باپ کو اس سے مشورہ لینا چاہیے اور اس کی منظوری حاصل کرنی چاہیے، تاکہ ایسی شادی سے بچا جاسکے جس کی لڑکی مضبوطی کے ساتھ تردید کرتی ہے، اس نقطہ نظر پر تبصرہ کرتے ہوئے امام نووی کہتے ہیں: " یہ عمل حدیث عائشہ کے برعکس نہیں ہے، امام شافعی اور ان کے پیروکاروں نے جو کچھ سمجھا ہے وہ یہی ہیکہ باپ کو اپنی کم سن بچی کی شادی نہیں کرنی چاہیے الا یہ کہ کوئی ناگزیر ضرورت یا کوئی خوش کن مصلحت پوشیدہ ہو جس کا حصول ضروری ہو، اور شادی میں تاخیر کے سبب اس مصلحت کے فوت ہونے کا اندیشہ ہو، جیسا کہ حضرت عائشہ کی شادی کے معاملے میں ہوا، اس طرح کی مسرت بخش صورتحال میں مناسب اور بہتر یہی ہے کہ شادی میں تاخیر نہ کی جائے، کیونکہ باپ اپنے بچوں کی فلاح و بہبود اور ان کی ذاتی مفادات کا ذمہ دار ہوتا ہے" ﴿صحیح مسلم بشرح نووی، ج/۳، کتاب النکاح، بتصرف یسیر، ص/۵۷۵﴾ میں ذاتی طور پر امام شافعی کی رائے کو راجح سمجھتی ہوں، اور یہ تمنا بھی ظاہر کرتی ہوں کہ کاش کہ انہوں نے "ضروری" کا لفظ استعمال کیا ہوتا کلمہ استحباب کے بجائے، کیونکہ کمسن بچی کی شادی میں اس کی اجازت کے بغیر بہت سارے نقصانات اور خطرات کے پہلو مخفی ہیں۔ یہ بات واضح رہنی چاہیے کہ:

۱- دنیا کی کوئی بھی شادی کائنات کی محبوب ترین شخصیت حضرت محمدؐ کی حضرت عائشہ کے ساتھ شادی کی مد مقابل نہیں ہوسکتی، حضرت عائشہ سے شادی کے معاملے میں آپؐ نے پاکیزہ مقصد اور پر خلوص نیت کا مظاہرہ کیا، آپ کی نیت اس شادی باسعید سے دین اسلام کی خدمت اور اس کی نشر و اشاعت تھی، یہ شادی بھی اللہ کی طرف سے طے شدہ تھی، اس شادی کے پس پردہ ایک مقدس حکمت کارفرما تھی جو حضرت عائشہؓ کے والد محترم ابو بکر صدیق کی اس کارکردگی اور کارنامے سے وابستہ تھی جسے انہوں نے اسلام کی نشر و اشاعت میں انجام دیا، اور نبی کریم ﷺ سے آپ کی دوستی بھی اس میں کلیدی حیثیت رکھتی تھی، اس رشتے نے حضرت ابو بکر کی عظمت و تقدس میں گراں قدر اضافہ فرمایا، جو نہایت ہی پارسا اور تقوی پسند شخصیت کے مالک تھے، اور حضرت عائشہ خود ہی اس رشتے پر نازاں و فرحاں تھیں، اس کی تفصیل خود ان ہی کی زبانی سماعت فرمائیں، وہ کہتی ہیں: " مجھے وہ چیزیں ملی ہیں جو اب تک کسی اور عورت کو نہیں ملی ہیں، نبی کائنات نے مجھ سے اس وقت عقد نکاح

فرمایا جبکہ میں سات سال کی تھی، فرشتہ میری تصویر اپنے ہاتھ میں لیے آپؐ کے پاس آیا تاکہ آپ دیکھ لیں اور آپ نے میرے ساتھ ہم بستری کی جبکہ میں نو سال کی تھی، میں نے جبریل امین علیہ السلام کو بچشم خود دیکھا، اور میں آپؐ کی محبوب ترین بیوی تھی، میں نے آپؐ کی دیکھ بھال اور تیمارداری کی جب آپ مرض سے دوچار ہوئے، اور صرف ہم نے اور فرشتوں نے آپ کی موت کو دیکھا" ﴿الاصابۃ فی تمیز الصحابۃ لابن حجر عسقلانی، ج/۴، حرف العین القسم الاول، ص/ ۳۶۰﴾ درحقیقت، کوئی بھی سنجیدہ عورت اپنی شادی کا موازنہ حضرت عائشہؓ جیسی پاک طینت عورت سے نہیں کر سکتی جن کے سرپرست نے ان کی شادی ان کی اجازت کے بغیر حضرت محمدؐ سے کر دی، ابن شبرمہ کہتے ہیں: " ایک کمسن لڑکی کی شادی جو تاہنوز سن بلوغت کو نہیں پہنچی ہے از روئے شرع درست نہیں ہے، جہاں تک بات حضرت عائشہؓ کی شادی کی ہے، تو یہ آسمان ہی سے طے شدہ تھی، آپ کو اللہ کی طرف سے یہی حکم ملا تھا اور اس پہ عمل درآمد کرنا لازم تھا، یہ ایک مخصوص حکم تھا جو بلا شرکت غیرے نبی کریم ﷺ کے لیے خاص تھا، جیسے آپ کی فصاحت بیانی اور خوش کلامی، نیز زائد از چار شادیاں کرنا" ﴿المحلی لابن حزم، ج/۹، احکام النکاح، ص ۴۵۹﴾

۲- جب ایک کمسن لڑکی کی شادی اس کی پیشگی اطلاع اور اس کی اجازت کے بغیر کی جاتی ہے تو اس طرح کی شادی کے نقصانات اس کے فوائد و ثمرات پر حاوی ہوتے ہیں، مذہب اسلام میں شادی کا بنیادی مقصد مرد و زن کے مابین مضبوط تعلقات اور پختہ بندھن قائم کرنا ہوتا ہے، ان کا رشتہ باہمی افہام و تفہیم اور آپسی تال میل پر قائم ہونا چاہیے، اور دونوں کو پر خلوص انداز میں باہمی محبت اور آپسی ہمدردی کے اظہار کے ساتھ ایک خوشگوار ازدواجی زندگی کے حصول کے لیے کوشاں رہنا چاہیے۔ اللہ تعالی کا فرمان ذیشان ہے: " ومن آیاتہ أن خلق لکم من أنفسکم أزواجا لتسکنوا إلیھا وجعل بینکم مودۃ ورحمۃ " اور اللہ کی نشانیوں میں سے یہ بھی ہے کہ اس نے تمہیں میں سے تم کو بیویاں عطا کی، تاکہ تم ان کے مابین راحت و سکون حاصل کر سکو، اور اس نے تمہارے بیچ پیار و محبت کی بیج ڈال دی۔ ﴿سورۃ الروم، آیت نمبر ۲۱﴾

چنانچہ کسی کمسن لڑکی کی شادی اس کی اطلاع اور اجازت کے بغیر کرنا اسلام میں شادی کے بنیادی مقصد کے متصادم ہے، کس طرح امن و سکون، پیار و محبت اور ہمدردی و غمگساری کا حصول ممکن ہے جب کوئی کمسن

لڑکی بلوغت کو پہنچتی ہے، اور اسے ادراک ہوتا ہے کہ وہ ایک ایسی شادی کی جال میں پھنس گئی ہے جو اس کی مرضی کے خلاف ہے، خاص طور پر جب اس کا شوہر اس سے بڑا ہو اور باپ کی عمر یا پھر دادا کی عمر کا ہو؟ اس تلخ حقیقت سے متاثر ہو کر اس کے پاس کوئی چارہ کار نہیں رہے گا بجز اپنے آپ کو بدقسمتی کی آغوش میں ڈالنے کے، بعض محققین نے ازراہ ہمدردی ایک کمسن لڑکی کو نکاح فسخ کرنے کی اجازت دی ہے گر وہ سن بلوغت کو پہنچ جائے، یہ محققین عراق کے ہیں: امام اوزاعی اور امام ابو حنیفہ رحمہا اللہ " ﴿حاشیہ رد المحتار لابن عابدین: ج/۳، کتاب النکاح، باب الولی، ص/ 66﴾ میرے نقطہ نظر کے مطابق فسخ نکاح کا حق کوئی اہمیت نہیں رکھتا ہے جب عورت سن بلوغت کو پہنچ جائے، کیونکہ جو نقصان ہونا تھا وہ ہو چکا، طلاق کے پیش نظر بہت سارے سنگین نتائج کو بھی پیش نگاہ رکھنا چاہیے جن میں سر فہرست از سر نو شادی کا مسئلہ ہے، یہ بات بالکل روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ ایک کمسن بچی کو شادی پر مجبور کر کے کوئی قابل ذکر فائدہ نہیں حاصل کیا جا سکتا ہے، اب شادی میں مسرت و شادمانی، فرحت وانبساط اور ہمدردی و غمگساری کا وہ پہلو کمزور پڑ جاتا ہے جو اللہ کی طرف سے شادی کے لیے مطلوب ہے۔

۳- اگر ہم اس بات کو تسلیم کر لیں کہ اسلام باپ کو اپنی کمسن لڑکی کے لیے شوہر منتخب کرنے کا حق دیتا ہے، تو لا محالہ باپ کے لیے بھی یہ ناگزیر ہو گا کہ وہ پارسا اور متقی ہو، وہ متدین و تقوی شعار ہو جو اللہ کی جانب سے جاری کردہ حدود و قیود کا خاطر خواہ پاس و لحاظ رکھتا ہو، کیوں کہ یہ باپ ہی ہوتا ہے جو اپنی لڑکی کے لیے اسلامی ضابطے کے مطابق مناسب رشتہ کا انتخاب کرتا ہے، نہ وہ جذبات کی زد اور خواہشات کی دباؤ میں آتا ہے نہ انسانوں کے وضع کردہ رسم و رواج اور قانون و نظریہ کو پیش نگاہ رکھتا ہے، بلکہ مکمل اسلامی تعلیمات کے مطابق بچی کی شادی کا اہتمام کرتا ہے، ایسا باپ نہ دنیوی مفاد کو مد نظر رکھتا ہے اور نہ ہی اس دنیا کی جاہ و حشمت اور دولت و ثروت کو، بلکہ اپنی لڑکی کی خوشی اور اس کی فلاح و بہبود ہی اس کا مطمح نظر ہوتی ہے، ان صفات کا حامل باپ نسلی و قومی تعصبات، علاقائی رسم و رواج، ثقافتی الجھنوں اور معاشرتی بندھنوں سے آزاد ہو کر خالص اسلامی طریقہ کار کے مطابق اپنی بچی کے لیے شوہر کا انتخاب کرے گا، تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ کتنے لوگ حقیقی طور پر اس طرز عمل کو بروئے کار لائیں گے؟

۴- چونکہ اس طرح کی شادیوں کی مفروضہ مصلحت ہی نے دانشور طبقہ کو برانگیختہ کیا اور انہیں اس طرح کی خود ساختہ نظریات کو منظر عام پر لانے کی وجہ بھی بنی، اور چونکہ اسلامی شریعت کا بنیادی مقصد انصاف کو بروئے کار لانا اور شر و فساد کو بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکنا ہے، اس لیے تاکیدی طور پر شخصی فلاح و بہبود کے نظریہ کو پیش نگاہ رکھنا چاہیے، درحقیقت، ایک صدی میں جس چیز کو سب سے بڑی مصلحت تسلیم کیا جاتا ہے، وہی چیز آنے والی صدیوں میں ایک معمولی حیثیت کی لگنے لگتی ہے، یا پھر خالی از مصلحت دکھائی دینے لگتی ہے، دوسری چیز مسلم دنیا میں تقوی یا شر و فساد کی سطح کو پوری صدیوں میں زیر غور رکھنی چاہیے، اسی لیے شر و فساد اور بد عنوانی کے سبب بہت سارے عرب ممالک، جیسے سیریا، لبنان، مصر، عراق، جارڈن، تیونیسیا اور مور کو لڑکیوں کو سن شعور اور مرحلہ ادراک کو پہنچنے سے قبل سرپرست کو ان کی شادی کی اجازت نہیں دیتے ہیں، یہ عمر بھی ملک و سرحد کے لحاظ سے مختلف ہوتی ہے، کچھ ممالک نے اس عمر کو لڑکوں کے لیے اٹھارہ اور لڑکیوں کے لیے سولہ متعین کیا ہے امام ابو حنیفہ کی ارشادات پر عملدرآمد کرتے ہوئے، دیگر ممالک نے شادی کی مناسب اور قانونی عمر پندرہ سال متعین کیا ہے عبد اللہ بن عمر کی حدیث پر اعتماد کرتے ہوئے۔

نبی کریم ﷺ کی حضرت عائشہ سے محض شادی کی بنیاد پر یہ حق باپ کو فراہم کرنا درحقیقت قول رسول ہی کی مخالفت ہے، جیسا کہ آپ کا فرمان ذیشان ہے:" ایک شادی شدہ عورت کو کسی کی زوجیت میں اس کے مشورے اور اجازت کے بغیر نہیں دینی چاہیے؛ اور ایک کنواری لڑکی کی شادی اس کی مرضی کے بغیر نہیں کرنی چاہیے"، اسی طرح سے باپ کو شادی کے تعلق سے اس طرح مالکانہ حق دینا ان تمام احادیث کی مخالفت کرتا ہے اور اس کے مبادیات و اساسات سے متصادم ہے جو میں سابقہ سطور میں ذکر کر چکی ہوں، یہ احادیث عورتوں کو شوہر کے انتخاب کا بھرپور حق دیتی ہیں، واضح رہے کہ اس طرح کی حالات میں اقوال رسول افعال رسول کے برعکس اور اس سے متصادم ہیں، لیکن اس طرح کے تضاد کا ازالہ ممکن ہے جب آپؐ کی حضرت عائشہ سے شادی کی تشریح بایں طور کی جائے کہ وہ عمل فقط آپؐ ہی کے لیے خاص ہے بحیثیت نبی ہونے کے، اور اس کے پس پردہ ایک مقدس حکمت پنہاں ہے جس سے اللہ ہی تعالی بحسن وخوبی واقف ہے۔

آٹھواں باب:

روزگار تلاش کرنے کا حق

اسلام ایک ایسا آفاقی و عالمگیر مذہب ہے جو جد وجہد، کد وکاوش اور محنت شاقہ کی حوصلہ افزائی کرتا ہے، یہ ایثار و قربانی، داد و دہش اور جود وسخا کا مذہب ہے، بحیثیت مسلمان ہمیں محنت کرنے کی تلقین کی گئی ہے اور جائز و قانونی روزگار اختیار کرنے کی ترغیب دی گئی ہے، جائز ذرائع معاش اختیار کرنے کی تلقین کرتے ہوئے خالق کائنات کہتا ہے:" وقل اعملوا فسیری اللہ ورسولہ والمؤمنون "﴿سورۃ التوبۃ: آیت نمبر:۱۰۵﴾، یعنی آپ کہیے کہ تم جو کچھ کرتے ہو اسے کیے جاؤ، اللہ تمہارے عمل کو دیکھے گا، اور اس کے پیغمبر اور مسلمان اس کو دیکھیں گے، اس آیت کی تشریح کرتے ہوئے امام قرطبی رقم طراز ہیں:" آپ کہیے کہ تم اپنا عمل کیے جاؤ، اس میں تمام انسانیت کو مخاطب کیا گیا ہے،" اللہ تعالی، اس کے رسول اور مومنین تمہارے عمل کو دیکھیں گے" سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالی انہیں تمہاری کارکردگی سے مطلع اور باخبر کردیگا، یہ بھی کہا گیا ہے کہ اگر کسی نے کسی ایسی چٹان میں محنت و مشقت کی جہاں نہ در ہے نہ دروازہ، نہ کھڑکی نہ دریچہ تو اس کا بھی عمل ظاہر وعیاں ہوجائے گا خواہ وہ کوئی بھی شخص ہو"﴿تفسیر قرطبی: ج/۴، تفسیر سورۃ التوبۃ، ص/۳۰۹﴾

انسانی تخلیق کی حکمت و مصلحت قرآن کریم میں بیان کیا گی ہے، چنانچہ ارشاد باری تعالی ہے:" اَلذي خلق الموت والحیاۃ لیبلوکم ایکم اَحسن عملا"{سورۃ تبارک، آیت نمبر:۲} یعنی اللہ ہی ہے جس نے موت وحیات کو پیدا فرمایا ہے تاکہ آزمائے کہ تم میں سے عمل کے اعتبار سے کون بہتر ہے، اور دوسری جگہ فرمایا:" اِنا جعلنا ما علي الأرض زینۃ لھا لنبلوھم ایھم اَحسن عملا"﴿سورۃ الکہف: آیت نمبر۷﴾ یعنی روئے زمین پر جو کچھ بھی ہے ہم نے اسے بطور زینت پیدا کیا ہے، تاکہ آزمائیں کہ کون بہتر عمل کرتا ہے۔

اللہ تعالی نے اس بات کو واضح کردیا ہے کہ تخلیق انسانی کا بنیادی مقصد اور اس کے پس پردہ مصلحت بنی آدم کی آزمائش ہے، اسے امتحان و آزمائش کے مرحلہ سے دوچار کرنا ہے اور اس مرحلہ کو عبور کرنے کے بعد حسب عمل انعامات سے سرفراز فرمانا ہے۔

امام قرطبیؒ نے مزید لکھا ہے: "یہ زندگی بنی نوع انسان کے لیے اتنی ہی پر کشش اور جاذب نظر ہے جتنا سخت گرمی کے دنوں میں درخت پر ایک پکا ہوا رسدار پھل ہوتا ہے، اللہ تعالی نے اس کو سب کے لیے دستیاب فرمایا ہے اور اس تک سب کی رسائی بہم پہنچائی ہے، تاکہ لوگوں کو آزمائش کی کسوٹی پر پرکھ لے کہ کون اپنے رب کا وفا شعار اور فرماں بردار ہے"، ابن عطیہ کہتے ہیں: "میرے والد محترم کہا کرتے تھے کہ "احسن عملا" سے مراد یہ ہے کہ آدمی حسن عمل اور کار خیر کا اہتمام کرے، اور جن چیزوں کا مستحق ہے اسے جائز طریقے سے حاصل کرے، اور جائز ہی طریقے سے اللہ کی راہ میں خرچ کرے، اسلامی احکام پر کاربند رہے، تمام تر مذہبی امور کو بطریق احسن انجام دے، اور جن چیزوں سے شریعت نے اسے منع کیا ہے ان سے تاحد امکان اجتناب برتے اور اپنی نفلی عبادات میں خاطر خواہ اضافہ کرے"، اس پر میں نے کہا کہ: " یہ نہایت جامع بیان اور کوثر و تسنیم سے دھلی ہوئی گفتگو ہے" ﴿تفسیر القرطبی: ج/ ۵، ص ۲۷ ۳۹ فی تفسیر سورۃ الکہف﴾ تمام مسلمانوں کو کام کرنے اور نفع حاصل کرنے کا بھرپور حق حاصل ہے، اسلام نے ہر فرد کو جائز ذریعہ معاش اختیار کرنے کا حق دیا ہے جب تک کہ اس کی ضرورت کی تکمیل ہوتی رہے، نبی ﷺ نے اپنے پیروکاروں کو ایسا کرنے کا مختلف حدیثوں میں حکم دیا ہے، مقدام بن معدی کرب سے مروی ہے، کہتے ہیں کہ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا: " کسی نے بھی اپنے ہاتھ سے کمائی ہوئی روزی سے بہتر کوئی چیز نہیں کھائی " ﴿فتح الباری بشرح البخاری؛ ج/ ۴، کتاب البیوع، ص/ ۳۰۳﴾، مذکورہ حدیث کی تشریح کرتے ہوئے امام بن حجر عسقلانی رقم طراز ہیں کہ: "ہاتھ سے کمانے کا عمل عام کمائی پر عطف ہے جو عطف الخاص علی العام کی قبیل سے ہے، کیونکہ کمائی ایک عام چیز ہے جو ہاتھ، پاؤں، زبان کسی بھی چیز سے ممکن ہے، جبکہ ہاتھ سے کمانا ایک خاص عمل ہے"، ماوردی کا بیان ہے کہ: " آمدنی کے سب سے بہتر ذرائع کاشت کاری، تجارت اور حرفت وصنعت ہیں، علما کے مابین بہترین عمل اور عمدہ ذرائع معاش کے حوالہ سے اختلاف واقع ہے، جبکہ امر واقعہ یہ ہے کہ معاش کے ذرائع احوال و ظروف کے اعتبار سے بدلتے رہتے ہیں، بہر کیف، کسب معاش اور حصول زر کا کوئی بھی جائز طریقہ بیکاری، سستی وکاہلی اور وقت گزاری سے بہتر ہے جو لوگوں کو ذلت ورسوائی سے دوچار کرتی ہے اور دست سوال دراز کرنے اور کاسہ گدائی اٹھانے پر مجبور کرتی ہے" ﴿حوالہ سابق﴾، رافع بن خدیج کے حوالہ سے اسی مفہوم کی ایک روایت امام احمد بن حنبل نے بھی نقل کی ہے، کہتے ہیں کہ: " نبی کریم ﷺ سے سب سے بہتر اور پاکیزہ

کمائی کے متعلق دریافت کیا گیا، تو آپ نے فرمایا(آدمی کا اپنے ہاتھ سے کمانا، اور ہر جائز بیع و شراء کا معاملہ کرنا)﴿مسند امام احمد بن حنبل؛ج /۴، ص /۱۴۱﴾ یہ حدیث انسانی کام کی ستائش کرتی ہے جو ہر طرح کے پیشے اور معاش پر مشتمل ہے، امام بخاری نے بھی اسی طرح کی حدیث کو نقل کیا ہے جس میں اس بات کی جانب اشارہ ہے کہ ابو بکر صدیقؓ اکثر اصحاب رسول کی مانند تجارت کیا کرتے تھے، در حقیقت تجارت و روز گار کی بے پناہ حد تک حوصلہ افزائی کی گئی ہے، حضرت عائشہ سے روایت ہے کہ جب ابو بکر صدیقؓ خلیفہ منتخب کیے گئے تو اس موقع سے آپؓ نے فرمایا: "میرے جاننے والے جانتے ہیں کہ میرا پیشہ ایسا نہ تھا کہ جس سے میری فیملی اور پریوار کو اشیائے خوردونوش کی دستیابی میں پریشانی ہو، اب چونکہ میں قوم مسلم کی خدمت میں سرگرم عمل و مصروف کار رہوں گا، اس لیے میرے اہل خانہ مسلمانوں کے قومی خزانے سے غذائی اجناس اور ضرورت کی اشیا حاصل کریں گے، اور میں قوم مسلم کی خدمت کا فریضہ انجام دوں گا"، اس حدیث کی تشریح کرتے ہوئے امام بن حجر عسقلانی کہتے ہیں: "پیشہ سے حضرت ابو بکر صدیق کا ذرائع آمدنی کی جانب اشارہ کرنا تھا، اس لیے کوئی بھی جائز مشغلہ اور پیشہ خواہ کیسا بھی ہو اسلام انسانوں کو اجازت دیتا ہے کہ کمائے اور اس آمدنی میں سے خرچ بھی کرے، چنانچہ ابو بکر صدیق یہ کہہ رہے ہیں کہ ان کے مشغلہ اور تجارتی پیشے نے انہیں اپنے بچوں کی ضروریات کی تکمیل کے لیے اہل بنا دیا تھا، ساتھ ہی آمدنی کے متبادل کے طور پر خزانے سے کچھ لینے میں اپنا معقول عذر اور جائز وجہ بھی بتا رہے ہیں، کیونکہ ان سے اب یہی توقع کی جاتی ہے کہ اپنا قیمتی وقت اور بیش قیمت طاقت مسلمانوں کی خدمت میں وقف کر دیں گے ﴿فتح الباری بشرح البخاری؛ ج /۴، کتاب البیوع، ص /۳۰۳﴾ مذکورہ تشریح سے دو باتیں منظر عام پر آتی ہیں:

۱- ہر جاب یا پیشہ کو صنعت و حرفت مانا جاتا ہے۔

۲- ہر جائز پیشہ لائق ستائش اور قابل قبول ہے۔

عائشہ صدیقہ سے مروی ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا: "سب سے پاکیزہ رزق جو تم حاصل کرتے ہو وہ تمہارے ہاتھ کی کمائی ہے اور تمہاری اولاد بھی تمہاری کمائی کا حصہ ہیں " ﴿سنن ترمذی؛ ج /۳، حدیث نمبر /۱۳۵۸، ص /۳۰۳﴾ آپ ﷺ اپنے اصحاب کو محنت و جفاکشی اور کسب معاش پر آمادہ کرتے تھے، تاکہ کسی کے سامنے کھانے کے لیے دستِ سوال دراز کرنے سے محفوظ رہیں، حضرت ابو ہریرہؓ کا

بیان ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا: "کوئی لکڑی اکٹھا کرے اور اس کا بنڈل اپنے جسم پر لادے، یہ عمل بہتر ہے کسی کے سامنے کاسہ گدائی پھیلانے سے کہ چاہے تو دے اور چاہے تو جھڑک دے" ﴿فتح الباری بشرح صحیح البخاری؛ ج/۴، کتاب البیوع، ص/۳۰۳﴾

اسلام نے عورتوں کو جائز ذرائع معاش اور مناسب وسائل آمدنی بروئے کار لانے کا حکم دیا ہے جو ان کی نسوانیت سے متصادم نہ ہو، یا ان کی عزت نفس پر حملہ آور نہ ہو، اسلام نے بیوہ اور طلاق یافتہ عورتوں کو بھی دوران عدت کام کرنے کی اجازت دی ہے، کیونکہ اگر اس کا کام کرنا اپنے خاندان اور مسلم قوم کی فلاح و بہبود کے لئے لازم ہے تو پھر اس کی حوصلہ افزائی کی جاتی ہے کہ وہ اپنا کام حسب معمول کرتی رہے، جابر بن عبد اللہ سے مروی ہے کہ: "میری خالہ کا طلاق ہو گیا اور وہ اپنے کھجوروں کو چننا چاہتی تھی، ایک آدمی اسے دوران عدت باہر نکلنے پر ڈانٹنے لگا، وہ آپؐ کے پاس تشریف لائی، آپؐ نے فرمایا: "بلاشبہ تم اپنے کھجور کے درختوں سے کھجور چن سکتی ہو، کیونکہ تمہیں یا تو خیرات کرنی ہو گی، یا پھر ہمدردی و غمگساری پر مبنی کوئی کام انجام دینا ہو گا" ﴿صحیح مسلم بشرح نووی؛ ج/۳، کتاب الطلاق، ص/۲۰۳﴾ اس طرح آپؐ نے ہر کسی کو کام پر آمادہ کیا ہے، اس کے اچھے اور خوشگوار نتائج کو پیش نگاہ رکھتے ہوئے جو فرد اور سماج پر بر آمد ہوتے ہیں۔ بہر کیف، اسلام نے عورتوں پر کام کو لازم نہیں قرار دیا ہے، کیونکہ اسلام کا عام اصول مرد و عورت اور زن و شو کے مابین ذمہ داریوں اور فرائض کو تقسیم کرنا ہے، مرد کی ذمہ داری اپنی روزی کا حصول اور اسے اپنے بچوں اور خاندان کی عورتوں تک پہنچانا ہے، جیسے ماں، بیوی اور بیٹی وغیرہ، دوسری طرف بنیادی طور پر ایک عورت کی ذمہ داری اپنے بچوں کی نگہداشت، شوہر کی خدمت اور اپنے گھر کے انتظامی امور کو سنبھالنا ہے، اسی لیے اسلام نے شوہر پر اس بات کو واجب قرار دیا ہے کہ وہ اپنی بیوی کو تمام تر لازمی اشیا فراہم کرے تاکہ بیوی خوش اسلوبی کے ساتھ اور پوری عقیدت و محبت اور یکسوئی و یکجہتی کے ساتھ گھر کے اہم امور کو سنبھال سکے۔ در حقیقت ذمے داری اور فرائض کی متوازن تقسیم میں بذات خود اسلام کی مقدس حکمت اور پاکیزہ مصلحت عیاں ہوتی ہے، اللہ تعالی نے تمام مرد و زن کو یہ حکم دیا ہے کہ وہ اپنے بنیادی مقاصد، اساسی عزائم اور حقیقی کردار کے تئیں وقف رہیں اور اس کی حصول یابی میں پر خلوص کاوش کریں، تبھی ایک اعلا اور عمدہ پیداوار کا حصول ممکن ہے۔ اللہ تعالی نے شوہر کو حکم دیا ہے کہ بیوی کو روزی فراہم کرے خواہ بیوی صاحب ثروت اور مال و دولت کی مالک ہی کیوں نہ ہو، اور

ساتھ ہی حکومت وقت کو یہ حکم دیتا ہے کہ عورت اگر اپنے شوہر یا حاجات کی تکمیل کرنے والے فرد کو کھو دے تو پھر اس کی تمام تر ذمے داریوں کو اپنے سر لے۔

مزید بر آں، اسلام نے عورتوں کو آزاد تجارت کا حق فراہم کیا ہے، تجارت کرنے کا حق، خیرات دینے کا حق۔۔۔وغیرہ ناگزیر ضرورت کے پیش نظر، یا جب اجتماعی مفاد کا حصول مطلوب ہو، جیسے تیمارداری، خاتون مریضوں کا علاج، دایہ گیری، نوجوان عورتوں کو زیور علم سے آراستہ و پیراستہ کرنا اور دیگر مشاغل و سماجی خدمات جو عورتوں سے متعلق ہیں۔ ایک باصلاحیت اور ذی لیاقت عورت کو گھر سے باہر نکلنے اور اپنے معاشرے کی ضروریات کی تکمیل کی اجازت دی جاتی ہے، لیکن اس کے لیے چند شرائط مطلوب ہیں جو مندرجہ ذیل ہیں:

۱- اس کا کام اتنا وقت طلب نہ ہو کہ اس میں پورا وقت ہی صرف ہو جائے، جس سے بحیثیت بیوی اور ماں گھر کے اہم امور کی انجام دہی میں رکاوٹ در پیش ہو۔

۲- اس کا مشغلہ کچھ اس انداز کا نہ ہو جو اس کی حد نسوانیت سے متصادم ہو، یا پھر اس کی مخصوص فطری فرائض سے اسے دور کرتا ہو۔

۳- پوری شان و شوکت اور پاکدامنی کے ساتھ اپنے کام کو انجام دینے کی اہلیت رکھتی ہو، اور ان تمام تر برانگیختہ کرنے والے امور اور ہوس کو بھڑکانے والے احوال سے کنارہ کشی کرتی ہو جو تذبذب اور بے یقینی کی کیفیت پیدا کرتے ہیں اور عورت کی شخصیت کو معاشرہ میں مشکوک بنا دیتے ہیں۔ بلاشبہ بہت ساری مقدس آیات اور نبوی احادیث ہیں جو عورتوں کو ایسا کرنے کا حکم دیتی ہیں اور ساتھ ہی دوران عمل نرم گفتگو، خوشبو اور آرائش و زیبائش سے دور رہنے کی تلقین کرتی ہیں، ان مسائل کو تفصیلی طور پر بعد میں ذکر کیا جائے گا "اخلاقی حقوق" کے زیر عنوان۔

۴- اسے مردوں کے ساتھ اختلاط سے تا حد امکان بچنا چاہیے، اور ان کے ساتھ خلوت نشینی سے گریزاں رہنا چاہیے، کیونکہ آپؐ کا فرمان ذیشان ہے: "کسی بھی مرد کو کسی عورت کے ساتھ محرم کی غیر موجودگی میں تنہائی نہ اختیار کرنی چاہیے" ﴿صحیح مسلم بشرح نووی: ج/۳، کتاب الحج، ص/۴۸۹﴾ مذکورہ بالا باتوں کا ماحصل اور نتیجہ یہ ہے کہ ایک باعزت عورت کو ان مقامات میں کام نہیں کرنا چاہیے جہاں اس بات کا خدشہ ہو کہ مقام تنہائی میں وہ مردوں کے ساتھ انفرادی تعلق قائم کر سکتی ہے، مردوں کے ساتھ عوامی اختلاط سے بھی

بچنا چاہیے، ابو یمان بن شداد سے مروی ہے: "مسجد میں داخل ہونے کے دوران میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو عورتوں کو نصیحت کرتے ہوئے سنا، آپ نے کہا: "ہمارے پیچھے پیچھے چلو اور راستے کے درمیان میں چلنے سے بچو"، چنانچہ عورتیں سڑکوں کے کنارے کنارے کچھ اس انداز میں چلنے لگیں کہ ان کے کپڑے دیواروں میں پھنس جاتے تھے" ﴿عون المعبود فی شرح سنن ابی داؤد؛ ج/ ۱۴، ص/ ۱۹۰﴾

جب تک مذکورہ بالا شرائط اور طریقہ کار کو بروئے کار لایا جاتا ہے تب تک ایک عورت کو تلاش روزگار کا حق ہے، وہ ان تمام تر مشاغل اور ذرائع معاش کا انتخاب کر سکتی ہے جو اس کی قابلیت اور نسوانی فطرت سے متصادم نہ ہو، جیسا کہ بحیثیت عورت ایک عورت کی نسوانی فطرت اور لیاقت تقاضا کرتی ہے۔ بہر حال ایک عورت کو محض اسی مقصد کے پیش نظر روزگار نہیں تلاش کرنی چاہیے کہ اس سے آمدنی ہوگی، مذہبی تعلیمات اور خاندانی ذمے داریوں کو نظر انداز کرتے ہوئے محض مغربی تہذیب کی اندھی تقلید میں۔ درحقیقت، عورت کے روزگار کے تعلق سے اسلام کا موقف مغربی تہذیب سے مختلف ہے، مغربی ممالک میں مرد وزن کے مابین اس سلسلہ میں کوئی فرق نہیں ہے، وہ دونوں مجبور محض ہیں اپنے وسائل حیات جٹانے اور اپنے اہل خانہ کی ضروریات کی تکمیل کرنے میں، ملازمت کے ساتھ ساتھ ایک مغربی عورت بحیثیت ماں اور بیوی اپنی فطری ذمے داریوں سے بھی عہدہ برآں ہونے کی مکلف ہے۔

ہمارے معاشرے میں عورتوں کی ملازمت کو میڈیا کی طرف سے ایک عام رجحان کے طور پر کافی نمایاں کیا گیا ہے، اور حصول ملازمت اور تلاش روزگار پر انہیں برانگیختہ کرنے کے لیے مختلف تحریکیں بھی چلائی گئی ہیں، جب اس طرح کی تحریکیں پہلی بار مغربی ملکوں میں شروع ہوئی تھیں تو عورتیں مردوں کے ساتھ اپنی نام نہاد ہمسری کو مستحکم کرنے کی غرض سے باہر نکلنے اور کام کرنے کے لیے بیتاب ہو گئی تھیں۔ بد قسمتی سے بہت سارے مشرقی ممالک نے بھی اسی مثال کو بروئے کار لانا شروع کر دیا ہے، اور اس طرح قانون قدرت سے بغاوت کی داغ بیل ڈال دیئے ہیں اور عورتوں کے داخلی امور اور نسوانی ذمے داریوں کو نظر انداز کرنا شروع کر دیئے ہیں، اسلام کی قابل قدر تعلیمات کو پس پشت ڈال کر جو مکمل طور پر مسیحی ممالک کے خود ساختہ نظریات وخیالات سے مختلف ہیں، مشرقی ممالک نے بھی انہیں شعار کو اپنانا شروع کر دیا ہے، اسی کی روش پر گامزن ہیں اور مسیحیوں کے طرز عمل کے فداکار و جاں نثار بنے بیٹھے ہیں۔ کچھ دلائل جن کی بنیاد پر مغربی

مفکرین اور نام نہاد دانشوران نے عورتوں کو تلاش روزگار کے لیے قائل کرنے کی کوشش کی ہیں انہیں مندرجہ ذیل سطور میں پیش کرنے کی کوشش کی جارہی ہے:

۱- خوشحالی اور عام فلاح و بہبود کا حصول فقط ملازمت اور روزگار حاصل کرنے پر ہی ممکن ہے، چونکہ عورت معاشرہ کے نصف حصہ کی نمائندگی کرتی ہے، لہذا نصف آبادی بے روزگاری کی شکار ہو جائے گی اگر عورت تلاش معاش میں گھر سے باہر نہیں نکلتی ہے۔

۲- روزگار اور ملازمت صنف نازک کو دنیا کی حقیقت اور اس کی صداقت کو سمجھنے میں مدد و معاون ثابت ہوتی ہے، ملازمت ان کی ذہنی لیاقت اور دماغی صلاحیت کو عروج بخشتی ہے اور ان میں خود اعتمادی اور عزم کی پختگی پیدا کرتی ہے۔

۳- ملازمت عورت کو اپنی خاندانی آمدنی بڑھانے میں تعاون فراہم کرتی ہے یا کسی روزی رساں کی عدم موجودگی میں اپنا سامان رسد حاصل کرنے میں مدد بہم پہنچاتی ہے۔

یہ دلائل نہایت ہی کمزور ہیں اور بہ آسانی ان کی تردید کی جاسکتی ہے:

۱- ان کے تمام تر دعووں کے باوجود دنیا کی نصف آبادی تاہنوز بے روزگاری کی شکار ہے، عورتیں ہمارے معاشرے میں قابل قدر و لائق تحسین کردار ادا کرتی ہیں، یہ عورتیں ہی ہیں جو ہمارے سماج کے آئندہ نسل کو جنم دیتی ہیں، ان کی پرورش و پرداخت کرتی ہیں اور ان کی تعلیم و تربیت پر توجہ مبذول کرتی ہیں، مرد معاشی ارتقا اور زراعتی پیداوار کا مکلف ہے جبکہ عورت پر شرح آبادی میں اضافہ اور افزائش نسل کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے، دونوں ذمے داریاں اپنے اپنے مجال میں اختصاص اور مہارت کی متقاضی ہیں، معاشرہ میں اچھے افراد پیدا کرنے کا عمل وقت اور جد و جہد دونوں کی کامل فراوانی اور مکمل لگن کا تقاضا کرتا ہے، ایک ماں اپنے بچے کی اخلاقی اقدار اور عام انسانی رویہ کی ذمہ دار ہوتی ہے، اور یہ ذمہ داری ان کی ذہنی، جسمانی اور روحانی ارتقا پر مکمل توجہ کی طالب ہے، نیز یہ ذمہ داری ماں کے فطری فرائض کو گراں قدر بنادیتی ہے معاشی ترقی میں اس کے کردار کی بنسبت، ساتھ ہی عورت کی ذمہ داری بہت اہم اور طویل وقت کی متقاضی ہے، کیونکہ مادی پیداوار کے بنسبت نسل انسانی کی پیدائش زیادہ اہمیت کی حامل ہے، ستم ظریفی تو یہ ہے کہ مغربی ممالک، بطور خاص امریکی ریاستیں جہاں عورتوں کو حصول روزگار پر برانگیختہ کیا جاتا ہے، شرح بے روزگاری روز افزوں بڑھتی جا

رہی ہے، اور مرد برادران نوکری پانے میں ناکام اور بے کاری سے دوچار ہیں، الریاض میگزین (اشاعت نمبر 5096) سے میں یہ اقتباس نقل کر رہی ہوں: "بروقت امریکہ اب تک کی سب سے بڑی شرح بے روزگاری کی اذیت سے دوچار ہے، اس بے کاری اور ملازمت کی کمیابی نے بہت سارے ایسے مریض پیدا کر دیے ہیں جو نفسیاتی امراض سے دوچار ہیں اور ایک بہت بڑی تعداد نشہ آور اشیا کے صارفین کی بھی پیدا ہو گئی ہے، بے روزگاری اور ملازمت سے محرومی نے بہت سارے امریکی شہریوں کے لیے مسائل کے انبار کھڑے کر دیے ہیں اور سرکاری بجٹ کے خسارے میں دوگنا اضافہ کر دیے ہیں"۔ ۲- ذہنی ارتقااور ترقی یافتہ تہذیبی بیداری ضروری نہیں ہے کہ انہیں ملازمت کے ذریعے ہی حاصل کیا جائے، بسا اوقات ان امور کو وسیع علم، عمیق مطالعہ، محاضرات ودروس میں حاضری، کانفرنسوں میں شرکت اور اہالیان علم کی ہم نشینی سے بھی بطریق احسن حاصل کیا جاسکتا ہے، یہ بات بھی ناقابل یقین ہے کہ بہت سارے دنیوی مناصب اور مردوں کے شایان شان عہدوں پر فائز ہونا عورتوں کو ترقی سے ہمکنار کر سکتا ہے اور ان کی ذہنی لیاقت میں اضافہ کا باعث بن سکتا ہے، جہاں تک گھریلو آمدنی میں تعاون، یا کسی مددگار وہمنوا کی عدم موجودگی میں اساسی آمدنی میں اضافہ کی بات ہے، تو اس سلسلہ میں مسلم عورتوں کو تلقین کی گئی ہے کہ وہ کام کریں اور رزق حلال تلاش کریں، کیونکہ ان کا معاشرہ غریبوں اور ناداروں کے تئیں اپنے فرائض کی ادائیگی میں ناکام ثابت ہو چکا ہے، بیواؤں، یتیموں اور لاوارثوں کی مدد میں صفر واقع ہو چکا ہے، اللہ تعالی نے اس طرح کے نادار لوگوں کے لیے عوامی خزانے سے ایک حصہ متعین کرنے کے لیے مسلمانوں کو خصوصی حکم دیا ہے، باری تعالی کا فرمان ہے: " اور ان کے مال میں گداگروں اور دولت سے محروم لوگوں کا ایک مناسب حصہ ہے" ﴿51:19﴾ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے،: " ہر مسلمان کا میں جگری دوست ہوں، اس دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی، اگر تم چاہو تو قرآن کی اس آیت کو پڑھ سکتے ہو: " انبیاء اپنے نفس کے بنسبت مومنوں کے زیادہ قریب ہوتے ہیں" ﴿33:6﴾، چنانچہ اگر کوئی مسلمان کچھ مال چھوڑ کر مرتا ہے تو پھر اس کے اقارب اور رشتہ دار اس کی دولت کے وارث بنیں گے؛ لیکن اگر وہ مقروض ہے، یا پھر غریب بچوں کو چھوڑ کر جاتا ہے تو (قرض دہندگان اور بچوں) کو میرے پاس آنا چاہیے، کیونکہ میں ان کا مربی اور غمگسار ہوں"۔ ﴿فتح الباری بشرح صحیح البخاری: ج/۸، کتاب التفسیر، ص/۵۱۷﴾

جہاں تک ان لوگوں کے دعوے کی بات ہے جو کہتے ہیں کہ عورت کی ملازمت مردوں کی ہمسری کرنے اور ان کے مد مقابل بننے میں مدد فراہم کرے گی، تو میں یہ کہوں گی: "اس طرح کی ملازمت نے عورتوں کو مردوں کی مد مقابل بنایا ہے، لیکن کس چیز میں؟ ذہنی خلجان میں، فکری انتشار میں، نفسیاتی امراض میں، کلفت و اذیت میں اور جہد و مشقت میں نہ کہ تنخواہ و مشاہرہ میں اور نہ ہی عزت و احترام میں۔ استاذ البہی الخولی کا کہنا ہے: "اقوام متحدہ تاہنوز مرد و عورت کی مساوی تنخواہ کے معاملے کو حل کرنے میں کامیاب نہ ہو سکا ہے، کیونکہ مرد بضد ہیں کہ ان کی شرح پیداوار عورتوں کے بالمقابل زیادہ ہے"۔ ﴿الاسلام والمرأۃ المعاصرۃ: البہی الخولی، ص ۲۲۱﴾ ماہرین معاشیات، ماہرین نفسیات اور سماجی ناقدین اس بات پر متفق ہیں کہ یہ رجحان کہ (عورت گھر کے باہر برسر ملازمت ہو) معاشرہ میں عورتوں کے نفیس کردار، پاکیزہ رول اور قابل ستائش پہچان کو کافی حد تک متاثر کیا ہے، اور ممبران خانہ کو عیاشی، بداخلاقی، ناشائستگی اور بے حیائی کے قعر مذلت میں ڈھکیل دیا ہے"۔ ﴿حوالہ سابق﴾

برسر ملازمت عورت کے بنیادی نتائج میرے نقطہ نظر کے مطابق یہ رہے ہیں کہ بحیثیت ماں اور بیوی جو ان کے اساسی کردار ہیں اس میں کافی حد تک نقص در آیا ہے، یہ خاندان میں تباہی کا پیش خیمہ ثابت ہوا ہے، گھر میں بداخلاقی پیدا ہوئی ہے، اور کم عمر کے بچے بے حیائی اور شوخی کے شکار ہو گئے ہیں، حادثات میں اضافہ ہوا ہے اور جنسی جرائم بھی بڑھے ہیں جس کے زیادہ تر بچے ہی شکار ہوئے ہیں، اس نام نہاد تحریک نسواں کے یہی منفی نتائج ہیں جس نے بہت سارے ان مسلمانوں کو بھی اپنی زد اور حلقہ اثر میں لے لیا ہے جو اپنے مذہب کی قابل قدر تعلیمات سے کوسوں دور ہیں۔

نواں باب:

اخلاقی فریضہ (حجاب)

بعض احباب اظہار تعجب کر سکتے ہیں کہ کیسے اسلامی حجاب کو عورتوں کا اخلاقی حق تصور کیا جا سکتا ہے، بہت سارے لوگوں کو حجاب دقیانوسیت، رجعت پسندی، تنزلی اور ظلم و زیادتی کی علامت معلوم پڑتا ہے، لیکن جو لوگ حجاب کے پس پردہ حکمت و مصلحت کو سمجھنا چاہتے ہیں وہ ضرور اس حقیقت کا ادراک کر لیں گے کہ پردہ کو اخلاقی حق کیوں گردانا جاتا ہے، اسلام میں عورت اپنی عزت و احترام اور عفت و عصمت کو درپیش کسی بھی طرح کی جسمانی و مادی خطرات سے تحفظ فراہم کرنے کے لیے ہر ممکنہ کوشش کرتی ہے، اسلام کا بھی فلسفہ ہے کہ حفاظت و پرہیز گاری علاج و معالجہ سے بدرجہا بہتر ہے، اس لیے اس نے مرد و زن کے اختلاط سے متعلق معتد بہ اصول و ضوابط اور آداب کو پیش کیا ہے، دونوں جنسوں کو خطاب کرتے ہوئے، مگر آغاز خطاب مردوں سے کرتے ہوئے باری تعالی کہتا ہے:" قل للمؤمنين يغضوا من أبصارهم ويحفظوا فروجهم ذلك ازكى لهم إن الله خبير بما يصنعون{ النور: ٣٠}اے میرے نبی! آپ ایمان والوں سے کہ دیجیے کہ اپنی نگاہیں نیچی رکھیں اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں، ایسا کرنا ان کے لیے زیادہ بہتر ہے، بے شک وہ لوگ جو کچھ کرتے ہیں اللہ اس سے پوری طرح باخبر ہے۔ اس آیت کی تفسیر میں علامہ ابن کثیرؒ کہتے ہیں کہ:" اللہ تعالی مومنوں کو نگاہیں پست رکھنے کا حکم دیتا ہے اور جو چیز ازروئے شرع ناجائز ہے اس کی طرف سے نظر پھیر لینے کی تلقین کرتا ہے، اگر کسی شخص کی نگاہ اچانک کسی ممنوع چیز پر پڑ جائے تو بحیثیت مسلمان اپنی نگاہ التفات ادھر سے جتنی جلد ممکن ہو سکے موڑ لینی چاہیے۔ ابوزرعہ بن عمروؓ کا بیان ہے کہ ان کے جد امجد حضرت جریر بن عبد اللہ البجلی نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے اتفاقی نگاہ کے تعلق سے استفسار کیا تو آپؐ نے فرمایا کہ اپنی نگاہ جتنی جلد ممکن ہو سکے ادھر سے موڑ لو﴿ صحیح مسلم بشرح نووی: باب نظر الفجاءة، ج/ ۴، ص/ ۸٦۷﴾، اسی طرح ایک دیگر مقام پر عورتوں کو خطاب کرتے ہوئے اللہ تعالی کہتا ہے:" اور اے میرے نبی! آپ ایمان والی عورتوں سے کہ دیجیے کہ وہ اپنی نگاہیں نیچی رکھیں، اور اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کریں، اور اپنی زینت کو ظاہر نہ کریں، سوائے اس کے جو ظاہر

رہتا ہے، اور اپنے گریبانوں پر اپنی اوڑھنیاں ڈالے رکھیں، اور اپنا بناؤ سنگار کسی کے سامنے ظاہر نہ کریں، سوائے اپنے شوہروں کے، یا اپنے باپ کے، یا اپنے شوہروں کے باپ کے، یا اپنے بیٹوں کے، یا اپنے شوہروں کے کے بیٹوں کے، یا اپنے بھائی کے، یا اپنے بھائیوں کے بیٹوں کے، یا اپنی بہنوں کے بیٹوں کے، یا اپنی عورتوں کے، یا اپنے غلاموں کے، یا گھر میں رہنے والے ان لوگوں کے سوا جو عورت کی خواہش نہیں رکھتے، یا ان بچوں کے سوا جو ابھی عورتوں کے پوشیدہ اعضا سے آشنا نہیں ہیں، اور اپنے پاؤں زمین پر مار کر نہ چلیں، تاکہ ان کی پوشیدہ زینت لوگوں کو معلوم ہو جائے، اور اے مومنوں! تم سب ملکر اللہ کے حضور توبہ کرو، تاکہ کامیابی سے ہمکنار ہو سکو۔

اللہ تعالی نے عورتوں اور مردوں کو ان چیزوں کی جانب دیکھنے سے منع فرمایا ہے جو شرعی حیثیت سے ممنوع ہے، اس نے دونوں کو اپنی عفت و عصمت اور عزت و آبرو کی حفاظت کا بھی حکم دیا ہے، اس لیے عورتوں کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ اپنی ستر پوشی کریں، رخ زیبا کو پوشیدہ رکھیں، نقاب کا استعمال کریں اور حجاب کا اہتمام کریں، اظہار زینت سے بچیں اور اپنے قدرتی حسن کو سب لوگوں سے مخفی رکھیں سوائے ان لوگوں کے جن کا ذکر مذکورہ بالا آیت میں ہوا ہے، ایسے تمام دیگر حالات میں، اللہ تعالی نے عورتوں کو حکم دیا ہے کہ اپنے سینوں کو بذریعہ حجاب ڈھانک کر رکھیں، اور اپنی پوشیدہ زینت اور مخفی حسن کی جانب لوگوں کی نگاہ التفات نہ مبذول کرائیں، بطور نتیجہ آیت کا اختتام کرتے ہوئے اللہ تعالی کہتا ہے کہ توبہ صادق ہی در حقیقت نجات کا واحد وسیلہ اور مغفرت کا مؤثر ترین ذریعہ ہے، اللہ تعالی نے عورتوں کو کچھ مخصوص احکام اور اہم شرائط کو ملحوظ خاطر رکھنے کو حکم دیا جو مندرجہ ذیل سطور میں درج ہیں:

ا- اپنی نگاہ کو شہوت انگیز مناظر سے دور رکھنا

مومن عورتوں کو اللہ کی طرف سے یہ واضح پیغام ہے، ابن کثیر کا کہنا ہے: "عورتوں کو اپنی نگاہیں ان تمام تر چیزوں سے پھیر لینی چاہیے جو انکے لیے ممنوع قرار دی گئی ہیں، بطور نتیجہ، کچھ علما کا اعتقاد ہے کہ عورتوں کو ایسا بہر حال کرنا چاہیے خواہ وہ کسی چیز کو بہ نگاہ شہوت دیکھتی ہوں یا خالی از شہوت، اس مسئلہ کو پایہ تحقیق تک پہنچانے کے لیے ابو داود اور ترمذی کی اس حدیث کو بطور دلیل پیش کیے ہیں جو مندرجہ ذیل ہے: امام زہری سے منقول ہے کہ ام سلمہؓ نے بیان کیا: "میں رسول پاک ﷺ کے پاس گئی اور وہاں حضرت میمونہؓ بھی موجود

تھیں، پھر اسی لمحہ عبد اللہ بن ام مکتوم بھی تشریف لائے، اور یہ اس وقت کی بات ہے جب پردہ کا حکم نازل ہو چکا تھا، آپؐ نے کہا کہ: تم دونوں ان سے پردہ کرو۔ ہم نے کہا کہ اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کیا وہ اندھے اور بینائی سے محروم نہیں ہیں، اور کیا وہ ہمیں دیکھنے سے عاجز نہیں ہیں؟ آپ نے فرمایا: "لیکن تمہارا کیا معاملہ ہے، تم دونوں تو دیکھ سکتی ہو نا؟" ﴿عون المعبود فی شرح سنن ابی داؤد: ج/۱۱، ص/۱۶۹، بسند ضعیف﴾۔

حالانکہ علما کی ایک جماعت کا یہ موقف ہے کہ اگر عورت خواہش بد کی شکار نہیں ہے تو پھر اسے مردوں کا دیکھنا جائز اور درست ہے، آپؐ حضرت عائشہؓ کو حبشیوں کا کھیل دیکھنے کی اجازت مرحمت فرماتے تھے جبکہ وہ عید با سعید کی مناسبت سے نیزہ بازی کرتے تھے، حضرت عائشہ کا بیان ہے: "نبی صلی اللہ علیہ وسلم مجھے اپنے کپڑے سے چھپا لیا کرتے تھے جب میں حبشیوں کا کھیل دیکھتی تھی، جو مسجد کی صحن میں کھیلا کرتے تھے، میں مسلسل دیکھتی رہتی تھی تا آنکہ کافی حد تک دیکھ لیتی" ﴿فتح الباری بشرح صحیح البخاری: ج/۹، کتاب النکاح، ص/۲۳۶﴾ ۲- عورتوں کی عفت و عصمت کی حفاظت کرنا؛

اللہ تعالی نے عورتوں کو اپنی عفت و عصمت کی حفاظت کا حکم دیا ہے، یعنی مخصوص اعضا اور پوشیدہ مقامات کو تحفظ فراہم کرنے کا حکم دیا ہے، اس بات کی مزید وضاحت کرتے ہوئے سعید ابن جبیر نے کہا ہے: " ہر طرح کی غیر قانونی جسمانی تعلقات اور شہوت انگیز سرگرمیوں سے بچنا ہے"، اور قتادہ و سفیان نے کہا ہے: " ان تمام چیزوں سے اجتناب برتنا ہے جو ان کے لیے ممنوع قرار دی گئی ہیں"، اور مقاتل کے بقول: "غیر شرعی شہوت انگیز حرکات سے کنارہ کش رہنا ہے"، جبکہ ابو عالیہ نے کہا ہے: " قرآن کے دیگر مقامات میں اس طرح کے الفاظ غیر قانونی طور پر شہوانی خواہشات کی تکمیل کی طرف اشارہ کرتے ہیں، لیکن اس آیت میں ان سے مراد یہ ہے کہ کوئی بھی شخص قابل ستر اعضا کو نہیں دیکھ سکتا"۔ ﴿تفسیر القرآن العظیم لابن کثیر؛ ج/۳، تفسیر سورۃ النور، ص/۲۸۳﴾

۳- اپنی آرائش و زیبائش کو پوشیدہ رکھنا؛

آیت میں وارد اس حکم کی تشریح کرتے ہوئے امام قرطبی رقم طراز ہیں: "باایمان عورتوں کو اللہ تعالی نے حکم دیا ہے کہ وہ اپنی صورت، حسن، جسمانی کشش اور اعضا کے نشیب و فراز کو پوشیدہ رکھیں بجز ان لوگوں

سے جن کا ذکر آیت میں ہوا ہے، یہ حکم اس لیے ہے تاکہ شہوت انگیز مقامات سے محفوظ رہیں اور نفسانی خواہشات کو برانگیختہ کرنے والے عوامل و محرکات سے دوری بنی رہے"، ابن مسعود نے کہا کہ:"ظاہری زینت سے مراد کپڑے ہیں"، اور اس پر مزید تعلیق چڑھاتے ہوئے ابن جبیر نے کہا: چہرہ ہے، امام اوزاعی عطاء اور سعید بن جبیر نے بھی کہا ہے:" چہرہ، دونوں ہتھیلیاں اور کپڑے مراد ہیں"، ابن عباس، قتادہ اور مسور بن مخرمہ کا خیال ہے:"ظاہری زینت سے مراد سورمہ، مہندی، کان کی بالی اور انگوٹھی ہے"، بہر حال، جو اعضا دوران نماز اور فریضہ حج کی انجام دہی کے وقت نمایاں ہوتے ہیں وہ چہرہ اور ہاتھ ہیں، امام قرطبی کا کہنا ہے کہ محض ہاتھ اور چہرہ ان قابل ستر اعضا میں سے ایسے ہیں جنہیں استثنا حاصل ہے، باقی تمام اعضا کو ڈھکنا لازم ہے﴿الجامع لاحکام القرآن للقرطبی:ج/٦، تفسیر سورۃ النور، ص/٤٦٢﴾

عائشہ صدیقہؓ کے حوالے سے امام ابو داؤدؒ نے ایک حدیث نقل کی ہے کہ اسماء بنت ابی بکرؓ خدمت نبوی میں تشریف لائیں، لیکن ان کا پوشاک نہایت ہی باریک تھا، آپ ﷺ نے اپنی نگاہ مبارک ان سے پھیر لی اور یوں گویا ہوئے:"اے اسماء! جب ایک عورت سن بلوغت کو پہنچ جائے تو اسے فقط اسے اور اسے ہی کھلا رکھنا چاہیے"، اور آپ نے اپنے چہرے اور ہاتھ کی طرف سے اشارہ کیا"۔﴿ابوداؤد شریف:ج/١١، ص/١٦١؛ واضح رہے کہ امام ابو داؤد نے اس حدیث کو مرسل کہا ہے، کیونکہ خالد بن دریک کی حضرت عائشہ سے لقاء ثابت نہیں ہے﴾ امام قرطبیؒ ابن خویز کا موقف ذکر کرتے ہیں، ابن خویز کا موقف کچھ یوں ہے:"اگر کوئی عورت بہت زیادہ پرکشش اور جاذب نظر ہو اور اپنے چہرے اور بازؤں کو نمایاں رکھتی ہو، تو یہ حرکت فتنہ پیدا کر سکتی ہے، اس صورت میں اس کے لیے مناسب یہی رہے گا کہ وہ اپنے پورے سراپا کو ڈھک کر رکھے"۔﴿الجامع لاحکام القرآن للقرطبی؛ تفسیر سورۃ النور، ج/٦، ص/٤٦٢﴾ چنانچہ عورت کو اپنا بال، گردن اور سینہ پوشیدہ رکھنا چاہیے، امام قرطبی مزید کہتے ہیں:"اس کی وجہ یہ ہے کہ عورتیں اس زمانے میں جب اپنے بال کو ڈھکتی تھیں تو اپنے دوپٹے کو پست کی طرف لٹکا لیتی تھیں، اس طرح ان کی گردن اور کان نمایاں طور پر دکھتے تھے۔ نقاش کا کہنا ہے: اسی طرح نبطی لوگ بھی کرتے تھے، چنانچہ سینہ، گردن، اور دونوں کان بغیر پردہ کے ہوتے اس لیے اللہ تعالی نے قمیص کے کٹے ہوئے مقام پر دوپٹہ لپیٹنے کو کہا"۔﴿حوالہ سابق﴾۔ یہی سبب ہے کہ اللہ تعالی نے مومن عورتوں کو اپنا دوپٹہ جسم کے اعضا جیسے بدن، چہرہ، گردن اور سینہ پر ڈالنے کو کہا ہے، جب

یہ مقدس پیغام ان کے پردہ سماعت سے ٹکرایا تو اس کو عملی جامہ پہنانے میں انہوں نے کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا، اس پر انہوں نے عمل در آمد کیا اور اس حکم ربانی کے سامنے سر تسلیم خم کر دیا۔ حضرت عائشہ سے مروی ہے، کہتی ہیں: "رحمت الٰہی سایہ فگن ہو ان پہلی مہاجرین عورتوں پر کہ جب آیت قرآنی "ولیضربن بخمرھن علی جیوبھن "کا نزول ہوا تو انہوں نے اپنے پیش بند اور ازار کو چاک کر بطور دوپٹہ استعمال کر لیا" ﴿فتح الباری بشرح صحیح البخاری؛ج/ ۴، ص/۴۸۹﴾

اس پاکیزہ حکم کے پس پردہ فرد و سماج کو فحاشی، بے حیائی، اخلاق باختگی، عریانیت، حیا سوزی اور زنا وبدکاری سے تحفظ فراہم کرنے کا مقصد کارفرما ہے، اسی لئے عورتوں کو اس بات کی اجازت دی گئی ہے کہ وہ اپنی زینت وزیبائش اور سجاوٹ و آرائش کو اپنے شوہروں کے سامنے ظاہر کریں اور ان متعلقین اور رشتہ داروں کے سامنے بھی جو نہ ان سے شادی کا جواز رکھتے ہیں نہ ان کے سامنے مشتعل اور برانگیختہ ہو سکتے ہیں ﴿فی ظلال القرآن؛ سید قطب، ج/ ۴، تفسیر سورۃ النور، ص/۲۵۱۳﴾۔ سید قطب نے مزید تشریح کرتے ہوئے لکھا ہے:" اس طرح کی پابندیوں کے پیچھے در حقیقت احتیاط کی حکمت کارفرما ہے؛ قرآن کی مختلف آیات میں، اللہ رب العالمین عورتوں کو دانستہ طور پر اپنی پوشیدہ زینت کی طرف توجہ مبذول کرانے کے عمل سے روکتا ہے، تاکہ کسی مرد کی خفتہ وخوابیدہ شہوانی جذبات انگڑائیاں نہ لینے لگیں، چنانچہ اللہ کا فرمان ہے:" اور اپنے پاؤں زمین پر مار کر نہ چلیں، تاکہ ان کی پوشیدہ زینت لوگوں کو معلوم ہو جائے"۔ ﴿سورۃ النور: آیت نمبر ۳۱﴾ یہ حکم در حقیقت انسانی مزاج، انسانی دل، اس کے اجزاء اور رد عمل کی گہری معلومات اور عمیق مطالعہ کے بدولت عالم وجود میں آتا ہے۔ بلاشبہ، باطل تصورات اور شہوانی خیالات نفسانی خواہشات کو برانگیختہ کرنے میں خطرناک کردار ادا کرتے ہیں، قرآن مقدس انسانی فطرت کی ایک کامل کیفیت پیش کرتا ہے اور در آخر مسلمانوں کو راہ توبہ کی جانب گامزن کرتا ہے، فرمان الٰہی ہے:" اے مومنوں! تم سب ملکر اللہ کے حضور توبہ کروا، تاکہ تم کامیابی سے ہمکنار ہو سکو" ﴿سورۃ النور: ۳۱﴾ مذکورہ بالا آیت پر تبصرہ کرتے ہوئے امام قرطبی رقم طراز ہیں:" ہمیں یہ فراموش نہیں کرنا چاہئے کہ ہمارا جو مقصد ہے وہ دراصل عفت و عصمت کا حصول ہے"۔ ﴿القرطبی؛ ج/ ٦، ص/ ۴٦۳﴾ امام ترمذیؒ سے مروی ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:" ہر غیر شرعی نگاہ باعث گناہ ہے، اور ہر وہ عورت جو خوشبو استعمال کر کے لوگوں کے پاس سے سے گزرتی ہے تاکہ لوگ اس کی

مہک اور خوشبو کو محسوس کریں تو وہ عورت بد چلن و بدکار ہے"۔﴿سنن الترمذی؛ج/۵،باب ما جاء فی کراھیۃ المرأۃ المتعطرۃ﴾ اللہ تعالی نے اس طرح کی عفت و عصمت کی اہمیت پر کافی زور دیا ہے تاکہ فتنہ میں مبتلا ہونے سے انسانی معاشرہ محفوظ رہ سکے۔ یہی وجہ ہے کہ جو عورت مذکورہ بالا اصول وضوابط اور آداب کی پاسداری نہیں کرتی ہے وہ حقیقت میں گناہ عظیم کے ارتکاب میں ملوث ہو جاتی ہے۔ نبیؐ نے واضح طور پر اور پوری تاکید کے ساتھ خوشبو استعمال کر کے عورتوں کو مسجد میں حاضر ہونے سے منع کیا ہے، چنانچہ آپ کا فرمان ہے:"کوئی بھی عورت جو خوشبو کا استعمال کرتی ہے ہمارے ساتھ اسے عشاء کی نماز میں شرکت نہیں کرنی چاہیے "﴿عون المعبود فی شرح سنن ابی داؤد ج۱۱ باب ۶ فی طیب المرأۃ للخروج رقم ۴۱۵۷ ص ۲۳۱﴾

ابن کثیر کا کہنا ہے:"زمانہ جاہلیت کی عورتیں خاموش قدموں کے ساتھ ادھر ادھر چلتی تھیں، لیکن جب باہر نکلتی تھیں تو قدموں کی بلند آوازی کے ساتھ چلتی تھیں تاکہ مرد حضرات ان کے وجود کو محسوس کر سکیں، اللہ تعالی نے مومن عورتوں کو ان کے نقش قدم پر چلنے سے منع کر دیا ہے اور ساتھ ہی قصداً اظہار زینت سے منع فرمایا ہے، اور پوشیدہ زینت کو عیاں کرنے سے سختی سے روکا ہے، نیز گھر سے نکلنے سے پہلے خوشبودار تیل استعمال کرنے سے بھی منع کیا ہے"﴿ابن کثیر،ج/۳،ص/۲۸۵﴾

قرآن کی یہ آیت "اور اپنے پاؤں زمین پر مار کر نہ چلیں، تاکہ ان کی پوشیدہ زینت لوگوں کو معلوم ہو جائے " ان تمام تر سرگرمیوں اور پیش رفت سے ممانعت پر دلالت کناں ہے جو کسی بھی جہت سے مردوں کے جذبات کو برانگیختہ کرسکتے ہیں اور ان کے خوابیدہ شہوانی جذبات کو مہمیز لگاسکتے ہیں، کیونکہ ایسا رویہ اور طرز عمل عفت و پاکدامنی اور زیرکی و دانائی کے متصادم ہے، امر واقعہ یہ ہے کہ حجاب سے متعلق قوانین وضوابط سورہ نور میں تفصیل کے ساتھ مذکور ہیں اور سورہ الاحزاب میں عمومیت کے ساتھ ان کا تذکرہ ہوا ہے جو اس طرح ہے:

"اے میرے نبی! آپ اپنی بیویوں سے اور بیٹیوں سے، اور مومنوں کی عورتوں سے کہہ دیجیے کہ وہ اپنی چادروں کا ایک حصہ اپنے اوپر لٹکالیا کریں، یہ اس بات کے زیادہ قریب ہے کہ وہ پہچان لی جائیں اور انہیں کوئی تکلیف نہ پہنچائے، اور اللہ بڑا مغفرت کرنے والا، بے حد رحم کرنے والا ہے"﴿سورۃ الاحزاب:۵۹﴾

حضرت عائشہؓ نے زوجہ رسول حضرت سودہؓ کے احوال کو نقل کیا ہے جس میں حضرت سودہ سے حضرت عمر نے کہا کہ کچھ ایسی چیزوں پر غور وفکر کیا جائے جس کی وجہ سے آپ لوگوں کو باہر نکلتے وقت کوئی پہچان نہ سکے، جب یہ بات حضرت سودہ نے اپنے شوہر نامدار حضرت محمد ﷺ کو بتلایا تو آپ گویا ہوئے:"تم عورتوں کو حسب ضرورت باہر جانے کی اجازت حاصل ہے "﴿فتح الباری بشرح صحیح البخاری؛ ج/۸، ص/۵۲۷﴾۔ درحقیقت حضرت عمر یہ نہیں چاہتے تھے کہ کوئی شخص ازواج مطہراتؓ کو دیکھ سکے، نہ وہ بر سر عام نکلیں، یہ تجویز انہوں نے نبی ﷺ کے سامنے رکھی، اور عرض پرداز ہوئے:"یارسول اللہ آپ اپنی بیویوں کو حجاب کی تلقین کیجیے "حضرت عمر اس تجویز پر مصر رہے تا آنکہ آیت حجاب کا نزول ہوا۔ حضرت عمر پھر بھی یہ نہیں چاہتے تھے کہ ازواج مطہرات گھروں سے باہر نکلیں خواہ باحجاب ہی سہی، حضرت عمر کو اس خیال کو پالنے سے منع کر دیا گیا اور اللہ تعالی نے عورتوں کو اجازت دے دی کہ وہ حاجت وضرورت کے پیش نظر باہر جا سکیں، تاکہ پریشانیوں کا ازالہ اور مشقتوں کا خاتمہ ہو﴿حوالہ سابق؛ ص/۵۲۸﴾ یہ روایت درحقیقت ان لوگوں کی فکر ناقص اور فہم ضعیف کے خلاف ایک ثبوت ہے جو اپنی بیویوں کو اپنے گھروں سے باہر نہیں جانے دیتے، کیونکہ وہ اس قرآنی آیت کی تاویل باطل کرتے ہیں (وقرن في بيوتكن ولا تبرجن تبرج الجاهلية الأولي) کہ اپنے گھروں میں ٹھہری رہو اور زمانہ جاہلیت کی عورتوں کی طرح اپنی آرائش وزیبائش کی نمائش نہ کرتی پھرو﴿۳۳: ۳۳﴾ سابقہ آیتوں اور آثار سے ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ پردہ ہر مسلمان عورت پر لازم ہے، تمام سچے اور مخلص مسلمانوں کو اللہ کے قوانین کی پیروی کرنی چاہیے۔ اسلام کسی مخصوص اسلامی لباس کی تعیین نہیں کرتا ہے، بلکہ ایک عورت کو یہ اختیار حاصل ہے کہ ہر اس لباس کو استعمال کرے جو ستر پوشی کے مقاصد کی تکمیل کرتا ہو اور اس میں پردہ کے مطلوبہ شرائط موجود ہوں جو مندرجہ ذیل ہیں: پہلی شرط: اسے ساتر ہونا چاہیے جس سے پورا جسم ڈھک جائے سوائے ان مقامات کے جن کو شریعت نے مستثنی قرار دیا ہے؛

اللہ تعالی کا فرمان ذیشان ہے:" اے میرے نبی! آپ ایمان والی عورتوں سے کہہ دیجیے کہ وہ اپنی نگاہیں نیچی رکھیں اور اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کریں، اور اپنی زینت کو ظاہر نہ کریں، سوائے اس کے جو ظاہر رہتا ہے، اور اپنے گریبانوں پر اپنی اوڑھنیاں ڈالے رکھیں، اور اپنا بناؤ سنگار کسی کے سامنے ظاہر نہ کریں، سوائے اپنے شوہروں کے یا اپنے باپ کے، یا اپنے شوہروں کے باپ کے، یا اپنے بیٹوں کے، یا اپنے شوہروں کے بیٹوں

کے، یا اپنے بھائی کے، یا اپنے بھائیوں کے بیٹوں کے، یا اپنی بہنوں کے بیٹوں کے، یا اپنی عورتوں کے، یا اپنے غلاموں کے، یا گھر میں رہنے والے ان لوگوں کے سوا جو عورت کی خواہش نہیں رکھتے، یا ان بچوں کے سوا جو ابھی عورتوں کے پوشیدہ اعضا سے آشنا نہیں ہیں، اور اپنے پاؤں زمین پر مار کر نہ چلیں، تاکہ ان کی پوشیدہ زینت لوگوں کو معلوم ہو جائے، اور اے مومنوں! تم سب ملکر اللہ کے حضور توبہ کرو، تاکہ کامیاب ہو جاؤ" ﴿۲۴: ۳۱﴾

دوسری جگہ اللہ کہتا ہے:

"اے میرے نبی! آپ اپنی بیویوں سے اور بیٹیوں سے، اور مومنوں کی عورتوں سے کہہ دیجیے کہ وہ اپنی چادروں کا ایک حصہ اپنے اوپر لٹکا لیا کریں، یہ اس بات کے زیادہ قریب ہے کہ وہ پہچان لی جائیں اور انہیں کوئی تکلیف نہ پہنچائے، اللہ بڑا مغفرت کرنے والا اور بے حد رحم فرمانے والا ہے" ﴿سورۃ الاحزاب:۵۹،۳۳﴾ "لٹکا لیا کریں" کا مطلب ہے کہ اسے ڈھیلا کر دیں تاکہ پورا جسم ڈھک جائے اور مکمل طور پر پاؤں بھی جیسا کہ مندرجہ ذیل حدیث سے یہ بات سمجھ میں آ رہی ہے:

ام سلمہؓ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا: عورتوں کے کپڑے کا دامن کتنا بڑا ہونا چاہیے؟ آپ نے فرمایا: انہیں بازو کے بقدر لمبا ہونا چاہیے۔ ام سلمہ نے کہا: تب تو پاؤں کھلے رہ جائیں گے۔ اس پر آپ نے جواب دیا: تب اسے ایک ہاتھ کے بقدر لمبا ہونا چاہیے (یعنی تیرہ انچ) اور اس سے زائد نہیں" ﴿سنن الترمذی؛ ج/۴ کتاب اللباس، ذیول النساء، ص/۲۲۳﴾

دوسری شرط: کپڑے ڈھیلے اور موٹے ہو:

نہ تو کپڑا خد و خال کو ظاہر کرے نہ نشیب و فراز کو نمایاں اور نہ ہی جسم کی ہیئت و ساخت کا قصیدہ پڑھے، اگر کپڑا سخت اور تنگ ہے تو پھر جسم کا پورا ڈھانچہ نظر آئے گا، عورت کی نسوانیت عیاں ہو گی اور پوشیدہ اعضا حیطہ نگاہ میں آ جائیں گے، اور عورت عام ناظرین اور بد طینت مشاہدین کو پر کشش لگنے لگے گی۔ یہ چیز واضح طور پر پردہ کے مقصد کو فوت کرتی ہوئی نظر آ رہی ہے، آپ ﷺ نے ایسی عورتوں کو ان عورتوں کے زمرہ میں رکھا ہے جو کپڑا پہننے کے باوجود بھی برہنہ ہوں گی۔ یہ سخت اور تنگ کپڑے پہنیں گی، جسم کے اندرونی اعضا کی نمائش کریں گی، اور ان کا اندرون جسم سب کے مشاہدہ میں آئے گا۔ ایسے ہی آپ ﷺ نے ان عورتوں پر

بھی وعید شدید کی بارش کی ہے جو اپنے جسم کے بعض اجزاء کی ستر پوشی کرتی ہیں اور باقی حصوں کو شیطان صفت نظروں کی رحم و کرم پر چھوڑ دیتی ہیں، اس انداز کی حامل عورتوں کی سرزنش کرتے ہوئے آپ ﷺ نے فرمایا ہے:" صنفان من أهل النار لم أرهما؛ قوم معهم سیاط کأذناب البقر یضربون بها الناس ونساء کاسیات عاریات ممیلات مائلات رؤسهن کاسنمة البخت المائلة لایدخل الجنة ولایجدون ریحها وإن ریحها لیوجد من مسیرة کذا وکذا "﴿ صحیح مسلم بشرح نووی ج ۴ کتاب اللباس ص ۸۴۰﴾ ترجمہ: جہنمیوں کی دو قسمیں ایسی ہیں جنہیں میں نے نہیں دیکھا: پہلی قسم تو ان کی ہے جن کے پاس گائے کی دموں کی طرح کوڑے ہوں گے جن سے وہ لوگوں کو ماریں گے۔ دوسری قسم ان عورتوں کی ہے جو لباس پہننے کے باوجود بھی ننگی ہوں گی، دوسروں کی طرف مائل ہوں گی اور ان کو اپنی طرف مائل کریں گی، ان کے سر بختی اونٹ کے کوہان کی طرح ایک طرف جھکے ہوں گے، وہ جنت میں نہیں جائیں گی اور نہ اس کی خوشبو سونگھیں گی، حالانکہ اس کی خوشبو اتنی اتنی مسافت سے محسوس کی جائے گی۔ تیسری شرط: مردوں کے لباس سے مشابہت نہ رکھتا ہو؛

نبی کریم ﷺ نے مردوں کو عورتوں کے اور عورتوں کو مردوں کا کپڑا پہننے سے منع فرمایا ہے، آپ ﷺ نے ان لوگوں پہ لعنت فرمائی ہے جو ایسا کرتے ہیں، عبد اللہ بن عباسؓ سے مروی ہے، کہتے ہیں:" لعن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم المتشبھین من الرجال بالنساء والمتشبھات من النساء بالرجال "﴿ صحیح بخاری: ج/۱۰، کتاب اللباس، ص/۳۳۲﴾ ترجمہ: اللہ کے رسولؐ نے لعنت فرمائی ہے ان مردوں پر جو عورتوں کی مشابہت اختیار کرتے ہیں اور ان عورتوں پر جو مردوں کی مشابہت اختیار کرتی ہیں۔

چوتھی شرط: خوشبو اور عطر کے استعمال سے بچے؛

اوپر مذکور حدیث نبوی سے یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہوتی ہے کہ عورتوں کو اپنے گھر سے نکلنے سے پہلے خوشبودار چیزوں کے استعمال کو ترک کر دینی چاہیے اور ان تمام اشیا کے استعمال سے بچنا چاہیے جن سے جسم سے خوشبو پھوٹتی ہو، ساتھ ہی مذکورہ آیات اور ذکر کردہ احادیث سے یہ بات بھی اظہر من الشمس ہوتی ہے کہ پردہ ہر مسلمان عورت پر واجب ہے، محققین اور ماہر دینیات اس بات پر متفق ہیں۔ جہاں تک بات ہے چہرہ اور ہاتھ ڈھکنے کی، تو اس سلسلہ میں فقہا اور اہالیان علم و آگہی کی دو آراء و نظریات ہیں:

ایک جماعت کا یہ موقف ہے کہ چہرہ اور ہاتھ قابل ستر اعضا میں شامل ہیں لہذا انہیں ڈھکنا لازم ہے، اس فکر کی تائید حنابلہ اور شوافع کرتے ہیں۔

دوسری جماعت کا یہ موقف ہے کہ چہرہ اور ہاتھ قابل ستر اعضا میں شامل نہیں ہے، لہذا انہیں ڈھکنا لازم نہیں ہے، اس گروپ میں احناف، مالکیہ اور شوافع کا ایک طبقہ شامل ہے۔

دونوں فریق نے کتب و سنت سے دلائل و براہین پیش فرمایا ہے، پھر بھی دونوں نظریات کا گیرائی و گہرائی سے مطالعہ کرنے کے بعد میں مندرجہ ذیل نتائج پر پہنچی ہوں:

۱- تمام ائمہ اس بات پر متفق ہیں کہ فتنہ وفساد کی خدشات کے پیش نظر چہرہ اور ہاتھ کو ڈھکا جائے گا ﴿کتاب الفقه علي المذاهب الأربعة؛ عبد الرحمن الجزيري ج ا كتاب الصلوة ستر العورة خارج الصلوة ص ۱۶۲﴾

۲- ایسی صورتحال میں جبکہ فرد اور سماج دونوں کو اندیشہائے دراز کا خدشہ نہ ہو اور فتنہ سے دونوں مامون ہوں تو ایسی حالت میں چہرہ اور ہاتھ کو کھلا رکھا جاسکتا ہے، اسی طرح ناگزیر حالات کے پیش نظر بھی ایسا کرنے کی اجازت ہے؛ جیسے کچھ خریدنے کی غرض سے، کچھ بیچنے کی غرض سے، بطور گواہ کہیں حاضر ہونے کی غرض سے، یا پھر طبی وجوہات کے مقصد سے۔

۳- ہاتھ اور چہرہ کا ڈھکنا جبکہ فتنہ وفساد کا اندیشہ نہ ہو کار خیر اور تقوی وخشیت الہی پر مبنی عمل مانا جاتا ہے جس کا اجر اللہ تعالی بروز قیامت دے گا، یہ درحقیقت ازواج مطہرات کی نقش پائی اور ان کے طرز زیست پر عمل پیرائی ہے، اور نیک طینت صحابیات رسول کے اسوہ پر عملدرآمد ہے۔ میں ذاتی طور پر پہلے نظریہ کی وکالت اور حمایت کرتی ہوں جس میں یہ ہے کہ چہرہ اور ہاتھ کو باپردہ رکھنا چاہیے خواہ فتنہ وفساد کا ڈر ہو یا نہ ہو۔

اسلام بنی نوع انسان کی ضرورت وحالت کو پیش نگاہ رکھتا ہے، اس کے اصول وضوابط توسط وتوازن اور اعتدال پر قائم ہیں، اس کا اعلاہدف ان تمام تر راہوں کو مسدود کرنا اور چور دروازوں کو بند کرنا ہے جو فتنہ وفساد کا باعث بنتے ہیں ہمارے روزمرہ کے معمول میں رخنہ اندازی کے بغیر جو فرد اور سماج کی بقا لیے لازم وضروری ہے۔ بہر کیف، کتاب وسنت میں ایسے شواہد اور دلائل نہیں ہیں جو عورتوں کو مشاکل اور پریشانی کے وقت ہاتھ اور چہرے کے اظہار سے منع کرتے ہوں، البتہ آرائش وزیبائش، مخصوص جسمانی اعضا اور دیگر جوارح کی

نمائش کے خلاف واضح دلائل کتاب وسنت میں موجود ہیں اور یہ روز مرہ کے معمول حیات میں کسی بھی طرح کی کلفت وپریشانی کا باعث نہیں بنتے ﴿سید ابوالاعلی مودودیؒ؛ پردہ ص / ۳۱۰﴾

اللہ نے عورتوں کی عفت وعصمت اور اس کی عزت وتقدس کے پیش نظر پردہ کو لازم قرار دیا ہے، گردش ایام اور مرور زمانہ نے اس بات کو پایہ ثبوت تک پہنچا دیا ہے کہ آرائش وزیبائش کی نمائش، مرد وزن کا آزادانہ اختلاط اور مقدس تعلیمات کی خلاف ورزی فقط عام رشوت ستانی، معاشرتی بے ہنگمی، سماجی بے حیائی اور عریانیت وبرہنگی کا سبب بنی ہے، اور یہ چیزیں پوری وضاحت کے ساتھ مندرجہ ذیل شکل میں خود کو منظر عام پر لاتی ہیں: زناکاروز افزوں بڑھتا گراف، زنا سے پیدا شدہ مہلک امراض، ناجائز حمل اور طلاق کی بڑھتی ہوئی شرح ﴿عمل المرأة في الميزان؛ الدكتور محمد علي البار ص ۱۳۶ بتصرف يسير﴾

حجاب سے متعلق قوانین وضوابط کا ہدف فرد اور سماج دونوں کو فتنہ اور اللہ کی نافرمانی سے بچانا ہے، اللہ رب العالمین ہم سب لوگوں کو جادہ حق اور راہ راست پر گامزن فرمائے۔ آمین

دسواں باب:

مذہبی حقوق

اسلام نے عبادت اور دیگر مذہبی فرائض کی انجام دہی کے تعلق سے عورتوں کے حقوق کو تسلیم کیا ہے ،یہ بات قرآن میں واضح طور پر موجود ہے اور سنت سے اس کی تصدیق بھی ثابت ہے، اس باب کے مندرجہ ذیل چار حصے عورتوں کے مذہبی حقوق کو زیر بحث لائیں گے اور مختلف کلیدی مسائل کے تعلق سے عورتوں کی قانونی حیثیت کو اجاگر کریں گے۔

ا- مذہبی فرائض کی ادائیگی کے تعلق عورتوں کی اہلیت؛

شرعی امور کی مکلف ہونے کے لیے عورتوں کے اندر کچھ شرائط کا پایا جانا ناگزیر ہے، ان شرائط کی عدم موجودگی میں عورت دائرۂ تکلیف اور حصار فرضیت سے باہر رہے گی۔ اہل علم کی متفقہ رائے ہے کہ شریعت کا مکلف ہونے کے لیے مندرجہ ذیل شرائط کا ہونا لازمی ہے: اسلام۔ بلوغت۔ دماغی توازن اور ان شرائط میں مرد وزن کے مابین کوئی تفریق نہیں ہے۔ ابتدائے آفرینش سے ہی اللہ نے مرد وزن بشمول آدم وحوا علیہما السلام کو اپنے احکام کا مکلف بنایا ہے، تخلیق آدم ہی سے اطاعت کیشی ونافرمانی کا سلسلہ چل پڑا جو تاہنوز برقرار ہے اور تادم دنیا قائم رہے گا، فرمان خداوندی ہے: "وقلنا یا آدم اسکن أنت وزوجک الجنة وکلا منھا رغدا حیث شئتما ولا تقربا ھذہ الشجرة فتکونا من الظالمین {سورۃ البقرۃ؛ رقم الآیۃ ۳۵} ترجمہ: اور اس دن کو یاد کرو! جب میں نے کہا: اے آدمؑ تم اپنی بیوی سمیت جنت میں داخل ہو جاؤ، اور آزادانہ طور پر حسب مرضی کھاؤ اور جنت میں موجود تمام چیزوں سے لطف اندوز ہو، لیکن اس درخت کے قریب تم دونوں مت جانا، بصورت دیگر تم گنہ گاروں میں سے ہو جاؤ گے "۔ اور جب اللہ کو ان کی نافرمانی ناگوار گزری تو اس نے دونوں کی توبہ کے لیے راہ نمائی بھی کی، چنانچہ اللہ کا فرمان ہے: "وناداھما ربھما الم انھکما عن تلکما الشجرۃ" {سورۃ الأعراف؛ رقم الآیۃ ۲۲} ترجمہ: اور جب ان دونوں کے رب نے ان سے کہا کہ کیا میں تم دونوں کو اس درخت سے منع نہیں کیا تھا؟۔ مزید برآں مذہبی فرائض کے معاملے میں مردوں سے عورتوں کی آزادی کو یقینی بنانے اور ان کے ساتھ ہمسری کو مستحکم کرنے کی غرض سے ان کی بیعت علیحدہ لی گئی تھی، فرمان ربانی ہے: " یا أیھا النبي إذا جاءک المؤمنات یبایعنک علي أن لا

يشركن با الله شيئا ولا يسرقن ولا يزنين ولا يقتلن اولادهن ولا ياتين ببهتان يفترينه بين ايديهن وارجلهن ولا يعصينك في معروف فبايعهن واستغفر لهن الله إن الله غفور رحيم "{سورة الممتحنة؛ رقم الآية ۱۲} ترجمہ: اے نبیؐ! اگر آپ کے پاس مومن عورتیں، آپ سے اس بات پر بیعت کرنے کے لیے آئیں کہ وہ اللہ کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہیں بنائیں گی، اور چوری نہیں کریں گی، اور زنا نہیں کریں گی، اور اپنی اولاد کو قتل نہیں کریں گی، اور وہ کسی پر الزام بد نہیں عائد کریں گی، اور کسی بھلائی کے کام میں آپ کی نافرمانی نہیں کریں گی، تو آپ ان سے بیعت لے لیجئے، اور اللہ سے ان کی مغفرت کی دعا کیجئے، بے شک اللہ بڑا معاف کرنے والا، بے حد رحم کرنے والا ہے۔

اس آیت کی تفسیر و تشریح میں امام بخاریؒ حضرت عائشہؓ سے مروی ایک روایت پیش کرتے ہیں جو مندرجہ ذیل ہے: "حضرت عروۃؓ سے روایت ہے کہ زوجہ رسول عائشہ صدیقہ نے انہیں اطلاع دی کہ اللہ کے پیغمبر محمد ﷺ مومن عورتوں کا اس آیت کی روشنی میں امتحان لیتے تھے جب وہ آپ کے پاس بیعت لینے کی غرض سے آتی تھیں، حضرت عائشہ کا بیان ہے: "جو عورت آیت میں مذکور شرائط کی پابندی کا اقرار کرتی آپ اس سے زبانی طور کہتے کہ میں نے تم سے بیعت لے لی، اللہ کی قسم آپ کے ہاتھوں نے بیعت کے سلسلے میں کسی عورت کا ہاتھ کبھی مس نہیں کیا بجز زبان سے یہ کہنے کہ میں نے تم سے بیعت لے لی ﴿فتح الباری بشرح صحیح البخاری ج۸ باب اذا جاءک المؤمنات ص ٦٣٦﴾ ۲- قرآن کریم کی آیتیں مرد و زن دونوں کے لیے یکساں طور پر نازل ہوئی ہیں؛

قرآن کریم میں موجود تعبیرات "اے لوگوں"، "اے انسانوں" کی صدائے بازگشت سے یہ عیاں ہوتا ہے کہ اللہ تعالی نے تمام انسانوں سے خطاب کیا ہے، مرد سے بھی، عورت سے بھی، کالے سے بھی، گورے سے بھی، بادشاہ سے بھی، غلام سے بھی، امیر سے بھی، غریب سے بھی، ہر زبان کے لوگوں سے، ہر مذہب کے لوگوں سے، ہر خطے کے لوگوں سے اور ہر ملک کے لوگوں سے، گویا کہ باری تعالی نے اوامر و نواہی سے متعلق خطاب میں کسی کو مستثنی نہیں قرار دیا ہے۔ قرآن مقدس کا نزول ساری انسانیت کے لیے ہوا ہے اور ہمیشہ کے لیے ہوا ہے، اللہ کے اوامر، نواہی، وعدے اور وعید بلا تفریق مرد و زن سب کو محیط ہیں۔

۳- قرآنی آیات اس بات کا ببانگ دہل اعلان کرتی ہیں کہ شرعی امور کے مکلف ہونے میں مرد وزن دونوں برابر ہیں، ان میں سے چند آیات کا یہاں ذکر کرتی ہوں تاکہ صورت مسئلہ واضح ہو جائے۔ قرآن کریم کی سورت نمبر ۳۳، آیت نمبر ۳۵ میں اللہ رب العالمین کا فرمان ذیشان ہے:"بے شک مسلمان مردوں اور مسلمان عورتوں کے لیے، اور مومن مردوں اور مومن عورتوں کے لیے، اور فرماں بردار مردوں اور فرماں بردار عورتوں کے لیے، اور صبر کرنے والے مردوں اور صبر کرنے والی عورتوں کے لیے، اور عاجزی اختیار کرنے والے مردوں اور عاجزی اختیار کرنے والی عورتوں کے لیے، اور صدقہ کرنے والے مردوں اور صدقہ کرنے والی عورتوں کے لیے، اور روزہ دار مردوں اور روزہ رکھنے والی عورتوں کے لیے اور اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کرنے والے مردوں اور اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کرنے والی عورتوں کے لیے، اور اللہ کو خوب یاد کرنے والے مردوں اور اللہ کو خوب یاد کرنے والی عورتوں کے لیے اللہ نے مغفرت اور اجر عظیم تیار کر رکھا ہے"﴿سورۃ الاحزاب: آیت نمبر ۳۵﴾

چنانچہ اللہ تعالی نے مذہبی امور کی بجا آوری، عبادات کی انجام دہی اور حقوق کی ادائیگی میں مرد وزن کے اشتراک عمل کو مستحکم طور پر بحال کیا ہے، مذکورہ بالا آیات کا پس منظر بیان کرتے ہوئے امام ترمذیؒ ام عمارۃؓ کے حوالے سے ایک حدیث نقل کرتے ہیں کہ ایک انصاری عورت نبی پاک ﷺ کے پاس آئی اور گویا ہوئی:" مجھے قرآن کریم میں عورتوں کے سلسلے میں کہیں کچھ دیکھنے کو نہیں مل رہا ہے"، تب مذکورہ بالا آیت کا نزول ہوا۔﴿سنن الترمذی کتاب تفسیر القرآن ج ۵﴾ اور اس آیت کے سلسلے میں تبصرہ کرتے ہوئے سید قطب کہتے ہیں کہ مرد اور عورت دونوں کا تذکرہ ایک ہی ساتھ ہوا ہے، یہ ان مختلف پہلوؤں کی ایک جھلک ہے جن میں اسلام عورتوں کی تعظیم و تکریم کی بات کرتا ہے اور ان کی شان وشوکت اور رفعت وبلندی کی بحالی کی یقین دہانی کراتا ہے۔ یہ آیت اس بات کی توثیق بھی ہے کہ مرد اور عورت اپنے خالق سے تعلقات کے معاملے میں یکساں حقوق کے مالک ہیں، عبادت میں کوئی تفریق نہیں، دینی فرائض کی ادائیگی میں کوئی تفریق نہیں اور اخلاق وکردار کے مجال میں بھی کوئی تفریق نہیں ہے ﴿فی ظلال القرآن؛ سید قطب، ج ۵ تفسیر سورۃ الاحزاب ص ۲۸۶۳﴾ اسی طرح مندرجہ ذیل آیت مرد وزن دونوں کو احکام الہی کی پابندی اور فرمان نبوی کی تابعداری کا حکم دیتی ہے، چنانچہ ارشاد ربانی ہے:" وما كان لمؤمن ولا مؤمنة إذا قضي الله ورسوله أمرا أن يكون لهم الخيرة من

أمرهم و من يعص الله ورسوله فقد ضل ضلالا مبينا". {سورة الأحزاب؛ رقم الآية ٣٦} ترجمہ: اور جب اللہ اور اس کے رسول کا کسی معاملہ میں فیصلہ آجائے، تو کسی مسلمان مرد اور عورت کے لیے اس سلسلہ میں کوئی اور فیصلہ قبول کرنے کا اختیار باقی نہیں رہتا ہے، اور جو اللہ اور اس کے رسول نافرمانی کرے گا وہ کھلی گمراہی میں مبتلا ہو جائے گا۔

امام قرطبیؒ نے اس سلسلہ میں لکھا ہے:" یہ آیت اس وقت نازل ہوئی جب اللہ کے رسول حضرت زینب کو پیغام نکاح دینے آئے تھے، حضرت زینب رشتہ میں آپ کی چچازاد بہن لگتی تھیں، حضرت زینب نے یہ رشتہ اس خیال سے قبول کر لیا کہ شاید یہ پیغام آپ نے اپنے ہی لیے دیا ہو، لیکن جب بعد میں انکشاف ہوا کہ یہ رشتہ آپ نے حضرت زید کے لیے مانگا تھا تو آپ کبیدہ خاطر اور دل برداشتہ ہو گئیں اور رشتہ کو قبول کرنے سے انکار کر دیا، جب یہ آیت نازل ہوئی تو حضرت زینب حکم خداوندی کی تعمیل میں تیار ہو گئیں اور رشتے کو بخوشی قبول فرما لیں﴿تفسیر القرطبی ج٦ تفسیر سورۃ الاحزاب ص ٥٢٦٣﴾

گرچہ یہ آیت مخصوص حالت میں اور کسی خاص پس منظر میں نازل ہوئی ہے، تاہم اس کے قوانین و ضوابط ہر حال میں ہر شخص پر لاگو ہوتے ہیں خواہ وہ مرد ہو یا عورت۔ ۴- دین کی نشر و اشاعت ہر مسلمان مرد اور عورت پر فرض ہے؛

اس حقیقت پر روشنی ڈالتے ہوئے اللہ تعالی کہتا ہے:" ولتكن منكم أمة يدعون إلى الخير و يأمرون بالمعروف وينهون عن المنكر و أولئك هم المفلحون{سورة آل عمران رقم الآية ١٠٤} ترجمہ: تم میں ایک جماعت ایسی ہونی چاہیے جو لوگوں کو بھلائی کی دعوت دے، انہیں کار خیر کا حکم دے اور کار بد سے منع کرے، اور در حقیقت یہی جماعت فلاح و بہبود سے ہمکنار ہو گی۔

بھلائی کا حکم دینا اور برائی سے منع فرمانا ہر مسلمان پر ضروری ہے اور اللہ تعالی نے تمام مسلم مرد و عورت پر اس کام کو انجام دینا ناگزیر قرار دیا ہے، اس کا پیغام ہے کہ ہر مسلمان برائی سے بچے اور لوگوں کو اس سے بچنے کی دعوت دے، نیکی کو انجام دے اور نیکی کی راہ پہ گامزن ہونے کی لوگوں کو تلقین کرے، اور اس فریضہ کی ادائیگی میں مرد و زن دونوں کو شامل کیا ہے اور جنس و صنف کی کوئی تفریق نہیں برتی ہے، چنانچہ ایک مقام پر اس کا یہ فرمان ہمیں یہ پیغام دے رہا ہے:" والمؤمنون والمؤمنات بعضهم أولياء يأمرون بالمعروف

وینھون عن المنکر ویقیمون الصلوۃ ویؤتون الزکاۃ ویطیعون اللہ ورسولہ أولئک سیر حمھم اللہ إن اللہ عزیز حکیم{ سورۃ التوبۃ رقم الآیۃ ۷۱} ترجمہ: اور مومن مرد اور مومن عورتیں ایک دوسرے کے مددگار ہوتے ہیں، بھلائی کا حکم دیتے ہیں اور برائی سے منع کرتے ہیں، اور نماز قائم کرتے ہیں اور زکاۃ دیتے ہیں، اور اللہ اور اس کے رسول کی بات مانتے ہیں، اللہ انہی لوگوں پر رحم کرے گا، بے شک اللہ زبردست، بڑی حکمتوں والا ہے۔ ﴿۹: ۷۱﴾

چنانچہ اللہ تعالی نے امر بالمعروف و نہی عن المنکر پختہ اور سچے مسلمان مرد اور عورت کی زندگی کا جزو لاینفک بنایا ہے، اس سے کسی بھی مسلمان مرد اور عورت کو مفر نہیں ہے، انہیں بہر صورت اس فریضہ کو ادا کرنا ہے۔ دعوت جیسے کار خیر کے عوض میں اللہ نے ان سے شفقت و محبت، ہمدردی و غمگساری اور اجر جزیل کا وعدہ عظیم فرمایا ہے، بہت سارے قرآنی آیات اور نبوی احادیث ہیں جو اس حکم ربانی کی عمومیت کو بیان کرتے ہیں اور اسے قوم مسلم کے ہر فرد پر واجب قرار دیتے ہیں، ارشاد ربانی ہے:" والعصر إن الإنسان لفي خسر إلا الذین آمنوا و عملوا الصالحات و تواصوا بالحق و تواصوا بالصبر{ سورۃ العصر} ترجمہ: قسم ہے زمانے کی، تمام انسان خسارے میں ہے، سوائے ان لوگوں کے جو ایمان لائے اور انہوں نے نیک کام کیے، اور ایک دوسرے کو نصیحت کی، اور ایک دوسرے کو صبر کی تلقین کی۔

نبی کریم ﷺ نے اس مذہبی فریضہ کی اہمیت پر مزید روشنی ڈالی ہے اور خصوصیت کے ساتھ اس کی فضیلت کو بیان کیا ہے، آپ کا یہ مقدس فرمان ہے:" من رأي منکم منکرا فلیغیرہ بیدہ، فإن لم یستطع فبلسانہ، فإن لم یستطع فبقلبہ وذلک أضعف الإیمان{ صحیح مسلم بشرح النووي ج ۱ کتاب الإیمان ص ۲۲۷} ترجمہ: تم میں سے جو شخص برائی کو دیکھے اسے چاہیے کہ وہ اس برائی کو اپنے ہاتھ سے روکے؛ اگر ایسا کرنے پر قادر نہ ہو تو اسے اپنی زبان سے روکے اور اگر زبان سے بھی استطاعت نہیں رکھتا ہے تو پھر اسے اپنے دل ہی میں برا جاننا چاہیے اور یہ ایمان کا کمزور ترین درجہ ہے۔ اس طرح آپؐ نے پوری تاکید کے ساتھ ہر مسلمان مرد اور عورت کو بھلائی کا حکم دینے اور برائی سے منع کرنے کا حکم دیا ہے۔ ۲۔ سنن و نوافل پر مشتمل عبادات کے تعلق سے عورتوں کی ذمے داریاں؛

مسلمان مرد اور عورت فرض عبادات سے متعلق فرائض کی ادائیگی میں یکساں ذمہ دار ہیں، خواہ وہ نماز ہو، یا روزہ ہو، یا زکاۃ ہو یا پھر حج ہو، اس ذمہ داری کی ادائیگی میں مرد وزن کے مابین شریعت نے کوئی تفریق نہیں برتی ہے، بلکہ ان امور کی انجام دہی میں دونوں کو یکساں طور پر مکلف بنایا ہے، خواہ نفلی عبادات ہوں یا صدقات وخیرات پر مبنی عمل۔ محمد عزۃ دروزۃ لکھتے ہیں: "اہل علم اور وہ لوگ جو قرآنی معلومات میں درک رکھتے ہیں اس بات پر متفق ہیں کہ جب کبھی اللہ تعالی قرآن کریم میں واحد یا جمع کے صیغوں کے ساتھ اہل ایمان کو خطاب کرتا ہے تو اس میں مرد وزن دونوں برابر کے شریک ہوتے ہیں، خواہ وہ خطاب فرائض سے تعلق رکھتا ہو، سنن سے تعلق رکھتا ہو یا پھر مستحبات سے، حقوق سے تعلق رکھتا ہو، یا اخلاقیات سے تعلق رکھتا ہو یا پھر اصول حیات سے، ان تمام حالات میں باری تعالی اپنے خطاب کے ذریعے بلا تفریق مرد وزن سب کو یکساں طور پر مخاطب کرتا ہے اور کسی کو کسی پر ترجیح نہیں بخشتا ہے"۔ ﴿المرأة في القرآن والسنة؛ محمد عزة دروزة ص ۳۲﴾
گرچہ عورتوں پر کچھ مخصوص احوال کا نزول ہوتا ہے، وہ کچھ خاص کیفیات سے دوچار ہوتی ہیں اور کچھ ایسے مسائل جنم لیتے ہیں جو نماز، روزہ اور حج کی انجام دہی میں دخل اندازی کرتے ہیں، تاہم یہ چیزیں عورتوں سے شریعت کی پابندی کو ہمیشہ کے لیے ختم نہیں کرتی ہیں نہ ان کے متعلق شریعت کے قوانین وضوابط سے تعرض کرتی ہیں، بلکہ شریعت کا معاملہ حسب دستور برقرار رہے گا لیکن عارضی موانع کے پیش نظر عورتوں کو اس میں خصوصی سہولت فراہم کی جائے گی، حالت حیض یا وضع حمل سے پیدا شدہ حالات کے پیش نظر عورتوں پر واجب تین اہم ترین عبادات کے متاثر ہونے کی تفصیل مندرجہ ذیل سطور میں پیش کرنے کی زحمت کر رہی ہوں:

۱- نماز:

نماز پنجگانہ ہر مسلمان مرد اور عورت پر فرض ہے، کیونکہ اللہ کے اس قول کی عمومیت اس پر دلالت کرتی ہے، قول باری تعالی ہے: "اقیموا الصلوۃ و آتوا الزکاۃ" {سورۃ البقرۃ رقم الآیۃ ۱۰۱} ترجمہ: نماز قائم کرو اور زکاۃ دو۔ اور دوسری جگہ ہے: "إن الصلوۃ کانت علی المؤمنین کتابا موقوتا {سورۃ النساء رقم الآیۃ ۱۰۳} ترجمہ: بے شک نماز مسلمانوں پر وقت مقررہ پر فرض ہے۔ ان تمام باتوں کے باوجود حالت حیض ونفاس میں عورتوں کو نماز سے روک دیا گیا ہے، ساتھ ہی مردوں کے برعکس عورتوں کو مسجد میں باجماعت نماز پڑھنے سے مستثنی قرار دیا گیا

ہے، ان کی مسجد ان کا گھر ہی بتایا گیا ہے اور اس عمل پر ابھارنے کے لیے اللہ تعالی نے عورتوں کو اپنے گھر یا گھر کے قریب نماز پڑھنے کی ترغیب دی ہے اور اس عمل کو مستحسن قرار دیا ہے۔ نبی پاک کا فرمان ذیشان ہے: "لا تمنعوا نسائکم المساجد وبیوتھن خیر لھن {عون المعبود في شرح سنن أبي داود ج ۲ کتاب الصلوۃ ص ۲۸۴} ترجمہ: اپنی بیویوں کو مسجدوں سے نہ روکو اور ان کا گھر ان کے لیے بہتر ہے۔

ان باتوں پر غور کیا جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ اسلام نے عورتوں کے نازک مسائل اور گھر کی باریک ترین ذمے داریوں کو بھی خصوصیت کے ساتھ پیش نگاہ رکھا ہے، کیونکہ عورتوں کا پانچوں وقت مسجد جانا باعث تکلیف ہے، اور مردوں کے ساتھ اختلاط کا امکان بھی پیدا ہوتا ہے جو بہت ساری پریشانیوں کا سبب اور فتنوں کی وجہ بن سکتا ہے، یہی وجہ ہے کہ عورتوں کو مساجد میں مردوں کے ساتھ باجماعت نماز پڑھنے کی بجائے تن تنہا گھروں میں نماز پڑھنے کی ترجیحی طور پر تلقین کی گئی ہے تاکہ فتنہ وقوع پذیر نہ ہو، اور ساتھ ہی مردوں کے برابر ثواب کا وعدہ بھی کیا گیا ہے اور اس میں کسی طرح کی کٹوتی نہیں کی گئی ہے بلکہ جس طرح باجماعت نماز پڑھنے والا مرد ثواب کا حقدار ہے بعینہ گھر میں نماز پڑھنے والی عورت بھی ثواب کا بھرپور حق رکھتی ہے، اللہ تعالی نے عبادت سے متعلق عورتوں کی ذمے داریوں کو اجاگر کیا ہے، کچھ مراعات بھی فراہم کی ہے لیکن نہ ان کے ثواب میں کسی تخفیف کا اعلان کرتا ہے نہ مذہبی فرائض کی انجام دہی سے انہیں مستثنی قرار دیتا ہے۔ ۲- روزہ:

رمضان المبارک کا روزہ رکھنا ہر مسلمان مرد اور عورت پر فرض ہے، اللہ تعالی کا فرمان ہے: " یا أیھا الذین آمنوا کتب علیکم الصیام کما کتب علي الذین من قبلکم لعلکم تتقون {سورۃ البقرۃ: رقم الآیۃ ۱۸۳} ترجمہ: اے ایمان والو! تم پر روزے فرض کر دیئے گئے ہیں ویسے ہی جیسے تم سے پہلے لوگوں پر فرض کیے گئے تھے، تاکہ تم تقوا کی راہ اختیار کرو۔ دوسری جگہ فرمایا: "شھر رمضان الذي أنزل فیہ القرآن ھدی للناس وبینت من الھدي والفرقان فمن شھد منکم الشھر فلیصمہ {سورۃ البقرۃ رقم الآیۃ ۱۸۵} ترجمہ: وہ رمضان کا مہینہ تھا جس میں قرآن نازل ہوا، جو لوگوں کو راہ راست دکھاتا ہے، اور جس میں ہدایت کے لیے حق و باطل کے درمیان تفریق کرنے والی نشانیاں ہیں، پس جو کوئی اس مہینہ کو پائے وہ روزہ رکھے۔

گرچہ عورتوں کو حالت حیض اور صورت نفاس کے پیش نظر روزہ سے منع کر دیا گیا ہے، تاہم ان مراحل کو عبور کرنے کے بعد بسرعت تمام ان فوت شدہ روزوں کی ادائیگی کا حکم دیا گیا ہے۔ مزید بر آں اسلامی

فقہ اور شرعی ضابطہ حالت حیض ونفاس سے دوچار اور حمل کی کیفیت میں مبتلا عورتوں کو معذور قرار دیتا ہے اور مادر رحم میں پل رہے جنین، یا آغوش میں کھیل رہے شیر خوار بچے کو کسی بھی طرح کی اذیت سے دوچار ہونے کا خدشہ ہو تو ماں کو روزہ ترک کرنے کی رخصت فراہم کرتا ہے، لیکن انہیں ان فوت شدہ ایام کے روزوں کی بلا تاخیر قضا کا بھی حکم دیتا ہے، اس سلسلے میں معاملہ بعینہ ویسا ہی ہے جیسا کہ ایک مریض کا ہوتا ہے۔ جب حسن بصریؒ سے حاملہ اور مرضعہ عورتوں کے بارے میں دریافت کیا گیا تو آپ نے فرمایا:" حمل سے بڑھ کر کون سا مرض شدید ہو سکتا ہے ؟ ایسی صورتحال سے دوچار عورتوں کو روزہ ترک کر دینا چاہیے اور فوت شدہ روزوں کی بلا تاخیر قضا کر لینی چاہیے، اور اس بات پہ گرچہ تمام فقہا کا اتفاق ہے، تاہم اس بات میں ضرور اختلاف واقع ہے کہ آیا روزہ کے ساتھ ساتھ فدیہ دے گی یا صرف روزہ رکھے گی ؟ امام ابو حنیفہ کا موقف یہ ہے کہ وہ فقط روزہ رکھے گی، جبکہ امام شافعی اور احمد کا نقطہ نظر یہ ہے کہ وہ روزہ رکھنے کے ساتھ فدیہ بھی دیگی"۔ ﴿روائع البیان فی تفسیر آیات الاحکام محمد علی صابونی ج ۱ ص ۲۰۹﴾ ۳- حج: مرد و عورت دونوں کو زندگی میں ایک بار جب کہ وہ صاحب حیثیت ہوں حج کرنے کا حکم دیا گیا ہے، اللہ تعالی کا فرمان ہے:" وللہ علي الناس حج البیت من استطاع إلیہ سبیلا{ سورۃ آل عمران: ۹۷} ترجمہ: اور اللہ کی رضا کے واسطے ان لوگوں پر حج کرنا فرض ہے جو وہاں تک پہنچنے کی استطاعت رکھتے ہوں۔

ایک عورت پر لازم ہے کہ حج کے سفر کے دوران کسی محرم کو اپنے ساتھ رکھے، نبی پاک کا ارشاد ذیشان ہے:" لایحل لامرأۃ تؤمن باللہ والیوم الآخر أن تسافر مسیرۃ ثلاث لیال إلا ومعھا ذو محرم"{ صحیح مسلم بشرح النووي ج ۳ کتاب الحج ص ۴۸۴} ترجمہ: کسی بھی عورت کے لیے جو اللہ اور آخرت پر ایمان رکھتی ہو جائز نہیں ہے کہ تین دن کا سفر محرم کے بغیر کرے۔

چنانچہ اسلام عورتوں کو بغیر شوہر یا کسی قریبی محرم کے سفر کرنے سے منع کرتا ہے خواہ وہ سفر حج کی غرض سے ہو، یا تجارت کے مقصد سے، یا پھر کسی اور منصوبہ کے پیش نظر۔ مسلم شریف کی ایک دوسری حدیث سے بھی اس خبر کی تصدیق اور ممانعت کی توثیق ہوتی ہے۔ مسلم شریف کی حدیث کچھ یوں ہے:" عن بن عباس یقول سمعت النبي ﷺ یقول لایخلون رجل بامرأۃ إلا ومعھا ذو محرم.....وکذا قال انطلق فحج مع امرأتک{ صحیح مسلم بشرح النووي ج ۳ کتاب الحج ص ۴۸۴} ترجمہ: عبد اللہ بن عباس کہتے ہیں کہ میں نے رسول

اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ کہتے ہوئے سنا: "کسی بھی شخص کو کسی عورت کے ساتھ محرم کی غیر موجودگی میں تنہائی نہ اختیار کرنی چاہیے، اور کسی عورت کو محرم کے بغیر سفر نہیں کرنا چاہیے"، اس پر ایک شخص کھڑا ہوا اور بولا: "اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم میری بیوی حج کو روانہ ہو چکی ہے، حالانکہ مجھے فلاں فلاں جنگ میں شرکت کی دعوت مل چکی ہے"، اس پر آپؐ نے کہا: "تم جاؤ اور اپنی بیوی کے ساتھ حج کرو"۔

مذکورہ بالا حدیث کی تشریح کرتے ہوئے امام نووی رقم طراز ہیں: "ائمہ اس بات پر متفق ہیں کہ عورت کو اپنی زندگی میں ایک بار حج ضرور کرنا چاہیے، بشرطیکہ وہ سفر کی استطاعت رکھتی ہو اور زاد راہ سے لیس ہو، کیونکہ اللہ کا فرمان ہے: "اللہ کی رضا کے واسطے ان لوگوں پر حج کرنا فرض ہے جو وہاں تک پہنچنے کی استطاعت رکھتے ہوں"۔ ﴿۳: ۹۷﴾ اور نبی کریمؐ کا بھی ارشاد پاک ہے: "اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں پر رکھی گئی ہے، اس بات کی شہادت دینا کہ اللہ کے علاوہ کوئی معبود حقیقی نہیں ہے اور محمد ﷺ اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں، نماز قائم کرنا، زکاۃ ادا کرنا، رمضان کا روزہ رکھنا اور خانہ کعبہ کی زیارت کرنا"۔ ﴿صحیح مسلم بشرح نووی ج ۱ کتاب الایمان ص ۱۷۶﴾ حج کی انجام دہی کے لیے مرد و زن دونوں کی جسمانی و معاشی قوت کا اندازہ ایک ہی پیمانہ سے لگایا جاتا ہے اور دونوں میں اس معاملے میں کوئی تفریق نہیں برتی جاتی ہے۔

بہر کیف، چاروں ائمہ محرم کے مسائل پر متفق نہیں ہیں۔ امام ابو حنیفہؒ کا موقف یہ ہے کہ عورت کے لیے دوران حج محرم کی شرط اس وقت ہے جب کہ سفر تین دن پر مشتمل ہو۔ امام شافعی قبولیت حج کی لیے محرم کی شرط کو معتبر نہیں مانتے ہیں، بلکہ ان کا کہنا ہے کہ عورت کو تحفظ حاصل ہو، وہ خطرات سے مامون ہو اور راستہ میں کسی خلاف توقع حادثات کا اندیشہ نہ تو بغیر محرم کے حج کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے اور یہ تحفظ اپنے شوہر، محرم یا پھر کسی قابل اعتماد عورت کی معیت میں حاصل کیا جا سکتا ہے، وہ مزید کہتے ہیں کہ جب تک ان تینوں اشخاص کا حصول ممکن نہ ہو تب تک اس پر حج کرنا فرض نہیں ہے۔ جمہور علما کا نقطہ نظر یہ ہے کہ محرم کے بغیر ایک عورت حج نہیں کر سکتی ہے اور یہی راجح قول بھی ہے، کیونکہ اس کی حمایت میں دلائل و براہین موجود ہیں۔ ﴿فقہ السنہ للسید سابق ج ۱ ص ۶۳۴﴾

جہاں تک معاملہ جہاد کا ہے، تو اللہ نے اسے فقط مردوں پر فرض قرار دیا ہے، تاہم عورتوں کو مختلف زاویہ سے شرکت کی اجازت بھی دی ہے، جیسے مجاہدین کے لیے کھانا تیار کرنا، انہیں پانی پلانا، زخمیوں کی مرہم پٹی کرنا، مجاہدین میں کھانا تقسیم کرنا اور زخم خوردہ مجاہدوں کا علاج کرنا۔ [111] ذمہ داریاں اور انعامات:

فرائض کی ادائیگی اور ثواب کے حصول میں مرد و زن دونوں برابر کے شریک ہیں، اور ہر فرد بشر انفرادی طور پر اپنی ذمے داریوں کا جواب دہ ہو گا، فرمان باری تعالی ہے: "کل اِمرئ بما کسب رھین". {سورۃ الطور رقم الآیۃ ۲۱} ترجمہ: ہر شخص اپنے معاملات کا ذمہ دار ہو گا۔ اور دوسری جگہ ہے: "کل نفس بما کسبت رھینۃ {سورۃ المدثر رقم الآیۃ ۳۸} یعنی ہر شخص اپنی کارکردگی کے ہاتھوں گروی ہے۔ اور ایک جگہ یہ بھی ہے: "یوم تأتي کل نفس تجادل عن نفسھا وتوفي کل نفس ما عملت وھم لا یظلمون {سورۃ النحل رقم الآیۃ ۱۱۱} یعنی جس دن ہر شخص اپنی نجات کے لیے جھگڑے گا، اور ہر آدمی کو اس کے اعمال کا پورا پورا بدلہ ملے گا، اور ان کے ساتھ ظلم نہیں ہو گا۔

چنانچہ عورتیں بھی اسی لحاظ سے مذہبی فرائض اور دینی عبادات کی مستحق ہیں، ان کی بھی کارکردگی میزان حساب میں رکھی جائے گی، ان کے اعمال بھی پیمانہ انصاف میں رکھے جائیں گے اور انہیں بھی حسب عمل سزا سے دوچار اور جزا سے سرفراز کیا جائے گا۔ کچھ مردوں اور عورتوں کو ان کے نیک اعمال کی بدولت جنت سے ہمکنار کیا جائے گا، جبکہ کچھ کو ان کے جرم عظیم کے سبب سزائے جہیم سے دوچار کیا جائے گا۔ فرمان ربانی ہے: "ومن یعمل من الصالحات من ذکر أو أنثی وھو مؤمن فأولئک یدخلون الجنۃ ولا یظلمون نقیرا". {سورۃ النساء رقم الآیۃ ۱۲۴} ترجمہ: وہ شخص جو نیک عمل کرتا ہو، خواہ مرد ہو یا عورت اور وہ مومن ہو تو وہ سب کے سب جنت میں داخل ہوں گے اور ان کے ساتھ ذرہ برابر بھی ناانصافی نہیں ہو گی۔

مذکورہ بالا آیت کی تفسیر کرتے ہوئے سید قطب کہتے ہیں کہ اعمال و انعامات کو لیکر انسانیت کے دو اجزاء کو باہمی طور پر مشترک ہونے میں اس آیت نے کلیدی کردار ادا کیا ہے، یعنی اس آیت سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ نیکی کی جزا اور بدی کی سزا میں مرد وزن دونوں برابر کے شریک ہیں۔ نیز وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ اللہ تعالی قبولیت عمل کے لیے اپنی ذات پر پر خلوص ایمان کو شرط اولیں قرار دیتا ہے، ایمان کے بغیر کوئی بھی عمل شرف قبولیت سے ہمکنار نہیں ہو سکتا ہے اور ہر کار خیر کو ایمان کی عدم موجودگی میں نظر انداز کر دیا جائے گا، اور یہ

بات فطری اور منطقی بھی ہے، کیونکہ اللہ کی ذات پر ایمان ہی سے نیک عمل کا صدور ممکن ہے اور ایمان باللہ ہی کی بدولت پر خلوص عمل کا امکان روشن ہو سکتا ہے، اور یہ دولت ایمان ہی ہے جو کتاب وسنت کی روشنی میں عمل پر کسی کو آمادہ کر سکتی ہے اور جذبات وخواہشات سے پاک اور عارضی محرکات سے بے نیاز ہو کر عمل صالح کی ترغیب دیتی ہے"۔﴿فی ظلال القرآن سید قطب ج ۲ تفسیر سورۃ النساء ص ۸۶۲﴾

عبادات وانعامات میں مرد وزن کو مساوی قرار دینے والی آیات متعدد ہیں، اللہ تعالی کا فرمان ہے:" من عمل صالحا من ذكر أو أنثى وهو مؤمن فلنحيينه حيوة طيبة ولنجزينهم أجرهم بأحسن ماكانوا يعملون{ سورة النحل رقم الآية ۹۷} ترجمہ: جو کوئی مرد یا عورت نیک کام کرے گا، بشرطیکہ وہ مومن ہو، تو اسے ہم پاکیزہ اور عمدہ زندگی عطا کریں گے، اور ان کے اعمال سے زیادہ اچھا بدلہ انہیں دیں گے۔

لہذا، بروز انصاف ہر شخص کو اس کی نیکی وبدی کے بموجب بدلہ ملے گا اور اس ثواب رسانی وسزادہی کے معاملے میں کسی حیثیت ومنصب، جاہ وحشمت، مال ودولت، خاندانی قربت، سیاسی تحفظ اور شاہی تعلق کا کوئی اعتبار ولحاظ نہیں ہوگا، کار خیر کا بدلہ ثواب کی شکل میں اور کار بد کا صلہ عذاب کی صورت میں جلوہ گر ہوگا، فرمان الہی ہے:" من عمل سيئة فلا يجزى إلا مثلها ومن عمل صالحا من ذكر أو أنثى وهو مؤمن فأولئك يدخلون الجنة يرزقون فيها بغير حساب{ سورة المؤمن رقم الآية ۴۰} ترجمہ: جو شخص برا عمل کرے گا، اسے اسی جیسا بدلہ دیا جائے گا، اور جو اچھا عمل کرے گا، خواہ مرد ہو یا عورت اور وہ مومن ہو، تو ایسے لوگ جنت میں داخل ہوں گے جہاں انہیں بے حساب روزی ملے گی۔

برا عمل سزا کا اور اچھا عمل جزا کا باعث ہوگا، بلکہ کار خیر پر بندہ مومن کو دوگنا اجر سے سرفراز کیا جائے گا جس میں مرد وزن کے مابین کوئی تفریق نہیں ہوگی، یہ بدلہ جنت کی نعمت کی شکل میں ہوگا جو درحقیقت تمام نعمتوں سے اعلاو بالا ہوگی۔ اللہ رب العالمین کا فرمان ذیشان ہے:" وعد الله المؤمنين والمؤمنات جنات تجري من تحتها الأنهار خالدين فيها ومساكن طيبة في جنات عدن ورضوان من الله أكبر ذلك هو الفوز العظيم ".{ سورة التوبة رقم الآية ۷۲} ترجمہ: اللہ نے مومن مردوں اور مومن عورتوں کو جنتوں کا وعدہ کیا ہے جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی جن میں ہمیشہ رہیں گے، اور جنات عدن میں عمدہ مکانات کا وعدہ کیا ہے، اور اللہ کی خوشنودی سب سے بڑھ کر ہوگی، یہی عظیم کامیابی ہوگی۔ چنانچہ، اللہ تعالی نے ان لوگوں سے جو اس کی ذات پر

ایمان رکھتے ہیں جنت نعیم کا وعدہ کیا ہے خواہ وہ مرد ہوں یا عورت۔ بعینہ اللہ تعالی نے تاکیدی طور پر اس بات کو بیان کیا ہے کہ جو مرد اور عورت اپنے دین وایمان کی حفاظت کی غرض سے راہ مہاجرت اختیار کرتے ہیں، اپنے عقیدے کی وجہ سے اپنے گھروں سے نکال دیے جاتے ہیں، اور اس دین پر ثبات قدمی کی وجہ سے مظالم سے دوچار کیے جاتے ہیں، اللہ رب العالمین ان تمام مردوں وعورتوں کو یکساں طور پر انعام وثواب سے سرفراز فرما کر انہیں اعزاز بخشے گا۔ فرمان باری تعالی ہے:" بعضکم من بعض فالذین ھاجروا واخرجوا من دیارھم واوذوا في سبیلي وقاتلوا وقتلوا لاکفرن عنھم سیئاتھم ولادخلنھم جنت تجري من تحتھا الاَنھار ثوابا من عند اللہ واللہ عندہ حسن الثواب {سورۃ آل عمران رقم الآیۃ ۱۹۵} ترجمہ: تم سب آپس میں برابر ہو، پس جن لوگوں نے ہجرت کی، اور اپنے گھروں سے نکال دیے گئے، اور میری راہ میں انہیں تکلیف دی گئی، اور جہاد کیا، اور قتل کیے گئے، میں ان کے گناہوں کو ضرور معاف کر دوں گا، اور انہیں ایسی جنتوں میں داخل کروں گا جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی، اللہ کی جانب سے ان کو یہ اجر ملے گا، اور اللہ کے پاس اچھا بدلہ ہے۔

مذکورہ بالا آیت پہلی بار اس وقت نازل ہوئی جب ام سلمہؓ نے نبی کریم ﷺ سے کہا:" اے اللہ کے رسول! ھجرت کے حوالے سے مجھے قرآن پاک میں عورتوں کا کہیں بھی تذکرہ نہیں دکھ رہا ہے"، تب فیصلہ ربانی کے پیش نظر مذکورہ آیت کا نزول ہوا۔﴿تفسیر ابن کثیر ج ۱ تفسیر سورۃ آل عمران ص ۴۴۱﴾ اور اس آیت کی مزید وضاحت کرتے ہوئے علامہ ابن کثیرؒ کا کہنا ہے:" اللہ رب العالمین ہمیں اس بات کی اطلاع دے رہا ہے کہ کوئی بھی مرد یا عورت جو کار خیر کو انجام دیتا ہے ثواب الہی اور انعام خداوندی سے محروم نہیں رہ سکتا، بلکہ اس کے عمل کے بقدر اس کو بھرپور بدلہ دیا جائے گا اور جنس وصنف کی وجہ سے اس میں کوئی تفریق نہیں برتی جائے گی"۔﴿تفسیر القرطبی ج ۲ تفسیر سورۃ آل عمران ص ۱۵۶۱﴾ اور امام ضحاکؒ رقم طراز ہیں:"تمہارے مرد اطاعت خداوندی کے معاملے عورتوں کی مانند ہیں اور تمہاری عورتیں بھی مردوں کی مانند ہیں اللہ کی فرماں برداری واطاعت گزاری میں، اطاعت کا مطلب خالق کائنات کے سامنے کامل سپردگی ہے، اس کے احکام کے سامنے سر تسلیم خم کرنا ہے، اللہ کے بعض احکام تو مذکورہ آیت میں مذکور ہیں؛ جیسے مکہ سے مدینہ ہجرت کرنا، یا سرزمین کفر سے مملکت اسلام کی جانب کوچ کرنا، ایک ملک سے اللہ کی خوشنودی کے لیے دوسرے ملک کو جانا، جہاد کرنا اور اللہ کی رضا کے لیے مختلف تکالیف اور نوع بنوع اذیتیں جھیلنا"۔ اور اسی آیت پر مزید روشنی ڈالتے

ہوئے عبد الکریم خطیب کہتے ہیں:" بعضکم من بعض " یہ واضح طور پر اشارہ کرتا ہے کہ مرد اور عورت جزا اور سزا کے معاملے میں برابر کے شریک ہیں"۔{التفسیر القرآنی للقرآن الکتاب الثانی عبد الکریم خطیب ص ٦٧٤}

٤- حدود و قصاص سے متعلق عورتوں کی قانونی حیثیت:

اسلام ایک عالم گیر حقیقت اور تسلیم شدہ صداقت ہے، اس کی ساری تعلیمات عدل و انصاف پر مبنی ہیں، اور مرد و عورت دونوں کو سزا اور جزا میں برابر کا شریک کار قرار دیتا ہے، اور یہ عقل و منطق کا بھی تقاضا ہے کہ جب عورت عبادت کی اتنی ہی مکلف ہے تو ثواب بھی اسی تناسب میں ملنا چاہیے، اور جب ثواب میں کوئی کمی نہیں تو پھر مردوں کی طرح اس پر بھی تعزیرات کے قوانین نافذ ہونے چاہیے اور ایسا اسلام کرتا بھی ہے، میں چند مثالوں اور عہد رسالت اور خلفائے راشدین کے زریں ادوار میں نفاذ حدود کے کچھ نمونوں کے توسط سے اپنی بات کی وضاحت کروں گی۔

حد زنا:

زنا کی سنگینی اور اس عمل بد پر عقوبت و تعزیر کا ذکر کرتے ہوئے اللہ تعالی کہتا ہے:" الزانیۃ والزاني فاجلدوا کل واحد منھما مائۃ جلدۃ ولا تاخذکم بھما رأفۃ في دین اللہ إن کنتم تؤمنون باللہ والیوم الآخر ولیشھد عذابھما طائفۃ من المؤمنین ". {سورۃ النور، آیت نمبر ٢} ترجمہ: زناکار مرد اور زناکار عورت کو سو سو کوڑے مارو، اور اگر تم اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتے ہو تو تمہیں اللہ کے دین کے معاملے میں ان دونوں پر ترس نہیں کھانا چاہیے، اور ان دونوں کو سزا دیتے وقت مومنوں کی ایک جماعت کو موجود رہنا چاہیے۔

اس آیت کی تفسیر میں علامہ ابن کثیر کا کہنا ہے:" اس آیت میں اللہ رب العالمین نے اپنی طرف سے ان لوگوں پر سزا کا اعلان کیا ہے جو زنا کا ارتکاب کرتے ہیں، اہل علم نے اس موضوع پر کافی تحقیق کی ہے، اور مذکورہ سزا کے سلسلے میں شادی شدہ اور مجرد زانی کے مابین اختلاف کو رواں رکھتے ہیں۔ امام ابو حنیفہ کو چھوڑ کر باقی تمام ائمہ اس بات پر متفق ہیں کہ غیر شادی شدہ زانی کو سو کوڑا مارا جائے گا اور مزید ایک سال کی جلاوطنی کی سزا دی جائے گی، جبکہ امام ابو حنیفہ کا نقطہ نظر یہ ہے کہ جلاوطنی کی سزا کا اختیار قاضی وقت کی مرضی پہ منحصر ہو گا، اگر وہ چاہے گا تو اسے جلاوطن کرے گا بصورت دیگر اپنے شہر میں رہنے کی اجازت دے گا۔

بہر کیف جمہور علمانے مندرجہ ذیل حدیث کو بطور شاہد پیش کیا ہے اور امام ابو حنیفہ کے نقطہ نظر سے اختلاف کیا ہے، ابو ہریرہ اور زید بن خالد کا بیان ہے:" اے اللہ کے رسول، میں آپ سے اللہ کا واسطہ دیکر گزارش کرتا ہوں کہ آپ قوانین الہی کے مطابق فیصلہ صادر فرمائیں"، تب فریق مخالف کھڑا ہوااور بولا:" آپ اللہ تعالی کے قانون کے مطابق فیصلہ کریں اور برائے مہربانی مجھے لب کشائی کی اجازت دیں"، تب آپ ﷺ نے کہا کہ: بولو"، پھر وہ شخص کہنے لگا،:"میر الڑکا مزدور تھاجو اس شخص کے ساتھ کام کر رہا تھا، اور اس نے اس کی بیوی کے ساتھ ناجائز تعلق قائم کر لیا، اور میں نے بطور فدیہ ایک سو بکریاں اور غلام بھی دے دیا اپنے بچے کے جرم پر۔ پھر میں نے ایک تعلیم یافتہ شخص سے اس سلسلہ میں دریافت کیا تو اس نے بتایا کہ میرے لڑکے کو سو کوڑے اور ایک سال کی جلاوطنی کی سزادی جائے، اور اس شخص کی بیوی کو سنگسار کر دیا جائے"۔ اس پر آپؐ کا ردعمل کچھ یوں تھا:" اس ذات کی قسم جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے، میں تمہارے درمیان ربانی قانون کے ذریعے فیصلہ کروں گا۔ تمہاری ایک سو بکریاں اور غلام تمہیں لوٹائے جائیں گے، اور تمہارے لڑکے کو سو کوڑے لگائے جائیں گے، اور ایک سال کی جلاوطنی کی سزا بھی دی جائے گی۔ اے انیس! اس شخص کی بیوی کے پاس جاؤ، اگر وہ زنا کا اعتراف کرتی ہے تو پھر اسے سنگسار کر دو"، حضرت انیس اس عورت کے پاس گیے اور پھر اسے سنگسار کر ڈالا"۔ ﴿صحیح بخاری ج ۸ کتاب المحاربین من اھل الردۃ باب الزناص ۲۵﴾

امام قرطبیؒ نے لکھاہے:" اس آیت میں اللہ نے دو جنسوں مرد و عورت کو خصوصیت کے ساتھ ذکر کیا ہے، گرچہ عام لفظ "زانی" کو استعمال کرنا کافی ہوتا، لیکن اس کی توجیہ یہ کی گئی ہے کہ مرد اور عورت دونوں کو اس آیت میں مخصوص انداز میں اس لیے بیان کیا گیاہے تاکہ اس حقیقت پر خاطر خواہ روشنی پڑ جائے کہ مرد اور عورت دونوں کو جنس و صنف کے امتیاز کے بغیر سزا سے دوچار کیا جائے"۔ ﴿تفسیر قرطبی ج ۵ تفسیر سورۃ النورص ۴۵۵۲﴾ چنانچہ مذکورہ بالا آیت سے یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہوتی ہے کہ غیر شادی شدہ زانی مرد اور عورت دونوں کو سو سو کوڑے مارنے چاہیے اور سزا کا یہ عمل عام مقامات میں اور جم غفیر کے سامنے انجام پذیر ہونا چاہیے۔ نیز اس آیت میں اللہ تعالی اپنے بندوں کو انتباہ کرتا ہے کہ سزائے زنا کے عمل میں کسی بھی طرح کی مداہنت، مفاہمت، مصلحت پسندی، اقربا پروری اور کنبہ پرستی کا ارتکاب نہیں کرنا چاہیے، بلکہ اللہ کے حدود کو تجاوز کرنے والوں کو بھرپور سزا دینی چاہیے، اور قرآن میں مذکور طریقے کے مطابق یہ کام ہونا چاہیے

اور اس سلسلہ میں کسی بھی ہمدردی کو سدراہ نہ بننے دینی چاہیے۔ حقیقت یہی ہے کہ جو لوگ اس طرح کے جرم عظیم کے ارتکاب سے بچتے ہیں وہی لوگ سچے مسلم اور پکے مومن ہیں۔

یہ آیت غیر شادی شدہ زانی کی سزا کی تخصیص کی ہی بات کرتی ہے، جبکہ حدیث سے واضح ہوتا ہے کہ شادی شدہ زانی اور زانیہ کی سزا تاوقت موت سنگسار کرنا ہے، اور اس بات پر اہالیان علم واساطین تفسیر کا اتفاق ہے۔

کسی بھی طرح کی مداہنت، نرمی، تساہل، تاخیر اور نفاذ حد میں بے جا ہمدردی سے بچنے کے لیے، (کیونکہ اس سزا کا ذکر سنت رسول میں ہے اور سنت ہی پر عمل پیرا ہوتے ہوئے اسے نافذ العمل کیا جاتا ہے) حضرت عمر نے کہا: "مجھے اندیشہ ہے کہ چند ایام گزرنے کے بعد لوگ یہ نہ کہنے لگیں: "آیت رجم ہمیں قرآن میں نہیں دکھتی ہے"، اور بطور نتیجہ وہ گمراہی کے راستے پر گامزن ہوسکتے ہیں ایک ایسی ذمہ داری نہ ادا کرنے کی وجہ سے جسے اللہ نے ان کے اوپر عائد کیا ہے، ہر گز نہیں! میں اس بات کی تصدیق کرتا ہوں کہ رجم کی سزا اس شخص پر نافذ ہونی چاہیے جو زنا کا ارتکاب کرتا ہے، بشرطیکہ وہ پہلے ہی سے شادی شدہ ہو، اور جرم کی تصدیق عینی شاہدین، حمل یا بذریعہ اعتراف ہوجاتی ہو، حضرت عمر نے مزید کہا: "رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے رجم کی سزا کو نافذ کیا تھا اور ہم بھی اس سزا کو برقرار رکھیں گے"۔﴿صحیح بخاری ج۸ کتاب المحاربین ص ۲۵﴾

مذکورہ بالا آیت وحدیث سے زنا کی سزا سے متعلق مرد وزن کے مابین عدل وانصاف اور برابری و مساوات کی حقیقت اجاگر ہوتی ہے، چنانچہ مندرجہ ذیل آیت سے اس حقیقت پر مزید روشنی پڑتی ہے: "الزاني لاینکح إلا زانیة أو مشرکة والزانیة لاینکحھا إلا زان أو مشرک وحرم ذلک علي المؤمنین". {سورۃ النور رقم الآیۃ ۳} ترجمہ: زانی صرف زانیہ یا مشرکہ ہی سے شادی کرے گا اور زانیہ صرف زانی یا مشرک ہی سے شادی کرے گی، اور یہ عمل مومنوں پر حرام ہے۔ ۲۔ حد قذف:

زنا کی سنگینی اور اس کی سزا کی وضاحت کے بعد، نیز اس کے برے نتائج اور اس طرح کے جرائم کی بھیانک اثرات کے ذکر کے بعد اللہ تعالی مندرجہ ذیل آیت میں پاک دامن عورتوں پر زنا کا الزام عائد کرنے کی سزا کو بیان کر رہاہے، ارشاد باری تعالی ہے: "والذین یرمون المحصنات ثم لم یأتو بأربعة شهداء فاجلدوهم ثمانین جلدة ولا تقبلوا لھم شھادة ابدا وأولئک ھم الفاسقون". {سورۃ النور رقم الآیۃ ۴} ترجمہ: اور جو لوگ پاکدامن

عورتوں پر زنا کی تہمت دھریں، پھر چار گواہ نہ لائیں، انہیں تم لوگ اسی کوڑے لگاؤ، اور کبھی ان کی کوئی گواہی قبول نہ کرو، اور وہی لوگ فاسق ہیں۔

مذکورہ بالا آیت کی تفسیر میں علامہ ابن کثیر کا کہنا ہے: "یہ آیت ایک ایسی سزا کی تعیین کرتی ہے جو اس شخص پر نافذ ہوتی ہے جو کسی آزاد، بالغ اور پاک دامن عورت پر زنا کی تہمت دھرتا ہے، بعینہ یہی سزا (۸۰ کوڑے) ان لوگوں پر بھی نافذ ہوتی ہے جو کسی پاک سیرت اور نیک طینت خاتون پر الزام زنا دھرتے ہیں، اور یہ ایک ایسا مسئلہ ہے جو اہل علم کے یہاں متفق ہے"۔﴿تفسیر القرآن العظیم لابن کثیر ج ۳ تفسیر سورۃ النور ص ۲۶۴﴾

اس سلسلہ میں قانونی فرمان یہ ہے کہ ایسے لوگوں کو اسی کوڑے لگائے جائیں جو اس جرم عظیم کا ارتکاب کرتے ہیں، اور ان لوگوں کو ایک زوردار ذہنی جھٹکا دیا جائے جو معصوم مردوں اور عورتوں کی بدنامی کا باعث بنتے ہیں، ان کی سزا یہ ہے کہ ان کی شہادت ہمیشہ کے لیے مسترد کردی جائے، اور ان کو قابل اعتبار اور لائق اعتماد نہ سمجھا جائے۔ یہی درحقیقت ایک مضبوط بند اور مستحکم قلعہ ہے جو عورتوں کی عفت و عصمت کے تحفظ کا ضامن ہے۔

گرچہ "الذین" آیت کے شروع میں مذکر شکل میں ہے اور اس کے بعد "محصنات" آرہا ہے، تاہم اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ایک صنف کو دوسری صنف پر فوقیت حاصل ہے، بلکہ جملہ کی ترکیب سے یہ عیاں ہوتا ہے کہ یہ تغلیب کی قبیل سے ہے جس کا مطلب ہے کہ یہ مرد ہی ہوتا ہے جو بسا اوقات عورتوں پر زنا کی تہمت دھرتا ہے۔

امام قرطبی رقم طراز ہیں: "اللہ رب العالمین نے "عفت مآب عورتوں" ہی کو مخصوص کیا ہے، کیونکہ ان حالات میں اس طرح کی الزامات اور تہمتیں نہایت ہی قبیح ہیں اور نفس پر کسی بار گراں سے کم نہیں ہیں، اور مردوں کا تہمت لگانا بحیثیت معنی اسی حکم میں شامل ہے اور اس بات پر امت کا اجماع ہے، اور امام زہری کا کہنا ہے کہ "پاکیزہ نفوس" لفظی طور پر مرد و عورت دونوں کو شامل ہیں"۔﴿تفسیر قرطبی ج ۵ تفسیر سورۃ النور ص ۴۵۶۴﴾ درحقیقت، یہ قانون اسلامی نظام میں موجود عدل و انصاف اور مساوات کی ترجمانی اور نمائندگی کرتا

ہے اور بنت حوا کی عظمت و تقدس اور عفت و عصمت کی رفعت و بلندی کو بیان کرتا ہے، اسلام نے صنف نازک کو اخلاقی تحفظ فراہم کیا ہے اور کسی کو بھی انہیں برا بھلا کہنے سے روکا ہے۔ ۳۔ حد لعان:

گرچہ اس حد کا تعلق عورتوں سے ہے، تاہم یہ قانون اسلام میں عورتوں کی باعزت حیثیت اور پر وقار مقام کو اجاگر کرتا ہے، جب کوئی شوہر اپنی بیوی پر زنا کا الزام بدعائد کرتا ہے تو اس کے لیے قانون قذف سے مختلف ایک قانون بروئے کار لایا جاتا ہے، اور یہ قانون درحقیقت قرآن کریم کی اس آیت سے لیا گیا ہے:" والذین یرمون أزواجھم ولم یکن لھم شھداء إلا أنفسھم فشھادات أحدھم أربع شھادات باللہ إنہ لمن الصادقین والخامسۃ أن لعنت اللہ علیہ إن کان من الکاذبین ویدرأ عنھا العذاب أن تشھد أربع شھادات باللہ إنہ لمن الکاذبین والخامسۃ أن غضب اللہ علیھا إن کان من الصادقین ولولا فضل اللہ علیکم ورحمتہ و أن اللہ تواب حکیم ". {سورۃ النور رقم الآیۃ من ٦ الی ١٠} ترجمہ: اور جو لوگ اپنی بیویوں پر زنا کی تہمت لگائیں، اور ان کے پاس ان کے سوا کوئی گواہ نہ ہو، تو ایسا آدمی اللہ کی قسم کھا کر چار مرتبہ گواہی دیگا کہ وہ بے شک اپنی بات میں سچا ہے، اور پانچویں مرتبہ کہے گا کہ اگر وہ جھوٹا ہے تو اس پر اللہ کی لعنت ہو۔ اور بیوی سے یہ بات عذاب کو ٹال دے گی کہ وہ اللہ کی قسم کھا کر چار مرتبہ گواہی دے کہ شوہر بے شک جھوٹا ہے، اور پانچویں مرتبہ کہے کہ اگر وہ سچا ہے تو (عورت) پر اللہ کا غضب نازل ہو۔ اور اگر تم پر اللہ کا فضل اور اس کی رحمت نہ ہوتی تو تم شدید مشقت میں پڑ جاتے، اور بے شک اللہ توبہ قبول کرنے والا، بڑی حکمت والا ہے۔

اس آیت کی تفسیر میں علامہ ابن کثیر کا کہنا ہے:" یہ پاکیزہ آیتیں درحقیقت راحت جاں ہیں ان شوہروں کے لیے جو اپنی بیویوں پر زنا کی تہمت لگاتے ہیں، لیکن اپنے علاوہ کسی اور کو بطور گواہ پیش کرنے سے عاجز و قاصر ہیں۔ ایسی صورتحال میں مرد و عورت دونوں کو قرآن کریم میں مذکور طریقے کے مطابق قسم کھانی ہوگی، شوہر اپنی بیوی کو لیکر قاضی وقت کے پاس جائے گا اور اس کے سامنے اپنی بیوی پر زنا کی تہمت دھرے گا، قاضی وقت بھی شوہر سے چار بار قسم کھانے کو کہے گا اپنی بات کی تصدیق کے لیے جہاں اللہ کا نام لے کر چار بار شوہر قسم کھائے گا کہ وہ اپنی بیوی کے تعلق سے جو کچھ بھی کہتا ہے وہ درست ہے۔ امام شافعی اور دیگر ائمہ کا کہنا ہے کہ چار بار قسم کھانا اور جھوٹا ہونے کی شکل میں خود کو مطعون قرار دینا ایک شوہر کی اپنی بیوی کے خلاف گواہی کے لیے کافی ہے، اب اس کے بعد بیوی شوہر کے لیے حرام ہو جائے گی اور اس پر حد کا نفاذ ہوگا الا یہ کہ وہ

چار بار قسم کھائے کہ اس کے شوہر کا الزام جھوٹ پر مبنی ہے، اور پانچویں مرتبہ کہے کہ اگر شوہر سچا ہے تو پھر مجھ پر اللہ کی لعنت اور غضب برسے"۔ ﴿تفسیر القرآن العظیم لابن کثیر ج ۳ ص ۳۶۵﴾

سابقہ پیراگراف میں مذکور قانون کا تعلق فقط انہی عورتوں سے ہے جن کے شوہر ان پر زنا کی تہمت لگاتے ہیں، ایک عام، سیدھا سادا اور متوسط شخص اپنی بیوی پر زنا کی تہمت قطعی نہیں لگائے گا الا یہ کہ اس میں سچائی پوشیدہ ہو، اسی لیے عورتوں کو حق دیا گیا ہے کہ وہ پانچویں مرتبہ قسم کھائیں تا کہ حد سے بچ سکیں اگر ان میں سچائی ہو، اور اللہ کی لعنت و غضب کو دعوت دیں اگر ان کے شوہر کا الزام سچ اور صداقت پر مبنی ہو۔ در حقیقت اللہ کی لعنت ان لوگوں کے اوپر نازل ہوتی ہے جو سچ کو جاننے کے باوجود بھی انکار کر دیتے ہیں۔ در آخر اللہ رب العالمین اپنے بندوں کو اپنی شفقت و محبت اور راحت و رحمت کی یاد دہانی کراتا ہے اور اپنے قانون میں موجود اس عدل و انصاف کا ذکر کرتا ہے جو اس کے بندوں کو مصیبت و پریشانی اور حرج و تکلیف سے نکالنے میں مدد بہم پہنچاتے ہیں۔ در حقیقت، کسی بھی شوہر سے اس بات پر چار گواہ پیش کرنے کو کہنا کہ اس کی بیوی زناکار و بدکار ہے، نہایت مشکل اور تکلیف دہ کام ہے، امام قرطبی نے اس واقعہ کو نقل کیا ہے جس کے بارے میں مذکورہ بالا آیت کا نزول ہوا ہے، عبد اللہ بن عباس نے بیان کیا ہے: "ھلال بن امیہ نے اپنی بیوی پر شریک بن سحماء کے ساتھ زنا کا الزام لگایا اور دربار نبوی میں شکایت درج کی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "یا تو گواہ پیش کرو، یا پھر کوڑے کا سامنا کرو"، تب ھلال بن امیہ نے کہا: "اس ذات کی قسم جس نے آپ کو حق کے ساتھ مبعوث فرمایا، میں جو کچھ بھی کہہ رہا ہوں وہ صداقت پر مبنی ہے اور اللہ رب العالمین میرے مسائل میں ضرور کوئی ایسا حکم نازل کرے گا جس سے میں کوڑے سے محفوظ رہ سکوں"، تب اس آیت مبارک کا نزول ہوا: "والذین یرمون أزواجھم ولم یکن لھم شھداء إلا أنفسھم فشھادۃ أحدھم أربع شھادات باللہ إنہ لمن الصادقین".

﴿تفسیر قرطبی ج ۵ تفسیر سورۃ النور ص ۴۵۷۵﴾ جب اس آیت قذف کا نزول ہوا تو لوگ آپس میں گفتگو کرنے لگے، تعجب میں پڑ گئے اور مختلف طرح کے سوالات کرنے لگے۔ عبد اللہ بن مسعود اور سہل بن سعد رضی اللہ عنہما سے مروی ہے، کہتے ہیں کہ قبیلہ انصار کا ایک شخص جس کا نام عویمر عجلانی ہے رسول پاک کے دربار میں حاضر ہوا اور پوچھا: "اے اللہ کے رسول ﷺ: اس شخص کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے جو کسی شخص کو اپنی بیوی کے ساتھ دیکھ لیتا ہے؟ کیا وہ اس شخص کو قتل کر دے گا جس کے نتیجے میں آپ لوگ اسے قتل کر دیں

گے ؟اور دوسری روایت میں ہے کہ اگر خاموش رہاتو غیظ وغضب کے عالم میں خاموش ہو گا، تو پھر وہ کیا کرے گا؟ آپ ﷺ نے فرمایا: "تمہارے اور تمہاری بیوی کے مابین جو مسئلہ ہے اس کا حل نازل ہو چکا ہے، اب تم جاؤ اور اپنی بیوی کو لیکر آؤ"، حضرت سہل بن سعد کہتے ہیں کہ وہ دونوں ایک دوسرے پر لعنت بھیجنے لگے اور میں بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس اور لوگوں کی طرح موجود تھا"۔﴿صحیح مسلم بشرح نووی ج۳ کتاب اللعان ص ۱۴۷﴾

اللہ تعالی نے قابل اعتماد مردوں کو چار گواہ پیش کرنے کی بار گراں سے آزاد کر دیا ہے اور انہیں اس بات کی اجازت دی ہے کہ لعان کے ذریعہ اپنی بات کو ثابت کریں، بات خواہ کچھ بھی ہو، یہ قانون عورتوں کی شان ومنزلت کو گھٹاتا نہیں ہے، غالب امکان ہے کہ بداعتمادی اور شدید حسد ایک مرد کو ناجائز طریقہ سے اپنی بیوی پر زنا کی تہمت دھرنے پر مائل کر دیں، اسی لیے اللہ نے عورتوں کو بھی ذرائع ووسائل فراہم کیے ہیں تاکہ شوہر کے الزام بد کی تردید کرتے ہوئے اپنی اور اپنے اہل خانہ کی عزت وعصمت اور شان ووقار کو برقرار رکھ سکیں۔ بلاشبہ اسلام کا عدل وانصاف اور اپنے بندوں پر اللہ کی رحمت وشفقت اور عنایات کا عکس اس قانون میں بھرپور طور پر نظر آتا ہے، اللہ تعالی نے مردوزن دونوں کو موقع فراہم کیا ہے کہ وہ اپنے اوپر عائد الزامات کی اس دنیامیں تردید کریں اور سچی توبہ کے ذریعہ آخرت میں نجات کا سامان پیدا کریں۔

جس طرح قذف سے متعلق قانون نے عورتوں کو تحفظ فراہم کیا ہے، اسی طرح لعان کا نظام بھی عورتوں کو تحفظ ذات کا قوی ترین وسیلہ فراہم کیا ہے، یہ ایک عالم گیر صداقت ہے کہ

دنیا کا کوئی بھی مذہب، خود ساختہ انسانی قانون، رسم ورواج یا معاشرتی نظام نے اس انداز میں اب تک عورتوں کو کوئی تعظیم وتکریم نہیں بخشی ہے، اس کے برعکس مردوں کو ہمیشہ یہ حق رہا ہے کہ عورت کے ساتھ انتقامی کاروائی کر سکیں، یا اپنی بیویوں کو محض زنا کے شکوک وشبہات میں قتل کر ڈالیں، انہیں اپنے دفاع میں چند کلمات بولنے کی اجازت دیئے بغیر یا اپنے اوپر لگائے گئے الزامات کی تردید کے بغیر۔ اسلام عورتوں کو تحفظ، عزت، تعظیم وتکریم اور رفعت شان فراہم کرتا ہے اور قانون لعان کے ذریعہ ان کے تقدس میں چار چاند لگاتا ہے۔ ۴- چوری کرنا:

چوری سے متعلق قانونی سزا مرد و زن دونوں کے لیے برابر ہے، اللہ تعالی کا فرمان ہے:" والسارق والسارقۃ فاقطعوا ایدیھما جزاء بما کسبا نکالا من اللہ واللہ عزیز حکیم فمن تاب من بعد ظلمہ وأصلح فإن اللہ یتوب علیہ إن اللہ غفور رحیم". {سورۃ المائدۃ رقم الآیۃ ۳۸} ترجمہ: اور چور اور چورنی کا ہاتھ کاٹ لو ان کے عمل بد کی وجہ سے اور اللہ کی طرف سے عبرت کے طور پر، اور اللہ بڑی قوت والا، زبردست حکمت والا ہے۔

اللہ تعالی نے اس بات کا حکم دیا ہے کہ جو شخص کسی کی چیز یا سامان کو چراتا ہے اس کا ہاتھ کاٹ لیا جائے اور یہ اس کے سیاہ کارنامے کی سزا ہے، اور اس سزا کی عملی تنفیذ مندرجہ ذیل حدیثوں سے عمل میں آئی ہے: عائشہ صدیقہ سے مروی ہے، کہتی ہیں:" قبائل قریش کے لوگ مخزومیہ عورت کو لیکر پریشانی میں مبتلا ہو گئے جس نے چوری کا ارتکاب کر لیا تھا، ان لوگوں نے کہا کہ کوئی بھی شخص نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے لب کشائی نہیں کر سکتا نہ ہی کوئی سفارش کی جرات کر سکتا ہے سوائے اسامہ بن زیدؓ کے جو آپ کے قریبی اور محبوب نظر ہیں، جب حضرت اسامہ بن زید اس معاملے میں چند سفارشی کلمات کے ساتھ عرض پرداز ہوئے، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کہنے لگے:" کیا تم اللہ کی جانب سے متعین کردہ حدود میں سفارش کر رہے ہو"؟ پھر آپ کھڑے ہوئے، لوگوں سے خطاب کیا اور فرمایا:" اے لوگو! تم سے پہلے جو قوم تھی وہ گمراہی کا شکار ہو گئی تھی، کیونکہ ان میں جب کوئی باوقار اور ذی مرتبت شخص چوری کرتا تھا تو اسے بخش دیتے تھے، لیکن اگر کوئی کمزور شخص چوری کا ارتکاب کرتا تو اس پر قانونی حد کو نافذ کیا کرتے تھے، قسم اللہ کی، اگر فاطمہ بنت محمد بھی چوری کرتی تو میں اس کا ہاتھ کاٹ لیتا"۔ ﴿صحیح بخاری کتاب الحدود ج۸ ص۱۶﴾

مذکورہ بالا حدیث واضح طور پر اشارہ کرتی ہے کہ اس قانون کے نفاذ میں امیر و غریب اور مرد و زن کے مابین کوئی تفریق نہیں ہے، بلکہ سب پر اس قانون کا یکساں نفاذ ہوتا ہے۔ یہ مخزومیہ عورت قبیلہ قریش کی سب سے باعزت خاتون تھی جس طریقہ سے بنو عبد مناف تھے۔ بہرکیف جب اول الذکر ارتکاب چوری میں قصوروار پائی گئی تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ کی قائم کردہ حد کو اس پر نافذ کیا، اور اسلامی تاریخ میں سب سے پہلا شخص جس کے ہاتھ کو چوری کے الزام میں کاٹا گیا وہ مردوں میں سب سے باعزت شخص عدی بن نوفل تھا، اور عورتوں میں مرۃ بنت سفیان بن عبد الاسد قبیلہ مخزوم کی تھی۔ ﴿تفسیر قرطبی ج۳ تفسیر سورۃ المائدۃ ص ۲۱۵۷﴾

اگر اس کے بعد چور خواہ وہ مرد ہو یا عورت خلوص دل سے توبہ کرتا ہے تو اللہ تعالی اس کی توبہ قبول فرمائے گا اور وہ دونوں مسلمان شمار کیے جائیں گے، حضرت عائشہ سے مروی ہے، کہتی ہیں: "نبی پاک ﷺ نے ایک عورت کا ہاتھ کاٹ لیا اور وہ عورت میرے پاس آیا کرتی تھی اور میں اس کے پیغامات کو آپ ﷺ تک منتقل کرتی رہتی تھی، چنانچہ اس نے توبہ کر لی اور اس کی توبہ میں بھرپور اخلاص تھا، ابو عبد اللہ نے کہا کہ جب چور ہاتھ کاٹ دیے جانے کے بعد صدق دل سے توبہ کرے تو اس کی گواہی تسلیم کی جائے گی"۔ ﴿صحیح بخاری کتاب الحدود طبعۃ دار الفکر ص ۱۸﴾ ۵- ڈاکہ زنی:

ڈاکہ زنی گرچہ اسے ایک بڑی چوری سے تعبیر کرتے ہیں، تاہم یہ مکمل طور پر چوری کی طرح نہیں ہے، بلکہ چوری تو خفیہ طور پر کسی کا مال لینا ہے، جبکہ ڈاکہ زنی جبر و اکراہ اور زبردستی کسی کے مال لینے کو کہتے ہیں۔ ﴿التشریع الجنائی الاسلامی ج ۲ عبد القادر عودۃ ص ۶۳۹﴾

اللہ تعالی کا فرمان ہے: "إنما جزاء الذين يحاربون الله ورسوله ويسعون في الأرض فسادا أن يقتلوا أو يصلبوا أو تقطع أيديهم و أرجلهم من خلاف أو ينفوا من الأرض ذلك لهم خزي في الدنيا ولهم في الآخرة عذاب عظيم إلا الذين تابوا من قبل أن تقدروا عليهم فاعلموا أن الله غفور رحيم". ﴿سورۃ المائدۃ رقم الآیۃ ۳۳-۳۴﴾ ترجمہ: جو لوگ اللہ اور اس کے رسول سے جنگ کرتے ہیں اور زمین میں فساد پھیلانے میں لگے رہتے ہیں، ان کا بدلہ یہ ہے کہ انہیں قتل کر دیا جائے، یا انہیں سولی پر چڑھا دیا جائے، یا ان کے ہاتھ پاؤں مخالف جانب سے کاٹ دیے جائیں، یا انہیں جلاوطن کر دیا جائے، یہ رسوائی ان کے لیے دنیا میں ہے اور آخرت میں ان کے لیے عذاب عظیم ہے، مگر وہ لوگ جو تمہاری گرفت میں آنے سے پہلے ہی توبہ کر لیں تو جان لو کہ اللہ بڑا مغفرت کرنے والا، بڑا مہربان ہے۔

یہ آیات ان سرپھروں، بدقماشوں اور دائرہ قانون سے باہر ان ناہنجاروں کی عقوبت و سزا کی تعیین کرتی ہیں جو زمین میں فساد پھیلانے کے لیے کوشاں رہتے ہیں اور امن و امان اور شانتی و آشتی کو درہم برہم کرنے کی سعی نامسعود کرتے ہیں، چنانچہ وہ لاقانونیت کی شکار جماعت کے ساتھ نکلتے ہیں، مسلمانوں کو خوف زدہ کرتے ہیں، ان کی عزت کو پامال کرتے ہیں، ان کے اموال کو لوٹتے ہیں اور ان کی عورتوں کی عزت و عصمت کو تار تار کرتے ہیں۔ ان کے لیے تجویز کردہ سزا کا نام شریعت اسلامیہ میں "حد حرابہ" رکھا گیا ہے، اور شریعت اسلامیہ

میں ایسی متعدد مثالیں ہیں جو ان مجرموں کے خلاف سزا کا اثبات کرتی ہیں جو مسلمانوں کے اموال کو لوٹتے ہیں، ان کی عزت کو پامال کرتے ہیں اور ان کی چیزوں سے تعرض کرتے ہیں۔

بخاری شریف میں حضرت انسؓ سے مروی ایک حدیث منقول ہے جس میں ذکر ہے کہ قبیلہ عکل کے کچھ لوگ نبی ﷺ کے پاس آئے اور حلقہ بگوش اسلام ہوگئے، لیکن مدینہ کی آب و ہوا انہیں راس نہ آئی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے لیے صدقہ کا اونٹ پیش کرنے کو کہا، تاکہ ان کا دودھ اور پیشاب پی سکیں، لہذا ان لوگوں نے ایسا ہی کیا اور روبہ صحت ہوگئے، پھر مرتد ہوگئے اور اونٹ کے چرواہوں کو قتل کر ڈالا اور اونٹ ہنکا لے گئے، اللہ کے رسول نے ان کے تعاقب میں لوگوں کو بھیجا، چنانچہ انہیں پکڑ کر لایا گیا، ان کے ہاتھ اور پاؤں کاٹے گئے، اور سلائی سے داغ دیے گیے، پھر انہیں تڑپا تڑپا کر مار دیا گیا"۔﴿صحیح بخاری طبعۃ دار الفکر ج۸ کتاب المحاربین من اھل الکفر والردۃ ص۱۸﴾

واضح رہے کہ اس سزا میں مرد وزن کے مابین کوئی تفریق نہیں برتی گئی ہے، بلکہ اس سزا میں دونوں برابر کے شریک ہیں۔۵- حد شراب:

اسلام نے واضح نصوص اور بین دلائل کے ذریعہ شراب کو حرام قرار دیا ہے، چنانچہ فرمان باری تعالی ہے:" یا أیھا الذین آمنوا إنما الخمر والمیسر والانصاب والازلام رجس من عمل الشیطان فاجتنبوہ لعلکم تفلحون. إنما یرید الشیطان أن یوقع بینکم العداوۃ والبعضاء في الخمر والمیسر ویصدکم عن ذکر اللہ وعن الصلاۃ فھل أنتم منتھون". {سورۃ المائدۃ رقم الآیۃ ۹۰- ۹۱} ترجمہ: اے اہل ایمان! بے شک شراب اور جوا اور وہ پتھر جن پر بتوں کے نام سے جانور ذبح کیے جاتے ہیں، اور فال نکالنے کی تیر ناپاک ہیں، اور شیطان کے کام ہیں، پس تم ان سے بچو شاید کہ تم کامیاب ہو جاؤ۔ بے شک شیطان شراب اور جوا کی راہ سے تمہارے درمیان دشمنی اور بغض پیدا کرنا چاہتا ہے اور تمہیں اللہ کی یاد اور نماز سے روک دینا چاہتا ہے، تو کیا تم لوگ باز آجاؤ گے۔

تدریجی طور پر شراب کی حرمت عمل میں آئی، کیونکہ اہل عرب شراب کے نہایت ہی شوقین اور دلدادہ تھے، اور سچائی یہ ہے کہ شراب مرد وزن دونوں کے لیے ممنوع اور حرام ہے، اس قانون سے سر مو انحراف بھی قانونی تعزیر اور اسلامی سزا کا باعث بن سکتا ہے، نبی پاک ﷺ اور آپ کے جلیل القدر خلفائے راشدین نے اس قانون کو نافذ کیا اور ان لوگوں پر کوڑے برسائے جنہوں نے شراب پینے کی حرکت بد کی

۔حضرت انس بن مالکؓ سے مروی ہے، کہتے ہیں:" نبی کریمؐ نے ایک شرابی شخص کو کھجور کی ٹہنی اور جوتوں سے مارا اور حضرت ابو بکر صدیق نے شرابی کو چالیس کوڑے مارے "۔﴿صحیح بخاری کتاب الحدود ج۸ ص ۱۲ طبعۃ دار الفکر﴾ مذکورہ بالا حدیث سے ہمیں یہ پتہ چلتاہے کہ شراب کی حد چالیس کوڑے پر مشتمل ہے، حصین بن منذر سے مروی ہے، کہتے ہیں:" جب ولید بن عقبہ کو دربار عثمان میں لایا گیا اور لوگوں نے اس کے خلاف گواہی دی، تو حضرت عثمان نے حضرت علی سے کہا: لیجئے یہ آپ کا چچازاد بھائی ہے، اس پر حد قائم کیجئے، چنانچہ حضرت علی نے حد کو نافذ کیا"، راوی کہتے ہیں: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے چالیس کوڑے مارے، حضرت ابو بکر صدیق نے چالیس کوڑے مارے اور حضرت عمر نے اسی کوڑے مارے اور یہ دونوں مسنون ہیں"۔﴿سنن ابن ماجہ ج۲ کتاب الحدود باب حد السکران ص ۸۵۸﴾

اہل علم کے مابین اختلاف ہے کوڑے کی قانونی تعداد کو لیکر، امام ابو حنیفہ اور مالک کے نزدیک اسی کوڑے ہیں، جبکہ امام شافعی چالیس کوڑے کے قائل ہیں، امام احمد بن حنبل نے دو واقعات نقل فرمائے ہیں جس میں ایک مقام پر چالیس کوڑے تو دوسرے مقام پر اسی کوڑے کا ذکر ہے۔ شراب پینے پر ہر اس شخص پر حد لگائی جائے گی جو مذہبی امور کی انجام دہی کی قدرت رکھتا ہو، چنانچہ اس قانون کو ہر بالغ اور ذی شعور مرد و عورت کے لیے بروئے کار لایا جائے گا، ہر شرعی تعزیرات کو محض اس لیے بروئے کار لایا جاتا ہے تاکہ اللہ کے حدود اور اس کے حقوق کا مشاہدہ عمل میں آسکے، اور یہ تعزیرات اور اسلامی حدود بلا تفریق مرد و زن یکساں قابل استعمال ہیں، اور اس طرح کی سزائیں در حقیقت جادو اور ارتداد کے لیے بھی متعین کی گئی ہیں۔ قانون قصاص:

جان بوجھ کر خون ناحق بہانے کو اللہ نے حرام قرار دیاہے، اور ان لوگوں کی سرزنش کی ہے جو قتل ناحق کا ارتکاب کرتے ہیں اور انہیں سزائے عظیم سے دوچار کرنے کا وعدہ کیاہے، فرمان باری تعالی ہے:"وما كان لمؤمن أن يقتل مؤمنا إلا خطأ ومن قتل مؤمنا خطأ فتحرير رقبة مؤمنة ودية مسلمة إلى أهله إلا أن يصدقوا فإن كان من قوم بينكم وبينهم ميثاق فدية مسلمة إلى أهله وتحرير رقبة مؤمنة فمن لم يجد فصيام شهرين متتابعين توبة من الله وكان الله عليما حكيما ومن يقتل مؤمنا متعمدا فجزاؤه جهنم خالدا فيها وغضب الله عليه ولعنه وأعد له عذابا عظيما".{سورۃ النساء رقم الآیۃ ۹۲- ۹۳} ترجمہ: اور کسی مومن کے لیے جائز نہیں کہ کسی مومن کو قتل کرے،

الا یہ کہ ایسا غلطی سے ہو جائے، اور جو شخص کسی مومن کو غلطی سے قتل کر دے تو اسے ایک مسلمان (غلام یا لونڈی) آزاد کرنا چاہیے، اور اس کے گھر والوں کو دیت دے، الا یہ کہ وہ لوگ بطور صدقہ معاف کر دیں، پس اگر مقتول تمہاری دشمن قوم کا فرد ہو، اور مسلمان ہو تو ایک مسلمان غلام یا لونڈی کو آزاد کر دے، اور اگر کسی ایسی قوم کا فرد ہو، جن کے اور تمہارے درمیان معاہدہ ہو، تو اس گھر والوں کو دیت دے اور ایک مسلمان (غلام یا لونڈی) آزاد کرے، جسے (غلام یا لونڈی) میسر نہ ہو، وہ اللہ سے معافی کے لیے دو ماہ تک مسلسل روزے رکھے، اور اللہ بڑا علم والا اور بڑی حکمت والا ہے، اور جو شخص کسی مسلمان کو جان بوجھ کر قتل کر دے گا، تو اس کا بدلہ جہنم ہو گا، جس میں وہ ہمیشہ رہے گا، اور اس پر اللہ کا غضب اور اس کی لعنت ہو گی، اور اس نے اس کے لیے بڑا عذاب تیار کر رکھا ہے۔

اور جناب محمد ﷺ کا یہ فرمان ذیشان ہے: "أكبر الكبائر الشرك بالله وقتل النفس وعقوق الوالدين و قول الزور"۔ ﴿صحیح بخاری کتاب الدیات طبعۃ دار الفکر ص ۳۶ ج ۸﴾ ترجمہ: کبیرہ گناہوں میں سے یہ ہیں: اللہ کی ذات میں کسی کو شریک ٹھہرانا، کسی جان کا قتل کرنا، والدین کی نافرمانی کرنا اور جھوٹی گواہی دینا"۔ مندرجہ ذیل تین شرائط کے بغیر کسی بھی شخص کو قتل کرنا ازروئے شرع حرام ہے، نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ذیشان ہے: "کسی بھی مسلمان کا خون حلال نہیں ہے سوائے ان تین وجوہات کے: کسی شخص کے قتل کرنے پر، ایک شادی شدہ شخص جو ارتکاب زنا کرتا ہے، اور وہ شخص جو راہ ارتداد پر گامزن ہوتا ہے اور مسلمانوں کی جماعت سے علیحدگی اختیار کرتا ہے"۔ ﴿صحیح بخاری کتاب الدیات طبعۃ دار الفکر ج ۸ ص ۳۸﴾ ایک جان مومن کی عزت و تکریم اس قدر اہم ہے اور حقیقت میں اس قدر لائق تعظیم ہے کہ اسے دانستہ طور پر قتل کرنا حرام قرار دیا گیا ہے، اور جو بھی شخص ایسا کرے گا وہ قانون قصاص کے تحت قابل گردن زدنی ہو گا اور شریعت اسلامیہ نے قصاص کا جو نظام پیش کیا ہے اس کی رو سے قتل کا سزاوار قرار پائے گا، ارشاد باری تعالی ہے: "یا أیھا الذین آمنوا کتب علیکم القصاص في القتلی الحر بالحر والعبد بالعبد والأنثی بالأنثی فمن عفي لہ من أخیہ شيء فاتباع بالمعروف وأداء إلیہ بإحسان ذلک تخفیف من ربکم ورحمۃ فمن اعتدي بعد ذلک فلہ عذاب ألیم". {سورۃ البقرۃ رقم الآیۃ ۱۷۸} ترجمہ: اے ایمان والو! مقتولین کے بارے میں تمہارے اوپر قصاص کو فرض کر دیا گیا ہے، آزاد کے بدلے آزاد، غلام کے بدلے غلام، اور عورت کے بدلے عورت، اگر کسی قاتل کے لیے اس کے بھائی کی

طرف سے کچھ پروانہ معافی مل جائے، تو مقتول کے ورثہ دیت کے مطالبہ میں نرمی سے کام لیں، اور قاتل اس کی ادائیگی میں خوش اسلوبی سے کام لے، یہ تمہارے رب کی طرف سے ایک قسم کی آسانی اور رحمت ہے، اب جو کوئی اس کے بعد زیادتی کرے گا، اس کے لئے بڑا دردناک عذاب ہو گا، اور اے اصحاب عقل و خرد، قصاص میں تمہارے لیے بڑی زندگی ہے، شاید کہ تم اس کی وجہ سے قتل و خونریزی سے بچتے رہو گے۔

بخاری شریف میں عبد اللہ بن عباس سے مروی ہے:" قانون قصاص بنی اسرائیل کے لیے تشکیل دیا گیا تھا، لیکن " دیت " کا وجود اس قانون میں نہ تھا، لہذا اللہ تعالی نے اس امت سے کہا: اے ایمان والو! قتل کرنے پر تمہارے اوپر قصاص کو فرض کر دیا گیا ہے: آزاد مرد آزاد مرد کے بدلے، غلام مرد غلام کے بدلے اور عورت عورت کے بدلے، الخ۔ اسی طرح مندرجہ ذیل آیت بھی اس قانون کی وضاحت کرتی ہے اور اس پر خاطر خواہ روشنی ڈالتی ہے:"وکتبنا علیھم فیھا أن النفس بالنفس والعین بالعین والأنف بالأنف والأذن بالأذن والسن بالسن والجروح قصاص فمن تصدق بہ فھو کفارۃ لہ ومن لم یحکم بما أنزل اللہ فأولئک ھم الظالمون ".{سورۃ المائدۃ رقم الآیۃ ۴۵} ترجمہ: اور ہم نے تورات میں ان کے لیے حکم جاری کر دیا تھا کہ جان کے بدلے جان، اور آنکھ کے بدلے آنکھ اور ناک کے بدلے ناک، اور کان کے بدلے کان اور دانت کے بدلے دانت ہے، اور زخموں میں بھی بدلہ ہے، اور جو شخص اسے معاف کر دیگا تو وہ اس کے لیے کفارہ بن جائے گا، اور جو لوگ اللہ کی طرف سے نازل شدہ حکم کے مطابق فیصلہ نہیں کریں گے، وہی لوگ ظالم ہیں۔ اس آیت کی روشنی میں علما کی اکثریت اس بات پر متفق ہے کہ قصاص کے مسائل میں مرد و زن کے مابین کوئی تفریق و لحاظ نہیں ہے، اور امام ابن قدامہ کہتے ہیں:" ایک مرد کو قتل کیا جائے گا ایک عورت کو قتل کرنے کی وجہ سے، اور ایک عورت کا سر قلم کیا جائے گا ایک مرد کو تہ تیغ کرنے کی وجہ سے، اور یہی اکثر علمائے دین اور فقہائے شریعت کا موقف ہے جن میں امام نخعی، شعبی، زہری، عمر بن عبد العزیز، مالک، اہل مدینہ، شافعی، اسحاق اور دیگر اہالیان علم شامل ہیں "۔﴿المغنی لابن قدامہ ج ۹ مسألۃ الذکر بالانثی ص ۳۷۷﴾

اس بات کی تصدیق کی جاتی ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے ایک یہودی شخص کو قتل کر ڈالا جس نے ایک انصاری عورت کو مارتے مارتے موت کے گھاٹ اتار دیا تھا، اسی طرح کی ایک حدیث ابو بکر بن محمد سے بھی مروی ہے کہ محمد ﷺ نے اہل یمن کے پاس ایک خط بھیجا جس میں مذہبی فرائض اور قوانین و ضوابط کی

وضاحت تھی، اور یہ بھی ذکر تھا کہ ایک مرد کو ایک عورت کے قتل کے بدلے میں قتل کیا جائے گا، لوگوں نے ان باتوں کو قبول کیا، کیونکہ مرد اور عورت دونوں انسان ہیں اور ہر ایک پر حد قذف نافذ کی جائے گی جب ایک دوسرے پر الزام لگائے گا اور تہمت دھرے گا، چنانچہ ایک جنس کو دوسرے جنس کے بدلے میں قتل کرنا ایسا ہی ہے جیسے کسی ایک جنس سے ایک شخص کو قتل کیا جائے اسی جنس کے کسی دوسرے شخص کے قتل کی وجہ سے ،اور دونوں حالتوں میں کچھ بھی قانون قصاص میں اضافہ نہیں کرنا چاہیے اور یہ ایک مذہبی ذمہ داری بھی ہے "۔﴿حوالہ سابق﴾ اس طرح غور کیا جائے تو مرد و عورت قصاص کے معاملے میں برابر ہیں، لہذا ایک مرد کا خون ایک عورت کا خون بہانے کی وجہ سے بہایا جائے گا اور اسی طرح اس کے برعکس بھی۔ دیت :

تمام علما اس بات پر متفق ہیں کہ دیت میں اصل چیز اونٹ ہے اور ایک آزاد مسلمان کی دیت سو اونٹ ہے اور اس مسئلہ کی تائید حدیث رسول سے بھی ہوتی ہے، چنانچہ آپ ﷺ نے اہل یمن کے پاس ایک خط لکھا جس میں کہا: " ایک نفس کو قتل کرنے پر سو اونٹ کی دیت ہے اور یہ کہ مرد کو قتل کیا جائے گا عورت کو قتل کرنے کی وجہ سے، اور جہاں تک ان لوگوں کی بات ہے جو سونا کے مالک ہیں، تو ان کے لیے بطور دیت کے ایک ہزار دینار ہے "۔﴿سنن نسائی بشرح حافظ جلال الدین السیوطی ج ۸ کتاب القسامۃ ص ۵۸﴾ اور حضرت عبد اللہ بن عباس سے مروی ہے، کہتے ہیں: " ایک شخص نے دور نبوت میں کسی شخص کو قتل کر ڈالا، تو آپؐ نے اس کی دیت بارہ ہزار متعین کیا "۔﴿حوالہ سابق ص ۴۴﴾

پہلی حدیث سے ایک مسلمان شخص کے قتل کی دیت کا ادراک ہوتا ہے، جس میں مرد و زن کی تفریق اور امتیاز نہیں ہے، تاہم بعض اہل علم نے ایک تجویز پیش کی ہے کہ آزاد مسلمان عورت کی دیت ایک آزاد مرد مومن کے بالمقابل نصف ہونا چاہیے، یہ تجویز اور نظریہ بہر صورت خلاف حقیقت اور نظام قدرت کے برعکس ہے اور حدیث نبوی اور مسلمات صحابہ کے بالکل متضاد ہے اور ساتھ ہی اہل علم کے نقطہ نظر کے منافی بھی۔

دیت لازمی طور پر ہر کسی کے لیے برابر ہونی چاہیے، کیونکہ انسانی فطرت ایک ہی ہے اور مرد و عورت دونوں اللہ کی نظر میں برابر ہیں، اسی لیے دونوں کو زندگی کا یکساں حق حاصل ہے، چونکہ انسانی روح برابر ہے اور ایک ہی مزاج اور طبیعت کی حامل ہے اسی لیے دیت اور فدیہ کو لیکر دونوں کے بیچ کسی بھی طرح کی تفریق روا نہیں رکھنی چاہیے، کیونکہ آیت کی عمومیت بالکل واضح اور عیاں ہے، اللہ تعالی کا فرمان ہے: "جو شخص کسی

مومن کو غیر ارادی طور پر قتل کرتا ہے اسے ایک مومن غلام آزاد کرنا چاہیے اور مقتول کے ورثاء کو فدیہ ادا کرنا چاہیے"۔

بہر کیف، اگر عمرو بن حزم کی کتاب کا یہ اقتباس درست ہے کہ عورت کی دیت مرد کے بالمقابل آدھی ہونی چاہیے، تو یہ بات "ذمہ داری کے بموجب فائدہ" والی بات پر مشتمل ہو گی، اس بات میں کوئی شک نہیں ہے کہ دانستہ قتل کی سزا قصاص ہے خواہ مقتول مرد ہو یا عورت، اور اس کا ضابطہ یہ ہے "نفس برائے نفس"، کیونکہ بحیثیت انسان مرد اور عورت دونوں برابر ہیں۔ بہر کیف غیر ارادی قتل اور اسی طرح کی دیگر حالات میں سزا ایک مختصر سا فدیہ یا قید کی شکل میں ہو گی، مرد عمومی طور پر اپنے پریوار کے روزی رساں اور خوراک فراہم کرنے والے ہوتے ہیں، لہذا مالی خسارہ زیادہ ہو جائے گا اگر کوئی مرد بشکل سرپرست مارا جاتا ہے تو، اسی طرح مقتول اگر ماں ہے تو تکلیف مزید بڑھے گی، قلبی پریشانی پیدا ہو گی، اندرونی جذبات کو ٹھیس پہنچے گا اور کوئی بھی قیمت اس صدمے کی تلافی نہیں کر سکتی، یہ بات بھی ذہن نشیں رہے کہ دیت کسی شخص مقتول کی قیمت نہیں ہے، بلکہ روح تو ایک ایسی بیش قیمت شے ہے جس کی قیمت کوئی دے ہی نہیں سکتا، البتہ یہ ایک مختصر مالی فدیہ ہے مقتول کے پسماندگان کی مالی اعانت کے لیے، نیز یہ انصاف "فرائض اور ذمہ داریوں کی تقسیمات" کے اسلامی اصول پر مبنی ہے جس میں ایک صنف نازک کو اہل خانہ کی روزی رسانی کا مکلف نہیں بنایا جاتا اس کے برعکس، ایک ایسے معاشرے میں جہاں عورتوں پر گھریلو ذمہ داریاں عائد کر دی گئی ہیں، اپنی روزی روٹی کا انتظام کرنے کا مکلف بنایا گیا ہے، اپنے اہل خانہ کو سامان رسد فراہم کرنے کی ذمہ داری عائد کی گئی ہے، یا پھر مقتولہ ایک ایسی عورت ہو جو اپنے پریوار کے لیے روزی رساں کی حیثیت رکھتی تھی، تو پھر اس کی دیت ایک مرد کی دیت کے مساوی ہو گی۔ ﴿المرأۃ بین الفقہ و القانون؛ مصطفی السباعی ص ۳۷﴾ چنانچہ دوسرے نقطہ نظر کے مطابق بھی نہ اسلام عورتوں کی تخفیف شان کرتا ہے اور نہ مردوں کے حوالے سے ان کے ساتھ کوئی امتیازی سلوک روا رکھتا ہے، بلکہ عورتوں کو مکمل تحفظ فراہم کرتا ہے، انہیں تکریم سے نوازتا ہے اور ساتھ ہی مردوں کے ساتھ ان کی ہمسری اور مساوی درجہ کو بحال کرتا ہے۔

شہادت :

عورتوں کی شہادت اور گواہی کے سلسلے میں قرآن کریم میں اللہ تعالی کا فرمان ذیشان ہے: "واستشھدوا شھیدین من رجالکم فإن لم یکونا رجلین فرجل وامرأتان ممن ترضون من الشھداء أن تضل إحداھما فتذکر إحداھما الأخری". {سورۃ البقرۃ رقم الآیۃ ۲۸۲} ترجمہ: اور اپنے لوگوں میں سے دو مردوں کو گواہ مقرر کرلو، اگر دو مرد نہ ہوں تو ایک مرد اور دو عورتیں کافی ہوں گی، جنہیں تم بطور شاہد پسند کرو، تاکہ ایک کی بھول جانے کی صورت میں دوسری اسے یاد دلائے، اور گواہوں کو جب بلایا جائے تو وہ انکار نہ کریں۔

دولت وجائداد سے متعلق معاشی امور میں دو عورتوں کی گواہی ایک مرد کی گواہی کے برابر ہے، اس لیے کسی قضیہ کو حل کرنے، کسی معاملہ میں فیصلہ کرنے اور کسی بات کو ثابت کرنے کے لیے دو مرد، یا پھر ایک مرد اور دو عورتوں کی گواہی درکار ہوتی ہے، یہ حقیقت نہ تو عورتوں کی انسانیت، نہ اس کی عفت وعصمت سے متعلق ہے اور نہ ہی مردوں کے ساتھ اس کی مساوات سے ﴿حوالہ سابق ص ۳۱﴾

بلاشبہ یہ بات عورتوں کی معاشرتی حیثیت کو نہ گھٹاتی ہے، نہ اس کی شان میں تخفیف کا باعث بنتی ہے، بلکہ بحیثیت ماں اور بیوی عورت کا جو بنیادی کردار ہوتا ہے اس پر خاطر خواہ توجہ مبذول کرتی ہے، اور عورت کا یہ کردار کچھ اس انداز کا ہوتا ہے جو تمام شعبہ حیات میں عورت کے وجود کا احساس دلاتا ہے اور اس کی اہمیت و افادیت اور ضرورت کو بیان کرتا ہے، کیونکہ گھریلو امور اور معاشی مسائل کو حل کرنے میں اس کی کافی ضرورت پڑتی ہے۔ خصوصیت کے ساتھ عورتوں سے متعلق امور میں، جیسے حمل، پیدائش، نسوانی کمزوری اور بلوغت میں ایک عورت کی شہادت کافی ہے، دانشوران اور مفکرین کی جانب سے پیش کردہ دلیل اس آیت کا واضح اشارہ یہ ہے جس میں معاشی امور کی طرف اشارہ ہے اور ان مجرمانہ حرکات کا بیان ہے جن میں حدود کا نفاذ عمل میں آتا ہے۔ یہ ایک بار گراں اور عظیم ذمہ داری ہے جو عورتوں کے لیے ہلکی کردی گئی ہے، عورتوں کی گواہی سے متعلق پیشگی احتیاط کا مقصد شکوک وشبہات کا کا ازالہ کرنا ہے جو اس کی گواہی سے لگے رہتے ہیں اور جہاں بطور شاہد اس کے لیے حاضر ہونا مشکل ہے، اسلامی فقہ عورتوں کی اپنی ذات سے متعلق شہادت کو قبول کرتی ہے، یا پھر ان شہادتوں کو قابل تسلیم گردانتی ہے جو مردوں کی بنسبت عورتوں سے زیادہ تعلق رکھتی ہیں، چنانچہ یہ فیصلہ مرد و زن کے مابین عزت، عظمت، رفعت، بلندی، لیاقت اور قابلیت کی تفریق پر مبنی نہیں ہے، بلکہ یہ تو محض سچائی کو مستحکم کرنے کا وسیلہ اور فیصلہ لینے کے دوران پیدا شدہ تذبذب کے ازالہ کا ذریعہ ہے،

یہ تو قانون و انصاف سے متعلق کسی بھی نظام کے لیے ایک فطری شے ہے جو عدل و انصاف کے استحکام کے لیے کوشاں ہے ﴿حوالہ سابق ۳۲﴾۔

گیارھواں باب

سیاسی حقوق:

اسلام ایک صداقت پر مبنی مذہب ہے جسے اللہ نے بنی نوع انسان کے لیے منتخب فرمایاہے، یہ ایک ایسا مذہب ہے جس میں عورت انسانیت کے نصف حصہ کی نمائندگی کرتی ہے، اسلام نے ہمارے معاشرے میں عورتوں کے قابل ذکر کارناموں کا اعتراف کیاہے اور ہماری سیاسی زندگی میں ان کی اثرات کو تسلیم کیاہے، چنانچہ اسلام نے عورتوں کو سیاسی حقوق فراہم کیاہے جن سے عورتوں کی باعزت، قابل قدر اور پروقار حیثیت کا پتہ چلتاہے، ان حقوق میں سے چند کا نیچے ذکر کیا جاتاہے:

۱۔ اظہار رائے کی آزادی:

باہمی مشورہ اور آپسی صلاح کو دین اسلام میں بے پناہ اہمیت حاصل ہے، اسلام کی طرف سے پیش کردہ یہ عمدہ طریقہ کار اور کارآمد اسلوب ہے جو ایک بامراد قوم کی تخلیق اور منظم جماعت کی تشکیل کے لیے ایک دوسرے سے گفت وشنید اور باہمی مشورہ کی دعوت دیتاہے، اللہ تعالی کا فرمان ہے: "والذین استجابوا لربھم وأقاموا الصلوۃ وأمرھم شوری بینھم ومما رزقناھم ینفقون". {سورۃ الشوری رقم الآیۃ ۳۸} ترجمہ: اور جن لوگوں نے اپنے رب کا حکم مان لیا، اور نماز قائم کی، اور ان کے معاملات آپس کے مشورے سے طے ہوتے ہیں، اور ہم نے انہیں جو روزی دی ہے، اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔ "وامرھم شوری بینھم" کی تفسیر میں علامہ ابن کثیر کا کہنا ہے: "یعنی کسی بھی امر کی انجام دہی بغیر مشورہ کے نہیں کرتے ہیں، بلکہ ایک دوسرے سے تبادلہ خیال کرکے اپنے عزم کو تقویت فراہم کرتے ہیں، جیسے جنگ وجدال، اور اسی طرح جنگ سے متعلق کوئی دوسری مہم جس میں مشورہ درکار ہوتاہے، جیسا کہ اللہ کا فرمان ہے: "وشاورھم فی الامر"۔ یعنی اپنے معاملات میں ان (صحابہ کرام) سے مشورہ کرو۔

چونکہ مسلمانوں کو باہمی مشورے کے ذریعے اپنے معاملات کو پایہ انجام تک پہنچانے کی تلقین کی گئی ہے، اس لیے ہر مسلمان مرد وعورت پر اپنے خیالات وآراء کا اظہار لازم ہے اگر اسے محسوس ہوتاہے کہ اظہار رائے سے مسلم قوم کی فلاح وبہبود کے لیے وہ قابل قدر مشورہ اور لائق تحسین نصیحت فراہم کرسکتاہے، اور

ساتھ ہی امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے فریضہ کی انجام دہی میں اپنا کلیدی کردار ادا کر سکنے کا احساس جاگزیں ہو، اگر ایسا محسوس ہوتا ہو تو فرد مسلم کو اپنے خیالات کے اظہار میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کرنا چاہیے ،چنانچہ اللہ تعالی کا فرمان ہے:" ولتكن منكم أمة يدعون إلى الخير ويأمرون بالمعروف وينهون عن المنكر وأولئك هم المفلحون". {سورة آل عمران رقم الآية ۱۰۴} ترجمہ: اور تم میں سے ایک جماعت ایسی ہونی چاہیے جو لوگوں کو بھلائی کی جانب مدعو کرے، کار خیر کا حکم دے، اور کار شر سے روکے، اور در حقیقت یہی جماعت کامیاب ہے۔

مذکورہ بالا آیت کی تفسیر کرتے ہوئے علامہ ابن کثیر کہتے ہیں:" مسلم قوم میں ایک جماعت ایسی ہونی چاہیے جو لوگوں کو بھلائی کی جانب مدعو کرنے کا فریضہ انجام دے، اچھے کام کا حکم دے، اور برے کام سے روکے، جیسا کہ حدیث رسول سے بھی اس بات کی وضاحت ہوتی ہے کہ ہر مسلمان مرد اور عورت پر اچھائی کا حکم دینا اور برائی سے منع کرنا ایک لازمی فریضہ ہے، چنانچہ حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ نبی پاک ﷺ نے فرمایا:" من رأى منكم منكرا فليغيره بيده فإن لم يستطع فبلسانه وإن لم يستطع فبقلبه وذلك أضعف الإيمان". ﴿صحیح مسلم بشرح نووی ج ۱ کتاب الایمان ص ۲۳۸﴾ ترجمہ: تم میں سے کوئی شخص برائی کو دیکھے تو اسے چاہیے کہ اپنے ہاتھ سے روکے اور اگر ہاتھ سے طاقت نہ ہو تو پھر زبان سے روکے، اور اگر زبان سے بھی ممکن نہ ہو تو دل ہی دل میں برا جانے، اور یہ ایمان کا کمزور ترین درجہ ہے۔ سورہ توبہ جو قرآن کریم کی آخری سورت ہے اس بات کو ثابت کرتی ہے کہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا فریضہ مردوں کی طرح عورتوں پر بھی عائد ہوتا ہے، چنانچہ ارشاد باری تعالی ہے:" المؤمنون والمؤمنات بعضهم أولياء بعض يأمرون بالمعروف وينهون عن المنكر ويقيمون الصلوة ويؤتون الزكاة ويطيعون الله ورسوله". {سورة التوبة رقم الآية ۷۱} ترجمہ: مسلمان مرد اور عورت ایک دوسرے کے دوست ہیں، نیکی کا حکم دیتے ہیں اور برائی سے منع کرتے ہیں، نماز کی پابندی کرتے ہیں اور زکوۃ کو ادا کرتے ہیں، اور اللہ اور اس کے رسول کی تابعداری کرتے ہیں۔

بھلائی کا حکم اور برائی کا خاتمہ قول و فعل اور تصنیف و تالیف سے ممکن ہے، اور حق کی تصدیق اور باطل کی تردید بھی دعوت و تبلیغ میں شامل ہے، اور آپسی خیر خواہی اور باہمی نصیحت و موعظت کو بھی آپ ﷺ نے دین کی بنیاد بلکہ اس کی کامل اساس بتلایا ہے، چنانچہ حضرت تمیم داری سے مروی ہے، کہتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا:" دین خیر خواہی ہے، ہم نے پوچھا: اے اللہ کے رسول! کس کے لیے؟ آپ نے فرمایا: اللہ کے

لیے، اس کی کتاب کے لیے، اس کے رسول کے لیے، مسلمانوں کے رہبران کے لیے اور ان کی عوام کے لیے "۔﴿صحیح مسلم بشرح نووی ج ۱ کتاب الایمان ص ۲۳۷﴾

اس حدیث کی تشریح کرتے ہوئے امام نووی رقم طراز ہیں:"در حقیقت یہ حدیث گراں قدر اہمیت کا حامل ہے، یہ اسلام کا محور اور بنیاد ہے، امام خطابی نے لکھا: نصیحت ایک جامع کلمہ ہے، جس کا مطلب نصیحت کیے گئے شخص کے لیے ڈھیر سارے فوائد و ثمرات جمع کرنا ہے،"اللہ کے لیے نصیحت" کا مطلب یہ ہے کہ آدمی کو اس بات پر کامل یقین رکھنا چاہیے کہ اللہ تعالی کے سوا کوئی معبود برحق اور کارساز حقیقی نہیں ہے، اور کوئی اس کی الوہیت اور خدائی میں شرکت کی اہلیت اور حق نہیں رکھتا۔

"اللہ کی کتاب کے سلسلے میں نصیحت" کا مطلب یہ ہے کہ اس بات پر پختہ عقیدہ اور مستحکم ایمان ہونا چاہیے کہ یہ کتاب اللہ کی جانب سے نازل شدہ ہے۔"نبی پاک ﷺ کے بارے میں نصیحت" کا مطلب یہ ہے کہ آپ کی نبوت ورسالت اور بعثت پر نہاں خانہ دل سے ایمان رکھنا چاہیے اور یہ پختہ ایمان ہونا چاہیے کہ آپؐ اللہ کی طرف سے مبعوث کردہ آخری نبی ہیں، اماموں اور حکمرانوں کے تئیں نصیحت کا خلاصہ یہ ہے کہ ان کی تعظیم و تکریم کی جائے، ان کی باتوں کو روبہ عمل لایا جائے، انہیں مشورہ جات سے نوازا جائے، اور ان تمام امور میں ان کی حمایت و تائید کی جائے جسے وہ کتاب وسنت کی روشنی میں انجام دیتے ہیں، اور کتاب وسنت سے انحراف کی صورت میں انہیں ارشادات نبوی کی یاد دہانی کرائی جائے اور انہیں صراط مستقیم اور جادہ حق پر گامزن کرنے کی ہر ممکن کوشش کی جائے۔ مسلمانوں کے تعلق سے خیر خواہی کا مطلب یہ ہے کہ ان کی دنیوی فلاح و بہبود اور اخروی کامیابی وکامرانی کے تعلق سے تمام امور میں رہنمائی کی جائے، ان کی زندگی، عزت نفس، وقار اور عفت و عصمت کو تحفظ فراہم کیا جائے، اور ان کی دینی سمجھ اور اسلامی فہم میں درستگی اور سدھار پیدا کرنے کے لیے مخلصانہ کاوش کی جائے"۔﴿حوالہ سابق:۲۳۸﴾

سچائی یہی ہے کہ نیکی کا حکم دینا اور بدی سے روکنا مسلم قوم کی مابہ الامتیاز خصوصیت ہے، اظہار رائے کی آزادی ایک انسان کو اس وقت تک فراہم کی جاتی ہے جب تک کہ وہ انسانیت کے عمومی مفاد کی بات کرتا ہے، اور کوئی ایسا نقطہ نظر اور فلسفہ نہیں پیش کرتا ہے جو امت میں فتنہ وفساد کا باعث ہو، لوگوں میں اضطرابی کیفیت پیدا کرتا ہو اور آپسی جدال اور باہمی قتال کا پیش خیمہ ثابت ہوتا ہو، اس بنیاد پر اسلام مرد اور عورت

دونوں کو اپنے خیالات کے اظہار کا موقع فراہم کرتا ہے اور تمام تر اندیشوں سے بالاتر ہو کر اپنے نقطہ نظر کی وضاحت کی اجازت دیتا ہے، اسلام اس ذمہ داری کو کسی مخصوص جماعت اور گروہ کے لیے خاص نہیں کرتا ہے، بلکہ اسے ان تمام مسلمانوں کی ذمہ داری قرار دیتا ہے جو باہمی مشورہ کے اصول کو بروئے کار لانا چاہتے ہیں اور بھلائی کا حکم دینے اور برائی سے منع کرنے کے متمنی ہیں۔ مذکورہ بالا باتوں کا ماحصل اور خلاصہ یہ ہے کہ مسلمان عورتوں کو ہمیشہ اظہار رائے کی آزادی حاصل رہی ہے، اور اہم امور میں ہمشیہ انہیں مشورہ دینے کا حق حاصل رہا ہے، آپ ﷺ ہمیشہ ان کی باتیں سنتے تھے اور قابل عمل باتوں کو عملی جامہ بھی پہناتے تھے، اس کی ایک قابل ذکر اور شہرت یافتہ مثال وہ واقعہ ہے جو صلح حدیبیہ کے بعد وقوع پذیر ہوا، جب معاہدہ صلح انجام پا گیا، تو آپ نے اپنے ساتھیوں کو قربانی کا جانور ذبح کرنے کا حکم دیا، لیکن اصحاب رسول کافی رنجیدہ اور مغموم تھے اور حکم نبوی کی تعمیل میں تردد کا اظہار فرمانے لگے، نبی پاک نے اپنے فرمان کو تین بار جاری کیا، لیکن تعمیل اور بجاآوری کی کوئی علامت نظر نہیں آرہی تھی، در آخر، آپ حضرت ام سلمہؓ کے پاس پہنچے اور حقیقت حال سے باخبر کرایا، اپنے اصحاب کی طرز عمل اور نافرمانی و حکم عدولی پر مبنی رویہ کا شکوہ کیا، ام سلمہ نے آپ کو مشورہ دیا کہ بنا کسی سے مخاطب ہوئے آپ براہ راست باہر نکلیں، اپنا جانور قربان کریں اور حلاق کو بلا کر اپنا حلق کروائیں، یہ منظر دیکھ کر اصحاب رسول بھی اپنا اونٹ ذبح کرنے لگے اور بالوں کو کٹوانے لگے۔﴿جمع الفوائد من جامع الاصول وجمع الزوائد للامام محمد بن محمد بن سلیمان ج ۲ باب غزوۃ الحدیبیۃ ص ۱۲۶﴾

مذکورہ بالا واقعہ اس بات کی اعلا مثال ہے کہ کس طرح امت مسلمہ کی فلاح و بہبود کے لیے عورتوں کے مشورے قابل عمل ہوتے ہیں اور اہم امور میں ان سے مشورہ طلب کیا جاتا ہے، اظہار رائے کی آزادی معاشرہ کے ہر فرد کو حاصل ہے قطع نظر اس سے کہ وہ چھوٹا ہے، یا بڑا، مرد ہے کہ عورت اور معاشرتی لحاظ سے اہمیت کا حامل ہے کہ نہیں۔

حضرت عمرؓ یعنی دوسرے خلیفہ جو اپنی دریادلی اور ہمدردی و غمگساری کے لیے مشہور تھے، جب انہوں نے محسوس کیا کہ لوگ مہر کے معاملے میں مبالغہ آرائی سے کام لے رہے ہیں تو انہیں اس کے نتیجہ بد کی فکر دامن گیر ہوئی، وہ منبر پر کھڑے ہوئے اور لوگوں کو خطاب کرتے ہوئے ان کی سرزنش کی اور مہر کی متعین

مقدار سے تجاوز کرنے سے روکا، پھر انہوں نے ان لوگوں کو جنہوں نے ضرورت سے زیادہ مہر دے رکھا تھا، زائد رقم کو مسلمانوں کے خزانے میں جمع کرنے کا حکم دیا، اس فرمان کو سن کر اسی بھیڑ سے ایک عورت اٹھ کھڑی ہوئی اور بآواز بلند بولی: "اے عمر! کیا آپ نے اس سلسلے میں فرمان خداوندی کو نہیں سنا ہے؟ اللہ تعالی کا فرمان ذیشان ہے: "وإن أردتم إستبدال زوج مكان زوج وآتيتم احداهن قنطارا فلا تأخذوامنه شيئا اتاخذونه بهتاناواثمامبينا". {سورة النساء رقم الآية ۲۰} ترجمہ: اور اگر تم ایک بیوی کے بدلے دوسری بیوی کرنا چاہو، اور ان میں سے ایک کو مال کثیر دیا تھا، تو اس میں سے کچھ واپس نہ لو، کیا تم (وہ مال) اس پر بہتان باندھ کر اور صریح گناہ کرکے لینا چاہتے ہو۔

اس آیت کو سننے کے بعد حضرت عمر نے اپنی بات واپس لے لی اور بولے: "میں غلطی پر ہوں اور وہ عورت حق پر ہے"۔ ﴿تفسیر القرآن العظیم لابن کثیر ج ا ص ۴۶۸﴾

اسی طرح کا ایک واقعہ سورہ مجادلہ میں بھی ہے جہاں ایک عورت اپنے شوہر کی شکایت لے کر دربار نبوی میں حاضر ہوتی ہے، اپنے اوپر شوہر کی جانب سے ظلم وتعدی اور دست درازی کے ازالہ کی فریاد کرتی ہے، یہ شکایت دربار رسالت میں کرتی ہے، لیکن دربار خداوندی سے اس کے لیے خصوصی حکم کا نزول ہوتا ہے ، فرمان باری تعالی ہے: "قد سمع الله قول التي تجادلک في زوجها وتشتكي إلي الله والله يسمع تحاور كما إن الله سميع بصير". {سورة المجادلة رقم الآية ۱} ترجمہ: اللہ نے اس عورت کی بات سن لی جو آپ سے اپنے شوہر کے بارے میں جھگڑ رہی تھی، اور اللہ سے اپنے حال زار کا شکوہ کر رہی تھی، اور اللہ آپ دونوں کی بات چیت سن رہا تھا، بے شک اللہ خوب سننے والا، بڑا دیکھنے والا ہے۔

چنانچہ قرآن و سنت کی بنیاد پر اظہار رائے کی آزادی ایک تسلیم شدہ حق ہے جس سے ہر مسلمان عورت مستفید اور لطف اندوز ہوتی ہے، بشرطیکہ وہ اپنے حق کے استعمال میں اپنے مذہب کے اصول وضوابط اور آداب کی خاطر خواہ پاسداری کرتی ہو، جیسا کہ ہم نے مذکورہ بالا مثالوں میں دیکھا، کتاب و سنت کی روشنی میں اپنے خیالات کے اظہار کی ہر عورت کو آزادی دی گئی ہے اور یہ عورت کا بنیادی حق بھی ہے۔ تحفظ اور نگرانی کا حق:

مومن عورتوں کے لیے جو ملک کفر سے راہ مہاجرت اختیار کر کے ارض اسلام کو کوچ کرتی ہیں، اسلام نے ان عورتوں کو تحفظ و نگرانی فراہم کیا ہے اور اس طرح ان عورتوں کے حقوق میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا ہے۔ اللہ تعالی نے ان عورتوں کی مدد کی تلقین کی ہے جو اپنے گھر بار کو چھوڑ کر ملک کفر سے کوچ کر جاتی ہیں تا کہ کفار و مشرکین کے ظلم و ستم سے مامون رہ سکیں، اور ملک اسلام میں پناہ گزیں ہو جاتی ہیں تا کہ اپنے ایمان و عقیدہ کی حفاظت کر سکیں، اللہ تعالی نے ہمیں اس طرح کی ستم رسیدہ عورتوں کی مدد کی تلقین کی ہے اور ان کی ہر ممکن مدد، تعاون، حفاظت اور نگرانی کا حکم دیا ہے، اسی طرح معاشرہ میں ان کی سالمیت کو بر قرار رکھنے کی ہمیں نصیحت کی گئی ہے، غیر مسلم والدین اور رشتہ داروں کے پنجہ استبداد سے نجات دلانے کی ترغیب دی گئی ہے، اگر ضرورت پڑی تو ان کے شوہروں کو معاوضہ دیکر ان کی چنگل سے آزاد کرانے پر ابھارا بھی ہے، اور ساتھ ہی انہیں ایک باوقار اور پر سکون زندگی فراہم کرنے کا حکم بھی دیا ہے، چنانچہ ارشاد باری تعالی ہے:" یا أیھا الذین آمنوا إذا جاءکم المؤمنات مھجرات فامتحنوھن اللہ أعلم بإیمانھن فإن علمتموھن مؤمنت فلا ترجعوھن إلي الکفار لاھن حل لھم ولاھم یحلون لھن و آتوھم ما أنفقوا". {سورۃ الممتحنۃ رقم الآیۃ ۱۰} ترجمہ: اے ایمان والو! جب تمہارے پاس مومن عورتیں ہجرت کر کے آئیں، تو تم انہیں آزما لیا کرو، اللہ ان کے ایمان کو خوب جانتا ہے، پس اگر تمھیں معلوم ہو جائے کہ وہ مومن ہیں تو انہیں کافروں کے پاس نہ بھیجو، وہ مسلمان عورتیں کافروں کے لیے حلال نہیں ہیں اور نہ وہ کفار مردان مسلمان عورتوں کے لیے حلال ہیں، اور ان کافروں نے (شادی میں) جو خرچ کیا ہے، انہیں واپس کر دو۔

مذکورہ بالا آیت سے چند حقائق منظر عام پر آتے ہیں جو یوں ہیں:

۱- مسلمان عورتوں کے حقوق کی حفاظت، اس کی صیانت اور تحفظ واجب ہے۔

۲۔ مسلمان عورتوں کو کفار کے پنجہ استبداد سے نجات دلانا واجب ہے، نہیں تو کفار انہیں انتقامی کاروائی میں ناقابل تلافی گزند پہنچا سکتے ہیں۔

۳- راہ ہجرت اختیار کرنے والی عورتوں کے شوہروں کو معاوضہ دینا ضروری ہے جب وہ معاوضہ کا مطالبہ کریں۔

۴۔ مہاجر عورتیں از سر نو شادی کا حق رکھتی ہیں اور مہر کا مطالبہ کر سکتی ہیں۔

کچھ محققین اور قلم کاروں نے ان حقوق اور سیاسی پناہ گزینوں کی حیثیت کے درمیان مشابہت قائم کرنے کی کوشش کی ہیں، بات خواہ کچھ بھی ہو، لیکن یہ فرق نہایت ہی عظیم اور واضح ہے، پہلی چیز یہ کہ مذکورہ حقوق اللہ کی جانب سے ان تمام مہاجر عورتوں کو دی گئی ہیں جو حلقہ بگوش اسلام ہوتی ہیں، خواہ ان کی ذات، برادری، نسل، رنگ اور قومیت کچھ بھی ہو، سیاسی پناہ گزینوں کی حیثیت ان چند لوگوں کو بھی دی گئی ہے جو سیاسی اور عسکری طور پر اکثر و بیشتر پریشان رہتے ہیں، دوسری بات یہ ہے کہ ایک مسلمان عورت کبھی بھی اپنے کافر رشتہ داروں کے حوالے نہیں کی جاسکتی، لیکن ایک سیاسی پناہ گزیں اپنے دشمن کے حوالے کیا جائے گا جب کبھی اور جس طریقہ سے بھی مہمان ملک اس کا مطالبہ کرتا ہے، جب ملک کی سیاسی حالات اس کے متقاضی ہوں۔

بلاشبہ بین الاقوامی خود ساختہ قانون اور رب العالمین کی جانب سے پیش کردہ مقدس قانون کے مابین کوئی مقابلہ اور موازنہ نہیں ہے، رب کا قانون انسانوں کی فلاح و بہبود کے لیے ہے اور فطرت کے عین مطابق ہے۔ میرا مقصد ان منافع اور فوائد و ثمرات کی جانب اشارہ کرنا ہے جن سے صنف نازک اسلامی قانون کے تحت لطف اندوز ہوتی ہیں، یہ قانون عورتوں کو باعزت، پروقار اور قابل فخر زندگی فراہم کرتا ہے، انہیں مکمل تحفظ مہیا کرتا ہے اور اس طرح انہیں ایک پر سکون، آرام دہ اور قابل افتخار زندگی دیتا ہے۔

مزید برآں، تہذیب و ثقافت کی افزائش سے لیکر بیسویں صدی تک بین الاقوامی قانون کا مطالعہ کرنے کے بعد مجھے اب تک کوئی قانونی پہلو نہیں نظر آیا جو ایک مسلمان مہاجر عورت کو مساوی حق دیتا ہو۔ حق بیعت:

عدل و انصاف اور اعتدال و مساوات کا مزید اظہار اس وقت بھی ہوتا ہے جب ہم مشاہدہ کرتے ہیں کہ نبی ﷺ مرد اور عورت دونوں سے بیعت لیا کرتے تھے، وہ لوگ آپ سے عہد کرتے تھے کہ شرک نہیں کریں گے، اور ہر حال میں آپ کی اطاعت کریں گے، چنانچہ فرمان باری تعالی ہے:" یا أیھا النبي إذا جاءک المؤمنات یبایعنک علي أن لایشرکن باللہ شیئا ولایسرقن ولا یزنین ولایقتلن اولادھن ولا یاتین ببھتان یفترینہ بین أیدیھن وارجلھن ولایعصینک في معروف فبایعھن واستغفر لھن اللہ إن اللہ غفور رحیم ".{سورۃ الممتحنۃ رقم الآیۃ ۱۲} ترجمہ: اے میرے نبی! اگر آپ کے پاس مومن عورتیں، آپ سے اس بات پر بیعت کرنے کیلئے آئیں کہ وہ اللہ کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہیں بنائیں گی، اور چوری نہیں کریں گی، اور زنا نہیں کریں گی، اور اپنی

اولاد کو قتل نہیں کریں گی، اور اپنی ہاتھوں اور پاؤں کے درمیان گھڑا ہوا کوئی بہتان نہیں لائیں گی، اور کسی بھلائی کے کام میں آپ کی نافرمانی نہیں کریں گی، تو آپ ان سے بیعت لے لیجئے، اور اللہ سے ان کے لیے مغفرت کی دعا کیجئے، بیشک اللہ بڑا معاف کرنے والا، اور بے حد رحم کرنے والا ہے۔

صلح حدیبیہ کے بعد مذکورہ بالا آیت کا نزول ہوا، اور اس آیت کے بموجب آپ ﷺ ان عورتوں کا امتحان لیتے تھے جو آپ کے پاس ہجرت کر کے آتی تھیں، حضرت عروہؓ بیان کرتے ہیں کہ زوجہ رسول حضرت عائشہ نے بتلایا: "اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم اس آیت کی روشنی میں ان مومن عورتوں کو آزماتے تھے جو آپ کے پاس ہجرت کر کے آتی تھیں"۔﴿فتح الباری بشرح صحیح البخاری ج۸ کتاب التفسیر سورۃ الممتحنۃ ص ۶۳۶﴾

حضرت عائشہ سے مروی ہے، کہتی ہیں: "جو بھی مومن عورت آیت میں مذکور شرائط کو تسلیم کرتی، اللہ کے رسول اس سے کہتے: میں نے تمہاری بیعت قبول کرلی"، آپ فقط اتنا ہی کہتے، اللہ کی قسم آپ کے ہاتھوں نے دوران بیعت کسی بھی عورت کو مس نہیں کیا، آپ دوران بیعت عورتوں سے یہ کہہ کر بیعت لیتے تھے: میں نے تمہاری بیعت قبول کرلی"۔﴿حوالہ سابق﴾

فتح مکہ کے دن آپ نے مردوں اور ان عورتوں سے بھی بیعت لی جنہیں آپ نے اسلامی قوم کا آزاد اور متحرک رکن تصور کیا، وہ سب آپ کے پاس تشریف لائے، اور از خود حلقہ بگوش اسلام ہونے کا اعلان کیا، محض اللہ کی عبادت کا عہد کیا، اس کی ذات میں کسی کو شریک نہ ٹھہرانے کی یقین دہانی کرائی، اللہ کے شعائر اور حدود کی تعظیم کا وعدہ کیا، اور ان تمام امور سے اجتناب کا عزم کیے جو از روئے شرع حرام ہے، جیسے زناکاری، چوری، قتل وغارت اور دیگر جرائم، انہوں نے یہ بھی عہد کیا کہ وہ رسول پاک کی اطاعت کریں گے اور ذرہ برابر بھی آپ کی نافرمانی نہیں کریں گے، حکم رسول پر عمل پیرا ہونے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کریں گے اور جن چیزوں سے رسول پاک نے منع فرمادیا ہے اس سے ہمشیہ کنارہ کشی اختیار کریں گے۔ بیعت کا یہ طریقہ جو اخلاص وللّٰہیت اور کامل سپردگی پر قائم ہے اسلام میں عورتوں کی جانب سے پیش کردہ آزاد اور متحرک کردار کو اجاگر کرتا ہے، اس بیعت میں متعدد شرائط شامل تھے، وہ کچھ اس طرح ہیں:

۱۔ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرانا: یہ در حقیقت پہلی شرط تھی، اللہ کی ذات میں کسی کو شریک کرنا گناہ عظیم ہے جسے کبھی بھی معاف نہیں کیا جائے گا، فرمان باری تعالی ہے:"إن اللہ لا یغفر أن یشرک بہ ویغفر مادون ذلک لمن یشاء ومن یشرک باللہ فقد ضل ضلالا بعیدا". {سورۃ النساء رقم الآیۃ ۱۱۶} ترجمہ: اللہ اپنے ساتھ شرک کو کبھی بھی معاف نہیں کرے گا، اور اس کے علاوہ دیگر گناہوں کو حسب مرضی جس کے لیے چاہے گا معاف کر دیگا، اور جو شخص اللہ کے ساتھ کسی کو شریک کرتا ہے وہ گمراہی کے غار عمیق میں گر جاتا ہے۔

اور دوسری جگہ ہے:" إنہ من یشرک باللہ فقد حرم اللہ علیہ الجنۃ وماواہ النار وماللظالمین من أنصار ". {سورۃ المائدۃ رقم الآیۃ ۷۲} ترجمہ: بے شک جو اللہ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرائے گا تو اللہ نے اس پر جنت حرام کر دی ہے، اور اس کا ٹھکانہ جہنم ہے، اور ظالموں کا کوئی مددگار نہ ہو گا۔

۲۔ چوری نہ کرنے کا عہد:

جو بھی عورت چوری کے جرم میں گرفتار ہو گی اس کا ہاتھ کاٹا جائے گا، اور یہاں چوری سے عام چوری مراد ہے۔

۳- زنا اور بدکاری سے بچنا:

اس میں کوئی شک نہیں کہ زنا ایک سنگین ترین جرم اور بہت بڑا گناہ ہے جو سخت سزا کا موجب بن سکتا ہے، اللہ تعالی نے عورتوں کو متنبہ کیا ہے اور غیر شرعی جسمانی تعلقات قائم کرنے سے روکا ہے۔ ۴- اپنے بچوں کو قتل نہ کرنا:

عہد جاہلیت میں لوگ اپنے بچوں کو قتل کر دیا کرتے تھے، اس کفریہ عمل اور غیر انسانی حرکت پہ اسلام نے پابندی لگائی اور اس کے خاتمے کی کوشش کی، اسقاط حمل بھی بچوں کو مارنے کا ایک مؤثر ترین ذریعہ ہے، اور خاص طور سے جب یہ حرکت کسی معمولی، سطحی اور غیر طبی مقصد کے پیش نظر ہو، اسی لیے اسقاط حمل اسی وقت جائز ہے جب دوران حمل ماں کو کسی طرح کی جسمانی تکلیف اور صحت سے متعلق نقصان کا اندیشہ ہو، علامہ ابن حجر کا کہنا ہے:" قتل کا معاملہ اولاد کے ساتھ اس لیے مخصوص کیا گیا، کیونکہ ایک تو اس میں قتل ہے، اور دوسرا رحم مادر سے گلو خلاصی ہے، اسی لیے پرزور طریقہ سے اس کی ممانعت کی گئی ہے"۔ ﴿فتح الباری بشرح صحیح البخاری ج ۱ کتاب الایمان ص ۶۴﴾

۵۔ کذب وافترا اور بہتان سے اجتناب کرنا:

جو قرآنی آیات کا لغوی معنی ہے، وہ یہ ہے "نہ تو تم کوئی ایسا الزام اور بہتان لاؤ جسے تم از خود گڑھتے ہو "، یہ درحقیقت حمل اور بچے کی طرف اشارہ ہے، مذکورہ بالا آیت کا مطلب یہ بنتا ہے کہ کسی بھی عورت کو اپنے ناجائز بچے کا انتساب اپنے جائز شوہر کی جانب نہیں کرنا چاہیے، دانستہ طور پر جھوٹ بول کر، جھوٹی باتیں بنا کر اور اپنے جرم عظیم کا انتساب اپنے شوہر کی جانب کر کے۔ علامہ ابن حجر نے لکھا ہے: "اللہ تعالی نے خصوصیت کے ساتھ ہاتھ اور پاؤں کا ذکر کیا ہے، کیونکہ اچھے اور برے کام کا صدور اکثر انہی کے ذریعے ہوتا ہے "۔﴿حوالہ سابق﴾

٦-رسولؐ کی مخالفت اور ان کی حکم عدولی سے بچنا:

رسول اکرم ﷺ کے تمام تر احکام واجب العمل ہیں اور آپ کی تمام تر ارشادات قابل اتباع ہیں، آپ ﷺ نے تمام تر برے امور، شر ور وفتن سے روکا ہے، اور تمام تر اچھے امور، بھلائی، کار خیر اور نیک عمل کا حکم دیا ہے، لہذا وہ تمام چیزیں جن سے آپ ﷺ نے روکا ہے ان سے بچنا ضروری ہے۔ عورتوں کو بیعت کا حق فراہم کرتے ہوئے اسلام نے بیعت سے متعلق شرائط کو سمجھنے اور اس پر بحث کرنے کی اجازت دی ہے، عورتوں کو سوال کرنے، اور اپنے خیالات کے اظہار کا کامل حق دیا گیا ہے، بطور خاص ان امور میں جو ان کے مذہب سے متعلق ہیں۔ ایک مشہور واقعہ میں مذکور ہے کہ آپ ﷺ نے ہند کو کہا: "اللہ کی ذات میں کسی کو شریک مت کر"، اس پر ہند نے جواب دیا: "اللہ کی قسم! میں نے آپ کو یہ حکم مردوں پر نافذ کرتے ہوئے نہیں دیکھا"۔

آپؐ نے کہا: "چوری کے ارتکاب سے بھی بچنا ہے"۔

ہند نے کہا: " ابو سفیان جیب کے بہت سخت ہیں (یعنی بخیل ہیں)، میں ان کی جیب سے کچھ لے لیتی ہوں، تاکہ خود کو اور بچوں کو کھلا سکوں"۔

آپ ﷺ نے پوچھا: "کیا تم ہند بنت عتبہ ہو"؟

ہند نے جواب دیا: "اے پیغمبر خدا، اللہ آپ کی مغفرت فرمائے، جو گزر گیا سو گزر گیا"۔

آپ نے کہا: "زنا بھی نہیں کرنا ہے"۔

ہند نے کہا: "کیا ایک آزاد اور شریف عورت زنا بھی کرتی ہے"؟

آپ ﷺ نے کہا: "اور بچوں کو درگور بھی نہیں کرنا ہے"۔

ہند نے کہا: "جب بچے تھے تو ہم نے ان کی پرورش و پرداخت کی، اور جب بڑے ہوئے تو آپ نے انہیں مار ڈالا"۔ (ہند کا اشارہ حنظلہ بن ابوسفیان کی طرف تھا، جو جنگ بدر میں مار دیا گیا تھا)

یہ بات سن کر حضرت عمر ہنس پڑے، اور آپؐ زیر لب تبسم فرمائے اور بولے: "افترا پردازی اور بہتان تراشی نہیں کرنی ہے"۔

ہند نے کہا: "الزام تراشی تو نہایت ہی قبیح عادت اور بری حرکت ہے، اللہ رب العالمین نے انہی چیزوں کی اجازت دی ہے جو بہتر اور مناسب ہیں"۔ جب آپ نے اخیر میں کہا: "نبی کریم کی نافرمانی کرنا یہ کسی بھی زاویہ سے درست نہیں ہے"۔

اس پر ہند بولی: "ہم یہاں آپ کی نافرمانی کرنے نہیں بیٹھے ہیں"۔ ﴿الجامع لاحکام القرآن للقرطبی ج ۸ تفسیر سورۃ الممتحنۃ ص ۶۵۵۰﴾

آپ ﷺ نے عورتوں کو نوحہ گری اور سینہ کوبی سے بھی منع کیا ہے، ام عطیہ کہتی ہیں کہ ہم لوگوں نے آپ ﷺ سے بیعت لی اور آپ نے قرآن کریم کی یہ آیت تلاوت کی: "اور اللہ کے ساتھ کسی کو بھی شریک مت کرو"۔ اور آپ نے ہمیں نوحہ خوانی سے منع کیا۔ یہ کلمات "کسی بھی چیز میں نبی پاک کی نافرمانی نہ کرو" کی وضاحت کرتے ہوئے علامہ طبری نے لکھا: "نبی کریم ﷺ نے عورتوں کو میت پر نوحہ خوانی کرنے سے منع فرمایا، کیونکہ عہد جاہلیت کی عورتیں اپنے گریبان کو پھاڑتی تھیں، اپنے چہرے پر خراش لگاتی تھیں، اپنا بال نوچتی تھیں، اور میت پر نوحہ خوانی کے دوران ہلاکت و تباہی کی پکار لگاتی تھیں"۔ ﴿جامع البیان فی تفسیر القرآن للطبری ج ۲۸ ص ۵۱﴾ چنانچہ یہ بات واضح ہے کہ آپ ﷺ عورتوں کی بیعت قبول فرماتے تھے، اور بیعت لینے کے دوران مرد اور عورت دونوں کے بیچ مساوات اور عدل وانصاف کی روش اختیار کرتے تھے۔ عبادہ بن صامت کا بیان ہے، کہتے ہیں: "جب ہم لوگ نبی پاک ﷺ کے ساتھ تھے کہ آپ نے کہا: کیا تم قسم کھا کر

مجھ سے عہد کرو گے کہ اللہ کی عبادت میں کسی کو شریک نہیں کرو گے، تم زنا نہیں کرو گے، اور تم چوری نہیں کرو گے؟ پھر آپ نے عورتوں سے متعلق آیت کی تلاوت فرمائی، آپ ہمیشہ کہا کرتے تھے:" تم میں سے جو بھی شخص اپنے عہد کی پاسداری کرتا ہے، وہ اللہ سے اپنے انعامات کو وصول کرے گا، اور اگر کوئی ان میں سے کسی بھی جرم کا ارتکاب کرتا ہے، پھر اس پر سزا نافذ ہو گئی تو اس کی یہ سزا اس کے گناہوں کا کفارہ ہو گی، اور اگر کوئی ان جرائم کا ارتکاب کرتا ہے، پھر اللہ تعالی نے اس کی ستر پوشی کر دی، تو پھر اس کا معاملہ اللہ کے سپرد ہے، اگر چاہے گا تو معاف کرے گا، اور اگر چاہے گا تو سزا سے دوچار کرے گا"۔﴿فتح الباری بشرح صحیح البخاری ج۸ کتاب التفسیر سورۃ الممتحنۃ ص۶۳۸﴾

اسلام میں عورتوں کو جو مقام حاصل ہے اس کا اظہار بیعت میں ہوتا ہے اور اس زور میں بھی جو اس کے جواز پر ڈالی گئی ہے، بعینہ قرآن میں دیگر متعلقہ حقوق کی تخصیص کو بھی نظر انداز نہیں کیا گیا ہے۔ جہاد میں شرکت کا حق:

۲ ہجری میں جہاد کو مسلمانوں پر فرض قرار دیا گیا تھا، اس سلسلہ میں اللہ رب العالمین کا فرمان ذیشان ہے:" کتب علیکم القتال وھو کرہ لکم وعسي أن تکرھوا شیئا وھو خیر لکم وعسی أن تحبوا شیئا وھو شر لکم واللہ یعلم و أنتم لا تعلمون". {سورۃ البقرۃ رقم الآیۃ ۲۱۶} ترجمہ: تم پر جہاد فرض کیا گیا ہے، اگرچہ وہ تم کو ناپسند ہے، اور بہت ممکن ہے کہ تم کسی چیز کو ناپسند کرتے ہو، حالانکہ وہ تمہارے لیے اچھی ہے، اور بہت ممکن ہے کہ تم کسی چیز کو پسند کرتے ہو، حالانکہ وہ تمہارے لیے بری ہے، اور اللہ جانتا ہے اور تم لوگ نہیں جانتے۔

فرض عبادات کے بعد جہاد کو افضل ترین عبادت بتایا گیا ہے، عبد اللہ بن مسعود سے مروی ہے، کہتے ہیں:" میں نے پوچھا، اے اللہ کے رسول! اللہ کے نزدیک محبوب ترین عمل کون سا ہے؟، آپ نے جواب دیا: نماز کو اس کے مقررہ وقت پر ادا کرنا"، پھر میں نے پوچھا: کون سا عمل؟ آپ نے کہا: والدین کے ساتھ حسن سلوک کرنا"، پھر میں نے پوچھا: اس کے بعد کون سا عمل؟ آپ نے فرمایا:" اللہ کے راستے میں جہاد کرنا"۔﴿فتح الباری بشرح صحیح البخاری ج۱۰ کتاب البر والصلہ ص۴۰۰﴾ جہاد کا اجر بے پناہ اور ثواب غیر محدود ہے۔

جہاد کے سات شرائط ہیں: اسلام کا بطور مذہب اختیار کرنا، بلوغت، اچھی سمجھ، آزادی، مرد ہونا، نقصان و مضرت سے محفوظ ہونا، زاد سفر کا دستیاب ہونا۔ حضرت عائشہ سے مروی ہے، کہتی ہیں:" میں نے

پوچھا: اے اللہ کے رسول کیا عورت جہاد میں شرکت کرے گی؟ آپ نے جواب دیا: تمہارے لیے بغیر جدال وقتال کے جہاد ہے، اور وہ حج وعمرہ ہے"۔ ﴿فتح الباری بشرح صحیح البخاری ج ٦ کتاب الجہاد ص ۷۵﴾

جہاد ایک اجتماعی ذمہ داری ہے: جب مسلمانوں کی ایک جماعت اس فریضہ کو ادا کر دیتی ہے، تو دیگر لوگوں سے اس کی ذمہ داری ساقط ہو جاتی ہے، یہ ایک ایسا فیصلہ ہے جس پر اہل علم کا اتفاق ہے۔

ابن قدامی کا کہنا ہے: "جہاد مسلمانوں پر فرض ہے، اگر ایک جماعت پہلے ہی سے دشمنوں سے بر سر پیکار اور ملکی سرحد کی حفاظت کے لیے کوشاں ہے، تو یہ ذمہ داری دیگر احباب جماعت سے ساقط ہو جائے گی، اور اگر کوئی بھی اس کار خیر کو انجام نہیں دیتا ہے، تو پھر سب پر یہ فریضہ بر قرار رہے گا، کیونکہ باری تعالی کا فرمان ہے: "لا یستوي القاعدون من المؤمنین غیر أولي الضرر والمجاهدون في سبیل الله بأموالهم وأنفسهم فضل الله المجاهدین بأموالهم وأنفسهم على القاعدین درجة وكلا وعد الله الحسنى وفضل الله المجاهدین على القاعدین أجرا عظیما". {سورۃ النساء رقم الآیۃ ۹۵} ترجمہ: بغیر عذر کے (جہاد چھوڑ کر گھروں میں) بیٹھ جانے والے مسلمان، اور اللہ کی راہ میں اپنے مالوں اور اپنی جانوں سے جہاد کرنے والے برابر نہیں ہو سکتے، اللہ نے اپنے مالوں اور اپنی جانوں کے ذریعے جہاد کرنے والوں کو بیٹھ جانے والوں پر ایک گنا فضیلت دے رکھی ہے، اور اللہ نے ہر ایک سے اچھے اجر کا وعدہ کیا ہے، اور اللہ نے مجاہدین کو بیٹھ جانے والوں پر اجر عظیم کے ذریعے فضیلت دی ہوئی ہے۔

اور آپ ﷺ از خود جہاد میں اپنے اصحاب کے ساتھ شریک ہوتے تھے، یا پھر اپنے اصحاب کو مکمل رہنمائی کے ساتھ جہاد پر روانہ کرتے تھے"۔ ﴿المغنی لابن قدامہ ج ۱۰ کتاب الجہاد ص ۳۶۵﴾

جہاد فرض عین بھی ہے: جب کوئی دشمن ایک اسلامی ملک پر حملہ آور ہوتا ہے، تو اس ملک کے تمام باشندگان کو باہر نکلنا چاہیے اور اپنے دشمن سے پنجہ آزمائی کرنا چاہیے، اس صورتحال میں یہ بات غیر مناسب ہے کہ کوئی گھر ہی میں پڑا رہے اور راہ جہاد میں نہ نکلے۔ فرمان باری تعالی ہے: "یا أیها الذین آمنوا قاتلوا الذین یلونكم من الكفار". ﴿سورۃ التوبۃ آیت نمبر ۱۲۳﴾ ترجمہ: اے مومنو! تم ان کافروں سے قتال کرو جو تمہارے ارد گرد آباد ہیں۔ اس آیت پر تبصرہ کرتے ہوئے شیخ محمد شلتوت رقم طراز ہیں: "جب کفار و مشرکین مملکت اسلامیہ پر حملہ آور ہوں، تو ہر مسلمان پر اپنے گھروں سے نکلنا اور کفار و مشرکین کو اپنے مملکت سے دور کرنا لازم ہے، اس صورتحال میں عورت کو اجازت ہے کہ بغیر شوہر کی مرضی کے جہاد کو نکلے، بیٹے کو اجازت ہے کہ بغیر باپ کی

مرضی کے نکلے اور غلام کو اجازت فراہم کی گئی ہے کہ اپنے آقا کی مرضی کے بغیر راہ جہاد میں نکل پڑے"، فرمان باری تعالی ہے:" انفروا خفافا وثقالا وجاھدوا باموالکم و أنفسکم في سبیل اللہ ".{سورۃ التوبۃ رقم الآیۃ ۴۱}

ترجمہ: مسلمانو! راہ جہاد میں نکلو ہلکے ہو تب اور بھاری ہو تب، اور اپنے مال و دولت اور اپنی جانوں کے ذریعے اللہ کی راہ میں جہاد کرو، اگر تمہارے پاس کچھ علم ہے تو (جان لو کہ) یہی تمہارے لیے بہتر ہے۔

اس طرح کے حالات میں جہاں جان اور مال خطرات کی زد میں ہوں، اسلام مرد اور عورت دونوں کو مشترکہ طور پر امن و شانتی اور اتحاد و اتفاق کی بحالی کے لیے کوشش کرنے کی دعوت دیتا ہے "۔﴿الاسلام عقیدۃ وشریعۃ محمود شلتوت-غزو النساء وقتالھن ص۲۲۸﴾

سید قطب کا کہنا ہے:" اللہ رب العالمین نے جہاد کو عورتوں پر لازم نہیں قرار دیا ہے، بلکہ حسب ضرورت جہاد میں شرکت کی اجازت دی ہے، عہد رسالت میں عورتوں نے جہاد میں شرکت کیں اور مختلف جنگوں میں معرکہ کارزار کو گرم رکھا، بہر کیف اس طرح کے واقعات شاذ و نادر ہیں، کیونکہ اللہ تعالی نے عورتوں پر جہاد کو فرض نہیں کیا ہے، جیسا کہ مردوں پر فرض کیا ہے، جہاد عورتوں پر فرض نہیں کیا گیا ہے، کیونکہ عورتیں ہی راہ جہاد میں جذبہ جاں نثاری پیش کرنے والے مجاہدین کو جنم دیتی ہیں، اس کام کے لیے ایک عورت جسمانی اور نفسیاتی اعتبار سے کافی موزوں ہوتی ہے، اس کے پاس وہ فطری قوت اور قدرتی طاقت ہوتی ہے جو بچوں کو پیدا کرنے میں اس کی مددگار اور معاون ثابت ہوتی ہے، اور یہی بچے آگے چل کر دنیوی مجال اور میدان جہاد میں گراں قدر کارنامہ انجام دیتے ہیں، اس طرح کے مرد مجاہد پیدا کر کے ایک عورت اپنے سماج کی قابل ذکر خدمت کرتی ہے "۔﴿فی ظلال القرآن سید قطب ج ۲ سورۃ النساء ص ۶۴۴﴾

حکمت الہی کا تقاضا ہے کہ عورت بنفس نفیس گھروں میں رہ کر اپنے سماج اور معاشرے کی بقا کے لیے اپنی قابل قدر و لائق تحسین خدمات انجام دے، سب سے پہلے عورت ماں اور اپنے گھر کی ذمہ دار ہے، یہ ایک اہم اور مستقل ذمہ داری ہے جو کبھی ساقط نہیں ہوتی ہے اگر اس کا شوہر راہ جہاد میں نکلتا ہے، جہاد میں نکلنے والے مجاہدین کے بچے ہمہ وقت اپنے تحفظ اور تربیت کے لیے اپنی ماں کے محتاج رہتے ہیں، اور ان مجاہدین کے گھر بھی عورتوں کی نگرانی اور دیکھ بھال کے محتاج ہوں گے، اس اہم حقیقت کی جانب ایک انصاری عورت اسما بنت یزیدؓ کی طرف سے روشنی ڈالی گئی ہے جب کہ اس نے آپ ﷺ سے کہا:" جب آپ لوگ باہر جہاد کو

جاتے ہیں، تو ہم عورتیں آپ مردوں کے کپڑے سلتی ہیں، آپ کے بچوں کی پرورش وپرداخت کرتی ہیں، اور آپ کے اموال واملاک کی حفاظت کرتی ہیں"۔

اللہ تعالی نے مردوں کو کچھ ایسی خصوصیات کے ساتھ پیدا کیا ہے کہ وہ ہتھیار اٹھا سکتے ہیں، اور عورتوں کو کچھ ایسی طبیعت اور فطرت کے ساتھ پیدا کیا ہے کہ وہ گھر کی اہم اور ناگزیر ضروریات سے عہدہ برآں ہو سکتی ہیں۔ گرچہ جہاد عورتوں پر فرض نہیں ہے، تاہم وہ رضاکارانہ طور پر اس میں حسب ضرورت شرکت فرما سکتی ہیں، جو ان کی طبیعت اور ذات کے شایان شان ہو۔ عورتیں بھی جہاد میں شرکت کر سکتی ہیں جب کہ جہاد ایک ناگزیر ضرورت اور انفرادی مسئلہ بن جائے، صحابیات رسول نے بھی ایسا کیا جب انہیں محسوس ہوا کہ جان ومال کو خطرہ درپیش ہے اور جب معرکہ کارزار گرم دکھائی دیا۔ کچھ صحابیات نے تو بذریعہ تلوار بھی جنگ کیا میدان احد میں جب مجاہدین فریق مخالف کی کثیر تعداد کو دیکھ کر حیران وششدر ہو گئے تھے، اور آپ ﷺ صحابہ کرام کی ایک قلیل تعداد کے درمیان گھرے ہوئے تھے، جب صحابیات رسول نے اس حیرت انگیز منظر نامہ کو دیکھا کہ آپ ﷺ کی زندگی خطرے میں ہے اور تمام مسلمان خطرات کی زد میں ہیں، تو چشم زدن میں پیش قدمی فرمائیں اور آپ ﷺ کی حفاظت کے لیے دوڑ پڑیں۔ ام عمارہ نسیبہ بنت کعب حفاظت رسالت کے لیے اپنی تلوار نیام سے نکالتی ہیں، دشمنوں کے خلاف پوری شدت کے ساتھ اٹھ کھڑی ہوتی ہیں اور پوری جانبازی کے ساتھ ان سے لڑائی کرتی ہیں۔ ابن ھشام کا کہنا ہے: "ام عمارہ نسیبہ بنت کعب نے جنگ احد میں حیرت انگیز لڑائی لڑی"۔ ﴿السیرۃ النبویۃ لابن ھشام ج۳ ص۲۹﴾

پوری اسلامی تاریخ میں عورتوں کی جہاد میں شرکت سے متعلق متعدد اور متواتر خبریں ہمیں موصول ہوئی ہیں، اس ذمہ داری کو انہوں نے بایں طور انجام دیا کہ کوئی زخمیوں کو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرتی ہے، تو کوئی مریضوں کی تیمارداری کرتی ہے، کوئی فوجیوں کے بیچ پانی تقسیم کرتی ہے تو کوئی جہاد سے متعلق دیگر فرائض کی ادائیگی کرتی ہے۔ اس طرح کی خدمات میدان جنگ میں نہایت ہی اہم اور ضروری تھے۔ اگر مسلم عورتیں یہ خدمات انجام نہ دیتیں تو پھر ان خدمات کی انجام دہی کے لیے جنگی نقطہ نظر سے اہم فوجیوں کو مامور کیا جاتا، خوش قسمتی کی بات تو یہ ہے کہ مسلم عورتیں ہمہ وقت اس کار خیر کو انجام دینے کے لئے موجود رہتی تھیں اور حسب استطاعت اس بیش قیمت کارنامے کو انجام بھی دیتی تھیں۔ دیگر صحابیات رسول کی طرح ازواج

مطہرات بھی آپ ﷺ کے ساتھ جنگ میں شریک ہوتی تھیں، حضرت انس کا بیان ہے، کہتے ہیں: "جنگ احد کے موقع سے میں نے عائشہ بنت ابی بکر اور ام سلیم کو دیکھا کہ وہ اپنے پانی کا مشکیزہ لیے دوڑ رہی ہیں، پھر مشکیزہ کو پانی سے بھر لوگوں کے منہ میں انڈیل رہی ہیں، اور پھر پانی کا مشکیزہ بھرنے کو دوڑتی ہیں اور واپس آکر پھر لوگوں کو پانی پلا رہی ہیں"۔﴿فتح الباری بشرح صحیح البخاری ج۶ کتاب الجہاد ص۵۸﴾

اس حدیث کی تشریح کرتے ہوئے امام نووی رقم طراز ہیں: "عورتیں فوجی مہمات میں اپنے شوہروں کے ساتھ جا سکتی ہیں، اور جنگ و جدال کے موقع سے لوگوں کو پانی پلا سکتی ہیں"۔﴿شرح النووی علی صحیح مسلم ج۱۲ ص ۱۹۰﴾ مندرجہ ذیل حدیث اس بات پر مہر تصدیق ثبت کرتی ہے کہ عورتیں جہاد میں شرکت کرتی تھیں، چنانچہ حضرت انس بن مالک سے مروی ہے، کہتے ہیں: "اللہ کے رسول ﷺ ام سلیم اور دیگر انصاری عورتوں کے ساتھ جنگ کیا کرتے تھے، جب جنگ شروع ہوتی تو یہ عورتیں پانی پلاتی تھیں اور زخمیوں کو مرہم پٹی کرتی تھیں"۔﴿صحیح مسلم بشرح نووی ج۴ کتاب الجہاد ص ۴۸﴾ امام نووی کا کہنا ہے: "فوجی مہمات کے دوران مختلف امور عورتوں کے سپرد کیے جاتے تھے، جیسے پانی کی تقسیم، زخمیوں کی مرہم پٹی وغیرہ۔ ہر عورت اپنے شوہر یا محرم کا علاج کرتی تھی، اور دیگر لوگوں کے علاج کے دوران وہ جسمانی دوری کا خاص خیال رکھتی تھی اور بوقت ضرورت ہی کسی کے جسم کو مس کرتی تھی"۔﴿شرح النووی علی صحیح مسلم ج۴ کتاب الجہاد ص ۴۷﴾ یہ سب کے سب سچے مسلمان تھے اور اپنے مذہب کی گہری جانکاری رکھتے تھے، اور اللہ کی جانب سے متعین کردہ حدود کی پاسداری کرتے تھے۔ ربیع بنت معوذ کہتی ہیں: "ہم نبی پاک کے ساتھ جنگ میں ہوتے، لوگوں کو پانی پلاتے، ان کی خدمت بجالاتے اور زخمیوں اور شہیدوں کو مدینہ لاتے"۔﴿فتح الباری بشرح صحیح البخاری کتاب الجہاد ص۸۰﴾

یہ روایات ان ذمہ داریوں کی تفصیلات کو بیان کرتی ہیں جو جنگ کے موقع سے عورتوں کو تفویض کی گئی تھیں۔ ام عطیہ، ایک انصاری عورت کہتی ہیں: "میں سات جنگوں میں آپؐ کے ساتھ شریک رہی ہوں، میں مردوں کے خیموں کے پیچھے رہا کرتی تھی، ان کا کھانا بناتی، زخمیوں کو مرہم پٹی کرتی اور بیماروں کا علاج کرتی تھی"۔﴿صحیح مسلم بشرح نووی ج۴ کتاب الجہاد ص ۴۷۵﴾ مذکورہ بالا احادیث سے یہ انکشاف ہوتا ہے کہ گرچہ جہاد عورتوں پر فرض نہیں ہے، تاہم ناگزیر حالات میں کچھ مخصوص مجال میں انہیں اپنی خدمات انجام دینے کی

اجازت ہے نجدہ بن عامر نے عبد اللہ بن عباس کے پاس ایک خط لکھ کر پانچ خصلتوں کے بارے میں دریافت کیا، ابن عباس نے کہا: "اگر کتمان علم کا ڈر نہ ہوتا تو میں اس کے پاس کوئی جواب نہ لکھتا"، نجدہ نے حمد وصلوۃ کے بعد عبد اللہ بن عباس کے پاس لکھا: "مجھے بتائیں کہ آپ ﷺ نے عورتوں کو جہاد میں شریک کیا، اگر کیا تو کیا آپ نے عورتوں کے لیے مال غنیمت میں سے کوئی مستقل حصہ خاص کیا؟ کیا آپ نے دشمن کے بچوں کو قتل کیا؛ اور ایک یتیم کی مدت یتیمی کب تک رہے گی؛ اور خمس کس شخص کے لیے ہے؟ ابن عباس نے جواب میں لکھا: "آپ نے میرے پاس خط لکھ کر سوال کیا ہے کہ کیا آپ ﷺ عورتوں کو جہاد میں شریک کیا کرتے تھے، تو واضح رہے کہ آپ ﷺ انہیں جہاد میں لیکر جاتے تھے، اور بسا اوقات عورتیں آپ کے ساتھ ملکر جنگ بھی کرتی تھیں۔ وہ زخمیوں کا علاج بھی کرتی تھیں اور مال غنیمت سے اپنا انعام بھی وصول کرتی تھیں، لیکن آپ نے ان کے لیے مستقل کوئی حصہ نہیں متعین کیا تھا۔ اور آپ دشمن کے بچوں کو قتل نہیں کرتے تھے، نیز آپ نے مجھ سے یہ بھی پوچھا ہے کہ ایک یتیم کی مدت یتیمی کب ختم ہوتی ہے، میری زندگی کی قسم، ایک شخص اگر باریش ہو جائے، لیکن اس کے باوجود بھی اگر اپنا حق غیروں سے لینے سے قاصر ہے، اسی طرح وہ اپنے مال میں منظم انداز میں دست تصرف دراز کرنے کی لیاقت سے عاری ہے تو وہ بھی یتیم ہے اور یتیموں کی مانند سلوک کیے جانے کا مستحق ہے، لیکن جب وہ باشعور اور بالغ العمر لوگوں کی طرح اپنے مفادات کو تحفظ فراہم کرنے کی قابلیت سے لیس ہو جاتا ہے، تو پھر وہ یتیم نہیں رہے گا۔ اور آپ نے میرے پاس خمس کے تعلق سے بھی سوال بھیجا ہے، تو لیجئے اس سلسلہ میں جواب حاضر ہے، ہم آل رسول کہا کرتے تھے: "یہ ہمارے لیے ہے، لیکن ان لوگوں (بنو امیہ) نے اس بات کو مسترد کر دیا ہے"۔ ﴿صحیح مسلم بشرح نووی ج۴ کتاب الجہاد ص ۱۷۴﴾

اس حدیث کی تشریح کرتے ہوئے امام نووی رقم طراز ہیں: "عبد اللہ بن عباس نجدہ کو جواب دینے کو لیکر تذبذب میں مبتلا تھے، کیونکہ وہ ایک خارجی شخص تھا، (یعنی ایک متشدد جماعت سے تعلق رکھتا تھا جو تحریف شدہ نظریہ رکھتی ہے) چنانچہ اس خدشہ کے پیش نظر کہ کتمان علم کے ارتکاب کے سبب کہیں عقاب الہی کے مستحق نہ ہو جائیں، عبد اللہ بن عباس نے نجدہ کے سوال کا جواب دے دیا"۔ ﴿حوالہ سابق﴾ امن وامان دینے کا حق:

مذہب اسلام نے مرد وزن دونوں کو اس بات کا حق فراہم کیا ہے کہ وہ کسی شخص کو پناہ اور امان دیں، خواہ وہ بت پرست، کافر، مشرک یا دشمن فوجی ہی کیوں نہ ہو، چنانچہ اللہ تعالی کا فرمان ہے:" وإن أحد من المشركين استجارك فاجره حتى يسمع كلام الله ثم أبلغه مأمنه ذلك بأنهم قوم لا يعلمون ". {سورۃ التوبۃ رقم الآیۃ ٦}

ترجمہ: اور مشرکوں میں سے کوئی آپ سے پناہ مانگے تو اسے پناہ دیجیے، تاکہ وہ اللہ کا کلام سن سکے، پھر اسے اس کی جائے امان تک پہنچادیجئے، اس لیے کہ وہ (اسلام کا) کچھ بھی علم نہیں رکھتے ہیں۔

مذکورہ بالا آیت کی تفسیر میں علامہ زمخشریؒ رقم طراز ہیں:" یہ آیت واضح طور پر اشارہ کرتی ہے کہ اگر کوئی بت پرست، کافر یا مشرک تمہارے پاس حرمت کا مہینہ ختم ہونے کے بعد آئے، اور اسلام کے بارے میں کچھ معلومات حاصل کرنے کے لیے پناہ اور امان طلب کرے تو اسے پناہ اور امان دینی چاہیے تاوقتیکہ وہ کلام الہی کو سماعت کرلے۔ اگر اس کے بعد بھی وہ دائرہ اسلام میں داخل نہیں ہوتا ہے تو اسے اس کی جائے رہائش تک پہنچا دینا چاہیے اور ان لوگوں کے بیچ چھوڑ دینا چاہیے جہاں اس کی زندگی اور دولت وثروت محفوظ ہیں"۔﴿الکشاف عن حقائق التنزیل وعیون الاقاویل للزمخشری م ۲ ص ۱۷۴﴾ اس تشریح سے علامہ زمخشری نے اس بات کی توضیح کردی ہے کہ کس طرح امان اور پناہ وتحفظ فراہم کیا جانا چاہیے اور امن وامان دینے والے شخص کا طرز عمل اور طریقہ کار کیا ہونا چاہیے۔

اور علامہ ابن کثیر کہتے ہیں:" یہ حق ان لوگوں کو فراہم کیا جاتا ہے جو دار الکفر سے دار الاسلام کی جانب کوچ کرتے ہیں تاکہ کوئی پیغام پہنچا سکیں، امن وآشتی اور صلح وشانتی کا معاہدہ کرسکیں، آپسی بھائی چارگی کا کام کرسکیں، یا عام طور سے جزیہ وصول کرسکیں یا کسی تجارتی امور کو انجام دے سکیں، ایک اجنبی شخص کو امام یا نائب امام سے اپنے لیے امن وامان اور پناہ کی درخواست کرنی چاہیے تاکہ مسلمانوں کے بیچ دوران قیام تحفظ حاصل رہے اور جب تک اپنی سرزمین اور لوگوں کے بیچ لوٹ نہ جائے کسی گزند، اذیت رسانی اور تکلیف سے دوچار نہ ہو"۔﴿تفسیر القرآن العظیم لابن کثیر ج ۲ تفسیر سورۃ التوبۃ ص ۳۳۷﴾

اس پر مزید روشنی ڈالتے ہوئے علامہ محمود شلتوت کہتے ہیں:" اسلام نے اس باب میں توسع کو اختیار کیا ہے، لہذا پناہ گزیں شخص کی عزت وآبرو کی حفاظت کو ناگزیر قرار دیا ہے، اور اس کی جان ومال کی حمایت کو مسلمانوں پر واجب فرمایا ہے، جب تک کہ وہ اسلامی مملکت میں پناہ گزیں ہے۔ اور اس امن وامان کی پاسداری،

عہد کا خیال اور میثاق کا التزام تمام مسلمانوں کو کرنا چاہیے گرچہ پناہ کسی معمولی حیثیت اور ادنی درجہ کا شخص ہی کیوں نہ دیا ہو"۔﴿تفسیر القرآن الکریم محمود شلتوت آیۃ الامان ص ۶۲۲﴾

پناہ کوئی مرد بھی دے سکتا ہے، کوئی عورت بھی دے سکتی ہے، کوئی آزاد مسلمان بھی پناہ دے سکتا ہے اور کوئی غلام مسلمان بھی پناہ دینے کا استحقاق رکھتا ہے۔ محض پناہ دے دینے سے اس کا نفاذ ہو جاتا ہے، لیکن حتمی طور پر اس کا نفاذ حاکم وقت اور سپہ سالار فوج کی منظوری کے بعد ہی ہونا چاہیے﴿فقہ السنۃ للسید سابق ج ۲ عقد الامان ص ۶۹۴﴾

لیکن واضح رہے کہ امان دینے اور تحفظ فراہم کرنے کے کچھ شرائط ہیں، جب تک یہ شرائط پورے نہ ہوں پناہ دینا غیر مناسب ہے؛ پناہ گزیں کو مسلمانوں کے لیے کسی خطرہ کا باعث نہیں بننا چاہیے۔ اگر پناہ گزیں کو لیکر کسی بھی طرح کا شک وتذبذب ہے، جیسے جاسوسی کرنا یا مسلمانوں کا دشمن ہونا، یا پھر اس کا وجود مسلمانوں کی حیثیت اور پوزیشن کو کمزور کرنے کا سبب بنتا دکھ رہا ہو، تو پھر حاکم مملکت اس کی پناہ اور تحفظ کے معاہدہ کو منسوخ کر سکتا ہے، اگر اسے اس عمل میں کوئی بہتری اور حکمت محسوس ہو تو﴿تفسیر القرآن الکریم محمود شلتوت آیۃ الامان ص ۶۲۲﴾ پناہ اس وقت دی جاتی ہے جبکہ پناہ دینے والا شخص اس کی اجازت دے، اور پناہ لینے والا شخص اس بات کو قبول کرے، یا معاملہ اس کے برعکس ہو۔ دونوں طرح کے معاہدات عہد نبوی میں انجام پائے ہیں، فتح مکہ کے موقع پر اہل قریش کو پناہ دیتے ہوئے آپ ﷺ نے اعلان کیا تھا:" جو لوگ ابو سفیان کے گھر میں داخل ہوں گے، اور جو لوگ اپنا دروازہ بند کرلیں گے اور جو لوگ مسجد میں داخل ہو جائیں گے وہ سب کے سب محفوظ رہیں گے"۔﴿السیرۃ النبویۃ لابن ھشام ج ۴ فتح مکۃ ص ۲۴﴾ یہ بات آپ ﷺ کی جانب سے لوگوں پر فرض تھی، اور جو شخص بھی ان باتوں میں مذکور شرائط اور ارشادات کو بروئے کار لاتا اسے تحفظ فراہم کیا جاتا۔ ایک اور موقع سے سفیان بن امیہ نے آپ سے پناہ مانگی اور آپ نے پناہ دی۔

اسلام نے عورتوں کو یہ حق عطا کیا ہے کہ وہ دشمنوں کو پناہ اور تحفظ فراہم کریں، دختر ابو طالب ام ھانیؓ نے ایک مستند حدیث میں بیان کیا ہے:" فتح مکہ کے موقع سے میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس گئی ۔۔۔۔ میں نے کہا:" اے اللہ کے رسول! میرے بھائی علی نے یہ اعلان کر رکھا ہے کہ وہ ایک ایسے شخص کو قتل کرے گا جسے میں نے پناہ دے رکھی ہے، وہ شخص فلاں ابن ھبیرہ ہے"، رسول اللہ نے کہا:" اے ام ھانی!

ہم اسے پناہ دیں گے جسے آپ نے پناہ دے رکھی ہیں "۔﴿فتح الباری بشرح صحیح البخاری ج ٦ کتاب الجزیۃ ص ۱۹۵﴾ اور اس طرح آپ نے ہر مسلمان کو مکلف بنایا ہے کہ ایک مسلمان عورت کی طرف سے دیے گئے عہد کی تعظیم و تکریم کریں، اس کی خواہشات کی تکمیل کریں اور کسی ایسے شخص کو تکلیف و اذیت نہ پہنچائیں جسے عورت نے پناہ دے رکھی ہے خواہ وہ شخص واجب القتل ہی کیوں نہ ہو۔

ایک دوسری روایت کے مطابق قبیلہ بنی مخزوم کے دولوگوں نے ام ہانی کے گھر میں پناہ طلب کی، ام ہانی نے انہیں اندرون خانہ بند کر دیا، بسرعت تمام آپ ﷺ کے پاس پہنچی اور صورتحال سے روشناس کرائی۔ اس واقعہ کو سن کر آپ نے انہیں پناہ گزینوں کو اپنے گھر میں ٹھہرانے کی اجازت دے دی۔ اس سلسلہ میں امام ترمذی ایک حدیث نقل کرتے ہیں: "ام ہانی نے کہا: میں نے اپنے رشتہ داروں کو پناہ دے دی، اور آپؐ نے مجھ سے کہا: ہم اسے پناہ دیں گے جسے تم نے پناہ دے رکھی ہے"۔﴿سنن الترمذی ج ۴ کتاب السیر ص ۱۴۱﴾

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے متعدد شہادتیں اور مضبوط دلائل ملنے کے سبب عورتوں کو کسی کو پناہ دینے کا حق اسلام میں فراہم کیا گیا ہے، پوری انسانی تاریخ اور خود ساختہ قوانین میں مردوں کو بھی یہ حق دستیاب نہیں ہو سکا ہے عورت تو دور کی بات ہے۔ عورتوں کو یہ خصوصی حق فراہم کرکے اسلام مرد و زن دونوں کے درمیان مساوات کو تسلیم کرتا ہے اور ہر عورت کو یہ موقع فراہم کرتا ہے کہ وہ معاشرے کی ایک مستعد، باوقار، متحرک اور سرگرم رکن بن کر رہے۔ عورت اور منصب امارت:

کسی بھی منصب امارت اور عہدہ اقتدار پر فائز ہونے کا اسلامی نقطہ نظر سے مطلب یہ ہے کہ کوئی شخص مذہبی اور معاشرتی ذمہ داریوں کا نگراں ہو، اس کا استعمال ریاست کے خلیفہ کے لیے بھی ہوتا ہے، جو کسی صوبہ کا گورنر ہو یا کسی فوجی ٹکڑی کا سپہ سالار ہو۔ "ذمہ داریوں کی تقسیم" کے اصول کی بنیاد پر اس طرح کے مناصب اور عہدے فقط مردوں ہی کے شایان شان ہیں، خالق کائنات نے مرد اور عورت دونوں کو مختلف جسمانی اور نفسیاتی طبیعت اور فطرت کے ساتھ پیدا کیا ہے، تاکہ معاشرہ میں ان دونوں سے ان کی فطرت، طبیعت، میلان، رجحان اور امکان کے مطابق کام لیا جاسکے۔ اگر کوئی عورت منصب اقتدار پر فائز ہوتی ہے تو اسے لازمی طور پر محو سفر رہنا ہوگا تاکہ منصب سے متعلق اپنی ذمہ داریوں سے عہدہ برآں ہو سکے، اور اس کا عہدہ اس بات کا

متقاضی ہو گا کہ طویل مدت تک صنف مخالف سے اختلاط رکھے، اس سے تبادلہ خیال کرے اور اس کے ساتھ گوشہ نشینی اختیار کرے اور یہ چیز اسلامی تہذیب و ثقافت اور دینی تعلیمات کے مطابق ممنوع ہے۔ اس پر مستزاد یہ کہ عورتوں کی جسمانی ساخت مردوں کی جسمانی ہیئت سے مختلف ہے، عورتیں کمزور ہوتی ہیں، جذبات کے رو میں بہنے کی عادی ہوتی ہیں، اور بسا اوقات مشکل ترین حالات اور پریشان کن صورتحال سے نبرد آزما ہونے میں لاچار واقع ہوتی ہیں، عورت کے بالمقابل مرد کم جذباتی ہوتے ہیں اور بہت زیادہ قوت برداشت اور طاقت ضبط کا مظاہرہ کرتے ہیں۔

سچ تو یہ ہے کہ اسلام عورتوں کو ان حقوق سے نہیں روکتا اگر یہ امت مسلمہ کے عمومی مفاد میں نہ ہوتا، قانون قدرت نے یہ فیصلہ کر دیا ہے کہ عورت کا فطری اور بنیادی مشغلہ اس کا گھر ہے جہاں اس کے بچے رہتے ہیں، اور یہ بھی متعین کر دیا ہے کہ مرد گھریلو اخراجات کے بوجھ اٹھائیں اور اہل خانہ کو خورد ونوش کی اشیا فراہم کریں۔ دونوں ذمہ داریاں کامل توجہ اور مکمل یکسوئی کا تقاضا کرتی ہیں، چنانچہ ایک عورت کے لیے منصب اقتدار پر فائز ہونے کا مطلب گھریلو ذمہ داری، بچوں کی نگہداشت اور پریوار کی دیکھ بھال سے پہلو تہی کرنا ہے۔ آپ ﷺ نے واضح طور پر یہ بات کہہ دی: "جو لوگ عورتوں کو اپنے معاملات کی نگراں بناتے ہیں وہ کبھی کامیابی سے ہمکنار نہیں ہوسکتے"۔ ﴿فتح الباری بشرح صحیح البخاری ج ۱۳ کتاب الفتن ص ۴۶﴾

پھر بھی عورتیں کم بوجھ کے حامل ذمہ داریوں اور مناصب پر فائز ہو سکتی ہیں جو ان کے ماں اور بیوی ہونے کے فطری اور بنیادی کردار سے متصادم نہ ہوتے ہوں۔ خلیفہ ثانی حضرت عمر فاروق نے شفا بنت عبد اللہ العدویۃ کو بازار کی ذمہ داری سپرد کیا تھا، حضرت عمر ان کی بات سنتے تھے اور مشورہ کو قبول فرماتے تھے، ان کی دیکھ بھال کرتے تھے، اور گاہے بہ گاہے بازار کی ذمہ داریوں کو ان کے سپرد کرتے تھے، یہ بات ان کے دونوں پوتوں کے ذریعے بیان کی گئی ہے؛ ابو بکر اور عثمان سلیمان بن ابی حثمۃ کے بیٹے"۔ ﴿الاصابۃ فی تمییز الصحابۃ ج ۴ حرف الشین ص ۳۴۱﴾

حضرت عمر فاروق نے انہیں اس طرح کی ذمہ داریاں اس لیے تفویض کی، کیونکہ وہ خوش خط تھیں، بے پناہ علم رکھتی تھیں اور ایک نیک سیرت خاتون اور پارسا عورت تھیں۔ چنانچہ اسلام نے عورتوں کو تعظیم و

تکریم سے سرفراز کیا ہے، ان کی ذمہ داریوں کو واضح کیا ہے، ان کے حقوق کو متعین کیا ہے، ان کی سیاسی حیثیت کو اجاگر کیا ہے اور تمام شعبہ حیات میں وہ جن مناصب اور عہدوں کی اہلیت اور لیاقت رکھتی ہیں ان عہدوں پر انہیں فائز کرنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کرتا ہے۔

بارھواں باب:

معاشی حقوق:

معاشی حقوق کی اہلیت:

اسلامی اصول اور مذہبی فقہ میں یکساں قانونی فیصلے اور احکام نافذ ہوتے ہیں ان تمام لوگوں کے لیے جو شرعی احکام وعبادات کے مکلف ہیں الا یہ کہ قرآن وحدیث سے کسی کے لئے استثنا اور رخصت کی کوئی صورت نکل آئے۔ جیسا کہ میں پہلے ہی بیان کر چکی ہوں کہ عورتیں کتاب وسنت کے مطابق مذہبی عبادات کی مکلف ہیں، تو اس سے یہ نتیجہ بر آمد ہوتا ہے کہ مردوں کی مانند عورتیں بھی انہی معاشی حقوق کا استحقاق رکھتی ہیں۔عبادت کرنے کا حق تو کتاب وسنت سے ثابت ہے، اور منقولہ جائداد رکھنے، حقیقی زمینداری کرنے، نیز کاشت کاری اور زراعت کے امور بھی اسی حق کو شامل ہیں۔ اللہ تعالی کا فرمان ہے:"ولا تتمنوا ما فضل اللہ بہ بعضکم علی بعض للرجال نصیب مما اکتسبوا وللنساء نصیب مما اکتسبن وسئلوا اللہ من فضلہ إن اللہ کان بکل شيء علیما{سورۃ النساء رقم الآیۃ ۳۲} ترجمہ: اور اللہ نے تم میں سے بعض کو بعض کے اوپر جو برتری دی ہے اس کی تمنا نہ کرو، مردوں کو ان کی کمائی کا حصہ ملتا ہے اور عورتوں کو ان کی کمائی کا حصہ ملتا ہے، اور اللہ سے اس کا فضل مانگا کرو، اللہ ہر چیز کو بخوبی جانتا ہے۔

ایک بار ام سلمہ نے آپ سے کہا:" اے اللہ کے رسول! مرد جہاد کو جاتے ہیں اور عورتیں نہیں جاتیں؛ اور ہمیں وراثت میں بھی نصف حصہ ہی ملتا ہے"، تب جا کر مذکورہ بالا آیت کا نزول ہوا۔﴿سنن الترمذی ج ۵ کتاب التفسیر سورۃ النساء ص ۲۳۷﴾

اس حدیث سے ہمیں یہ سبق ملتا ہے اور نصیحت حاصل ہوتی ہے کہ کسی شخص کو کسی کے فضائل، اموال، املاک اور خوشگوار زندگی دیکھ کر حسد اور لالچ کا شکار نہیں ہونا چاہیے، کیونکہ اللہ کسی کو کم دیتا ہے تو کسی کو زیادہ سے نوازتا ہے، یہ اللہ کی مرضی ہے جس سے خوشی کا اظہار کرنا چاہیے۔ اس سے ہمیں یہ بھی سمجھ میں آتا ہے کہ اس طرح کی نعمتیں یا تو مادی ہوتی ہیں یا پھر روحانی ہوتی ہیں۔ علامہ ابن جریر نقل کرتے ہیں کہ عطا بن ابی رباح نے کہا:" یہ آیت ایک مسلمان کو اللہ کی طرف سے سرفراز کی گئی کسی شخص کی نعمت پر حسد کرنے

سے روکتی ہے، اور عورتوں کو منع کرتی ہے کہ وہ مرد بننے کی خواہش نہ پالیں تاکہ جہاد میں شرکت کا موقع ملے "، علامہ ابن جریر مزید کہتے ہیں: "مرد اور عورت دونوں اپنی جنس کے اعتبار سے مساوی طور پر ثواب اور انعام سے سرفراز کیے جاتے ہیں، ایک اچھا عمل ایک اچھے نتیجہ کا باعث بنے گا اور ایک برا عمل برے نتیجہ کا باعث بنے گا"۔ ﴿تفسیر القرآن العظیم لابن کثیر ج ا تفسیر سورۃ النساء ص ۴۸۸﴾ اس قول کو میراث کی جانب اشارہ اور دلالت کے طور پر بھی سمجھا گیا ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ ہر مرد اور عورت کو اللہ کی طرف سے متعین حصہ ہی ملے گا۔ ابو جعفر کا کہنا ہے: "اس آیت کو مختلف ناحیہ اور متنوع زاویہ سے سمجھا گیا ہے:

ا- اس کا مطلب یہ ہے کہ مرد جن چیزوں کے مستحق ہیں اسے وہ حاصل کریں گے، اللہ کی تابعداری اور اطاعت شعاری کی وجہ سے نیکی سے سرفراز کیے جائیں گے اور اللہ کی نافرمانی کی وجہ سے سزا سے دوچار کیے جائیں گے۔ یہی قاعدہ عورتوں پر بھی منطبق ہوتا ہے۔ بشر بن معاذ کا کہنا ہے کہ یزید نے سعید کے حوالے سے بیان کیا ہے کہ حضرت قتادہ اس آیت کے سلسلے میں کہتے ہیں: "زمانہ جاہلیت میں عورتیں اور بچے میراث میں حصہ نہیں پاتے تھے، فقط مرد ہی تھے جو کام کرتے تھے، گھر کے اخراجات برداشت کرتے تھے اور میراث میں حصہ پاتے تھے۔ جب یہ آیت نازل ہوئی کہ عورتوں کو میراث میں حصہ ملنا چاہیے اور مردوں کی بنسبت انہیں نصف حصہ ملنا چاہیے، تو عورتوں نے کہا: "کاش کہ ہمیں بھی مردوں کے برابر حصہ ملتا"، اور مرد حضرات کہنے لگے: "ہمیں امید رکھنی چاہیے کہ ہمیں اتنا ہی انعام ملے گا جتنا ہمیں میراث میں حصہ ملتا ہے"۔

۲- آیت سے واضح ہوتا ہے کہ مردوں کے لیے وراثت کا ایک حصہ ہے اور عورتوں کے لیے وراثت کا ایک دوسرا حصہ ہے۔ بہر کیف، آیت میں اللہ تعالی بیان کرتا ہے: "وہ جو کچھ کرتے ہیں اس کے لیے ایک انعام مقرر ہے"، اور وراثت چونکہ کمائی ہوئی شے نہیں ہے بلکہ دوسروں سے وراثت میں حاصل شدہ چیز ہے، اس لیے اس کی بہتر تفسیر یہ ہو سکتی ہے کہ مرد اور عورت دونوں اپنی اچھی کمائی پر انعام کے مستحق ہوں گے اور بری کمائی پر سزا سے دوچار کیے جائیں گے۔ "کسب" سے مراد جد وجہد اور محنت شاقہ ہے، جبکہ "المکتسب" سے مراد وہ شخص ہے جو عمل پیہم اور سعی مسلسل کرتا ہے ﴿تفسیر طبري جامع البیان عن تأویل آي القرآن لأبي جعفر الطبري ج۸ ص۲۶۷﴾

مؤخر الذکر تفسیر ہی قابل قبول معلوم ہوتی ہے، کیونکہ جیسا کہ ابن جعفر نے بیان کیا ہے کہ آیت میں کمانے کا عمل اپنی محنت کا نتیجہ اور کد و کاوش سے حاصل کردہ منافع کی جانب اشارہ کرتا ہے، مرد اور عورت دونوں ملکیت کا حق رکھتے ہیں، اور اس حق کے تقدس کو برقرار رکھا جانا چاہیے، اور اس کے تشخص کو تحفظ فراہم کیا جانا چاہیے۔

مذکورہ بالا آیت آدمی کو حسد سے روکتی ہے، لالچ سے منع کرتی ہے اور کینہ کپٹ کو ممنوع قرار دیتی ہے۔ یہ مردوں سے عمل صالح اور کار خیر پر ثواب عظیم کا وعدہ کرتی ہے۔ اسی طرح یہ آیت عورتوں سے بھی انکے اچھے اعمال پر ثواب عظیم کا وعدہ کرتی ہے، یہ آیت اس بات کو بھی ثابت کرتی ہے کہ اللہ ہی کی ذات ہے جو اپنی رحمتوں کی بارش اور نوازشوں کی ژالہ باری اپنے بندوں پر کرتی ہے، یہ بھی واضح کرتی ہے کہ مرد اور عورت دونوں کو اللہ سے مغفرت طلب کرنی چاہیے اور اس کی عنایتوں کے لیے گہار لگانی چاہیے، اور یہ بھی آیت سے عیاں ہوتا ہے کہ اللہ تعالی کا علم تمام اشیاء کو محیط ہے۔ یہ جاننا بھی اہم ہے کہ یہ آیت سابقہ آیتوں سے الگ نہیں ہے اور نہ اسے علیحدہ خانہ میں رکھنا ہی چاہیے:

"یا أیھا الذین آمنوا لا تاکلوا أموالکم بینکم بالباطل إلا أن تکون تجارۃ عن تراض منکم ولا تقتلوا أنفسکم إن اللہ کان بکم رحیما". {سورۃ النساء رقم الآیۃ ۲۹} ترجمہ: اے ایمان والو! تم لوگ اپنا مال آپس میں ناحق نہ کھاؤ، الا یہ کہ بذریعہ تجارت تم میں آپسی رضامندی ہو جائے، اور اپنے آپ کو قتل بھی نہ کرو، اللہ تم پر بے پناہ رحم کرنے والا ہے۔

اور دوسری جگہ ارشاد باری تعالی ہے: "إن تجتنبوا کبائر ما تنھون عنہ نکفر عنکم سیئاتکم و ندخلکم مدخلا کریما". {سورۃ النساء رقم الآیۃ ۳۰} ترجمہ: اگر تم لوگ ان کبیرہ گناہوں سے بچو گے جن سے تمہیں روکا گیا ہے، تو تمہارے چھوٹے گناہوں کو ہم مٹا دیں گے اور تمہیں عزت و تکریم والا مقام عطا کریں گے۔

مذکورہ بالا آیات میں اللہ تعالی نے بنی نوع انسان کو متنبہ کیا ہے کہ وہ ایک دوسرے کا مال باطل طریقہ سے نہ کھائیں، طمع و حرص سے بچیں، حسد و بغض سے کنارہ کشی اختیار کریں اور آپس میں امن و امان کے ساتھ ملکر سفر حیات طے کریں۔ دیگر آیات بھی ملکیت کے لیے عورتوں کی اہلیت اور قابلیت کا اثبات کرتی ہیں، اللہ تعالی کا فرمان ہے: "و اقمن الصلوۃ و آتین الزکاۃ واطعن اللہ ورسولہ". {سورۃ الأحزاب رقم الآیۃ ۳۳} ترجمہ: اور

نماز قائم کرو، اور زکوۃ ادا کرو اور اللہ اور اس کے رسول کی تابعداری کرو۔ اس آیت میں اللہ تعالی عورتوں کو زکاۃ دینے کا حکم دیتا ہے، جو خود میں اس بات کا ثبوت ہے کہ عورتیں حق ملکیت سے لیس ہیں اور اپنے اموال و املاک پر دست تصرف دراز کرنے کا شرعی حق رکھتی ہیں۔ فرمان باری تعالی ہے: "إن المسلمين و المسلمات والمؤمنين والمؤمنات والقانتين والقانتات الصادقين والصادقات والصابرين والصابرات والخاشعين و الخاشعات والمتصدقين والمتصدقات والصائمين والصائمات والحافظين فروجهم والحافظات والذاكرين الله كثيرا والذاكرات أعد الله لهم مغفرة و أجرا عظيما". {سورة الأحزاب رقم الآية ۳۵} ترجمہ: بیشک مسلمان مردوں اور مسلمان عورتوں کے لئے، اور اور مومن مردوں اور مومن عورتوں کے لئے، اور فرمانبردار مردوں اور فرمانبردار عورتوں کے لئے، اور سچے مردوں اور سچی عورتوں کے لئے، اور صبر کرنے والے مردوں اور صبر کرنے والی عورتوں کے لئے، اور عاجزی اختیار کرنے والے مردوں اور عاجزی اختیار کرنے والی عورتوں کے لئے، اور صدقہ کرنے والے مردوں اور صدقہ کرنے والی عورتوں کے لئے، اور روزہ دار مردوں اور روزہ دار عورتوں کے لئے اور اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کرنے والے مردوں اور اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کرنے والی عورتوں کے لئے، اور اللہ کو خوب یاد کرنے والے مردوں اور اللہ کو خوب یاد کرنے والی عورتوں کے لئے اللہ نے مغفرت اور اجر عظیم تیار کر رکھا ہے۔

اس آیت میں اللہ تعالی ان عورتوں کی ستائش کر رہا ہے جو اس کے راستے میں مال خرچ کرتی ہیں۔ علامہ ابن کثیر کہتے ہیں: "صدقات و خیرات غریب و نادار اور معذور لوگوں کو دیئے جاتے ہیں جو نہ اپنی روزی کما سکتے ہیں نہ کوئی ایسا شخص ان کے پاس ہے جو ان کی مالی اعانت کر سکے۔ زائد از ضرورت رقم ان غرباء و فقراء کو بطور مدد و تعاون اور ازراہ ہمدردی و غمگساری دے دینا چاہیے جو اس کی ضرورت محسوس کرتے ہیں"۔ ﴿تفسیر القرآن العظیم لابن کثیر ج ۴ ص ۴۸۸﴾ چنانچہ اگر عورتیں ملکیت کا حق نہیں رکھتیں تو وہ خیرات دینے کی اہلیت سے محروم رہتیں، اور اللہ تعالی بھی خیرات نہ دینے کی وجہ سے ان کی تعریف نہ کرتا۔ اللہ تعالی مزید کہتا ہے: "اے ایمان والو! جو کچھ تم کمائے ہو اس میں سے اللہ کی راہ میں خرچ کرو"۔ ﴿۲-۲۶۷﴾ اس آیت میں اللہ تعالی تمام مسلمانوں کو خواہ مرد ہوں یا عورت اپنی ذاتی آمدنی میں سے اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کا حکم دیتا ہے۔ علامہ ابن کثیر کا کہنا ہے: "خرچ کرنے سے مراد صدقہ و خیرات کرنا ہے"۔ عبد اللہ بن عباس کے نزدیک

اپنے پاکیزہ مال میں سے اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کا مطلب اس دولت سے خیرات کرنا ہے جو انسان کی اپنی ملکیت ہے۔ مجاہد کا بیان ہے: "ان منافع سے خرچ کرنا جو اللہ نے ان کے لیے بذریعہ تجارت حاصل کرنا آسان بنایا ہے"۔ علی اور سعدی کا کہنا ہے: "پاکیزہ چیزوں سے خرچ کرنا ہے جس سے اللہ نے اپنے بندوں کو سرفراز فرمایا ہے، جیسے سونا، چاندی، پھل اور اناج۔ اسلام نے ہر عورت کو اپنی جائداد، دولت اور اراضی کی ملکہ اور متصرف بنایا ہے، اور اسے وراثت میں حقدار ٹھہرایا ہے، حالانکہ زمانہ جاہلیت میں عورتیں ان حقوق سے محروم تھیں۔ اللہ تعالی نے آیت میراث کو نازل فرما کر تقسیم وراثت کے اصول وضوابط کو واضح کیا ہے، چنانچہ ارشاد باری تعالی ہے: "للرجال نصیب مما ترک الوالدان والاقربون وللنساء نصیب مما ترک الوالدان والاقربون مما قل منہ اَو کثر نصیبا مفروضا". {سورۃ النساء رقم الآیۃ ۷} ترجمہ: والدین اور قریبی رشتہ دار جو مال چھوڑ جائیں اس میں مردوں کا حصہ ہوتا ہے، اور والدین اور قریبی رشتہ دار جو مال چھوڑ جائیں اس میں عورتوں کا بھی حصہ ہوتا ہے، چاہے مال تھوڑا ہو یا زیادہ، اور یہ حصے (اللہ کی طرف سے) مقرر کیے گئے ہیں۔

اسی طرح اللہ تعالی نے عورتوں کی مہر کے حقوق کی بھی وضاحت فرمائی ہے: "وآتوا النساء صدقتھن نحلۃ فإن طبن لکم عن شيءمنہ نفسا فکلوہ ھنیئا مریئا". {سورۃ النساء رقم الآیۃ ۴} ترجمہ: اور عورتوں کو ان کی مہر بخوشی دے دو، اگر وہ اپنی خوشی سے اس میں سے کچھ تمہیں دے دیں تو اسے خوشی اور رغبت کے ساتھ کھالو ۔ درحقیقت، بہت سارے قرآنی تعلیمات اور نبوی ارشادات ہیں جو اس بات کو پایہ ثبوت تک پہنچاتے ہیں کہ قانونی حیثیت سے ایک عورت ملکیت کا حق رکھتی ہے، وہ تجارت کرنے کا بھی حق رکھتی ہے، سوداسلف لینے کا بھی حق رکھتی ہے، غلاموں کو آزاد کرنے کا حق بھی رکھتی ہے، کسی کو پناہ دینے کا حق رکھتی ہے، صدقات و خیرات کرنے کا حق رکھتی ہے، مشورہ دینے کا حق رکھتی ہے، کسی کی نیابت کرنے کا حق رکھتی ہے اور کوئی معاہدہ کرنے کا حق رکھتی ہے۔

زوجہ رسول حضرت زینبؓ ضرورت مندوں کی ماں کی حیثیت سے شہرت رکھتی تھیں، کیونکہ وہ سوت کاتتی تھیں، چمڑوں کو دباغت دیتی تھیں، سلائی کرتی تھیں، اپنے تیار کردہ اشیاء کو بازار میں فروخت کرتی تھیں، اور پھر اس کی قیمت کو غرباء، فقراء اور مساکین پر صرف کرتی تھیں ﴿الاصابۃ فی تمییز الصحابۃ لابن حجر عسقلانی ج۴ حرف الزای بتصرف﴾ اور ایک دوسرے واقعہ میں مذکور ہے کہ آپ ﷺ اپنی لخت جگر فاطمہؓ کے پاس

گئے، اور دیکھا کہ سونے کا ایک ہار ان کی گردن میں پڑا ہوا ہے، آپ ﷺ نے فرمایا: "اے فاطمہ! کیا تمہیں اس بات سے خوشی محسوس ہوگی کہ جب لوگ تمہارے بارے میں چہ می گوئیاں کریں کہ دختر رسول فاطمہ کی گردن میں آگ کا ہار ہے؟ پھر آپ تشریف رکھے بغیر روانہ ہوگیے، حضرت فاطمہ نے چین کو نکالا، اسے بیچا، اور بہت سارے غلاموں کو اس پیسے سے آزاد کروادیا، جب یہ خبر دربار نبوت میں پہنچتی ہے تو آواز آتی ہے: "تمام تعریفیں اللہ ہی کے لیے سزاوار ہیں جس نے فاطمہ کو جہنم کی آگ سے نجات دلائی"۔ ﴿سنن نسائی ج ۸ کتاب الزینۃ الکراھیۃ للنساء ص ۱۵۸﴾ اس حدیث سے ہمیں یہ ادراک ہوتا ہے کہ ایک عورت بیچنے، خریدنے، پناہ دینے اور آزاد کرنے کا کامل اختیار رکھتی ہے۔ ابن حزم کہتے ہیں: "ایک عورت بیچنے کا حق رکھتی ہے جو نہی وہ سن بلوغت کو پہنچتی ہے، اس کا اطلاق اس بالغ پر بھی ہوتا ہے جس کے والد بقید حیات ہیں اور اس پر بھی ہوتا ہے جس کے والد ملک عدم کے راہگیر بن چکے ہیں، ایک شادی شدہ عورت بھی اس میں شامل ہے، ایک مطلقہ بھی اور ایک طلاق یافتہ بھی، یہ سب کے سب بیچنے اور خریدنے کا حق رکھتی ہیں ﴿المحلی لابن حزم ج ۱۹ احکام البیوع ص ۵۴ / ۱۵۶۲ مسألۃ﴾ وہ صدقات وخیرات جو شادی شدہ عورت کی جانب سے دیئے جاتے ہیں، یا پھر اس غیر شادی شدہ عورت کی جانب سے جس کے والد باحیات ہیں، یا کسی یتیم لڑکی کی طرف سے، یا جس کے ساتھ معاملات میں فریب کیا گیا ہو اس کی جانب سے، یا کسی بیمار کی جانب سے، یا کسی ایسے شخص کی جانب سے جو بستر مرگ پر دراز ہو، یا پھر کسی غیر شادی شدہ یتیم لڑکی کی طرف سے، ان تمام لوگوں کی جانب پیش کیے گئے صدقات وخیرات کا حکم کسی آزاد شخص کے صدقات وخیرات کی مانند ہے ﴿المحلی لابن حزم ج ۱۹ احکام الھبات ص ۱۶۰ / ۱۶۴۲﴾

خلاصہ کلام یہ ہے کہ ایک عورت خواہ شادی شدہ ہو یا مجرد ملکیت کا حق اور اپنی دولت وثروت اور مال و جائداد میں دست تصرف دراز کرنے کا استحقاق رکھتی ہے۔ اس کی جائداد اس کے شوہر کے زیر اختیار نہیں رہنی چاہیے، کیونکہ عورت ہونے کی وجہ سے ایسی معاشی پابندی کی وہ مکلف نہیں ہے۔ اسی نقطہ نظر کو جمہور علما نے اختیار فرمایا ہے۔ ﴿کتاب الفقہ علی المذاھب الأربعۃ ج ۲ کتاب الحجر باب اذابلغ الصبی غیر رشید ص ۳۵۲﴾

اور اس مسئلہ سے متعلق اختلافات کو دو نقاط میں بیان کیا گیا ہے:

پہلا نقطہ:

کس عمر میں خاتون وارث کو اموال میراث سپرد کیے جائیں؟

اس مسئلہ میں اہل علم اختلاف کے شکار ہیں۔ایک جماعت کا کہنا ہے کہ جب عورت سن بلوغت کو پہنچ جائے اور اس میں علامات شباب کا ظہور ہونے لگے، تو اس کی جائداد اس کے سپرد کر دی جائے، گرچہ وہ شادی نہ کرے۔ایک بالغ عورت کو حق حاصل ہے کہ وہ اپنے پیسے اور دولت میں اپنی صوابدید کے مطابق تصرف کرے۔اس فکر کی نمائندگی عطا، ثوری، ابو حنیفہ، امام شافعی اور ایک قول کے مطابق احمد، ابو ثور، ابن منذر اور ابن قدامہ رحمہم اللہ اجمعین کرتے ہیں﴿المغنی لابن قدامہ ج۴ص۵۱۷﴾

دوسری جماعت کا یہ موقف ہے کہ ایک بالغ عورت اپنی جائداد کو اس وقت تک حاصل نہیں کر سکتی جب تک کہ وہ رشتہ ازدواج سے منسلک نہ ہو جائے اور ایک بچہ کی ماں نہ بن جائے، یا پھر اس کی شادی کی زندگی کا ایک سال نہ گزر جائے۔اس نقطہ نظر کی ترجمانی امام مالک اور ایک روایت کے مطابق احمد، عمر، شریح اور شعبی رحمہم اللہ اجمعین کرتے ہیں۔اپنے موقف کی تائید میں انہوں نے شریح کے ایک قول کو پیش کیا ہے، چنانچہ شریح کا قول ہے:"میں نے حضرت عمر سے عہد کیا کہ میں کسی بھی نوجوان عورت کو عطیہ لینے کی اجازت نہیں دوں گا، جب تک کہ وہ رشتہ ازدواج سے منسلک ہو کر ایک سال نہ گزار لے، یا پھر ایک بچے کو جنم نہ دیدے۔﴿حوالہ سابق﴾ لیکن یہ استدلال کمزور بنیاد پر قائم ہے۔

میں ذاتی طور پر پہلے موقف کی حمایت و تائید کرتی ہوں، کیونکہ اس کے دلائل مضبوط ہیں جنہیں اس مقالہ کے شروع ہی میں ذکر کر دیا گیا ہے۔

دوسرا نقطہ:

کیا ایک عورت اپنے شوہر کی اجازت کے بغیر اپنے مال میں دست تصرف دراز کر سکتی ہے؟

اس مسئلہ میں بھی اہل علم دو خیموں میں منقسم ہیں۔ایک جماعت کہتی ہے کہ عورت ایسا کر سکتی ہے جب کہ وہ صدقات و خیرات دینی چاہے۔اس نقطہ نظر کے حامی معاصر محقق عزت دروزہ بھی ہیں۔

دوسری جماعت کا یہ موقف ہے کہ ایک عورت اپنے شوہر کی اجازت کے بغیر اپنے مال میں دست تصرف دراز نہیں کر سکتی۔اس خیال کی تائید ناصر الدین البانیؒ جیسی ذی علم شخصیت بھی کرتی ہے۔مندرجہ ذیل

مستند روایتیں واضح طور پر اشارہ کرتی ہیں کہ عورتیں اپنے شوہر کی اجازت کے بغیر اپنے مال میں دست تصرف دراز کرنے کا حق رکھتی ہیں:

ا۔ حضرت ابو ہریرہ سے روایت ہے، کہتے ہیں کہ اللہ کے رسول نے فرمایا: "اگر کوئی عورت کوئی چیز بطور صدقہ اپنے شوہر کے مال میں سے اس کی اجازت کے بغیر دیتی ہے تو اس کو نصف اجر ملے گا"۔﴿صحیح بخاری ج۳ کتاب البیوع ص۷﴾ ۲- حضرت عائشہ صدیقہ سے مروی ہے، کہتی ہیں کہ اللہ کے رسول نے فرمایا: "جب عورت اپنے گھر کی خوراک بلا اسراف اللہ کی راہ میں خرچ کرے، تو اسے اس مال کو خرچ کرنے کی وجہ سے اجر ملے گا اور اس کے شوہر کو مال کمانے کی وجہ سے اجر ملے گا، اور خزانچی کو بھی اسی تناسب میں ثواب ملے گا، چنانچہ ان میں سے کسی کا بھی ثواب حاصل کرنا دوسرے کے ثواب کی تخفیف کا باعث نہیں بنے گا"۔﴿حوالہ سابق﴾ چنانچہ آپ ﷺ نے اس بات کی وضاحت کر دی ہے کہ اسراف و تبذیر کے بغیر کس طرح راہ خداوندی میں مال کو صرف کیا جائے گا۔

۳- دوسری حدیث اسما بنت ابی بکر الصدیقؓ سے مروی ہے، ان کا بیان ہے کہ وہ نبی پاک ﷺ کے پاس تشریف لائیں اور گویا ہوئیں: "اے اللہ کے رسول! میرے پاس کچھ بھی نہیں ہے بجز اس کے جو زبیر مجھے دیئے ہیں، کیا زبیر کے دیئے ہوئے مال میں سے خرچ کرنا میرے لیے ازروئے شرع گناہ ہے؟ اس پر آپ نے جواب دیا: " آپ اپنی حیثیت کے بقدر خرچ کرو؛ اور تنگی کی روش اختیار نہ کرو، کیونکہ اللہ بھی تنگی کی روش اپنائے گا"۔﴿صحیح مسلم بشرح نووی کتاب الزکاۃ ج۳ ص۶۸﴾ آپ ﷺ بلکل واضح اور واشگاف انداز میں حضرت اسما کو اپنے شوہر کے مال سے خرچ کرنے کی اجازت دیتے ہیں، اس سے یہ بھی ادراک ہوتا ہے کہ اسما کے پاس اگر پیسہ ہوتا تو وہ خود خرچ کرتیں نبی پاک ﷺ کے پاس مسئلہ دریافت کرنے کی غرض سے آنے سے قبل، اس سے یہ بھی اشارہ ملتا ہے کہ حضرت اسما کا اس بات پر اعتقاد تھا کہ وہ اپنے مال کو خرچ کرنے میں آزاد ہیں اور اس سلسلہ میں کسی سے اجازت لینا ناگزیر نہیں ہے، اور نبی کریم ﷺ نے بھی اس تصور کا ابطال نہیں کیا، نہ اس پر کوئی رائے زنی فرمائی نہ کوئی حرف اعتراض پیش کیا۔ بلکہ اس کے برعکس آپ نے حضرت اسما کو اپنے شوہر کے مال سے ان کی اجازت کے بغیر خرچ کرنے کی اجازت دی۔

مذکورہ بالا پیش کردہ دلائل وبراہین کی بنیاد پر پہلا نقطہ نظر ہی وسیع پیمانے پر قابل تسلیم ہے، لہذا بطور خلاصہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ مذہب اسلام میں عورتیں کلی طور پر ملکیت کا حق رکھتی ہیں، اور ساتھ ہی اپنے شوہر کی اجازت کے بغیر اپنے مال میں دست تصرف دراز کرنے کا انہیں اختیار حاصل ہے، لیکن یہ قاعدہ فقط اسی وقت بروئے کار لایا جاسکتا ہے جبکہ عورت سن بلوغت اور شعور وادراک کی عمر کو پہنچ جائے، اور اس کے سراپا پر شباب کی علامات عیاں ہونے لگے۔ بہر کیف، رشتہ میں استحکام، معاشرت میں نرمی اور طرز زندگی میں خوشگواری پیدا کرنے کے لیے اور اپنے شوہر سے اپنے روابط کو خوش اسلوبی کے ساتھ برقرار رکھنے کے لیے مال خرچ کرنے کے دوران اجازت بھی لے سکتی ہے۔ اسلام عورتوں کو ریاونمود کی جذبات اور اسراف وتبذیر کے رویہ سے پاک ہو کر اللہ کی راہ میں مال خرچ کرنے کی اجازت دیتا ہے، اور شوہر کی سابقہ اجازت کے بغیر اپنے مال سے خرچ کرنے کا حق فراہم کرتا ہے۔ نان ونفقہ کا حق:

اسلام نے عورتوں کو خصوصی سماجی تحفظ فراہم کیا ہے بایں طور کہ عورتوں کے لیے نان ونفقہ اور سکنی کی ذمہ داریاں ان کے گارجین اور سرپرست صاحبان پر تادم حیات کے لیے ڈال دیا ہے۔ عورتوں کی ضروریات کی تکمیل یا تو باپ کرے گا، یا شوہر کرے گا، یا پھر لڑکا کرے گا۔ اسی طرح اسلام نے عورتوں کو کسب معاش اور حصول رزق کی ذمہ داری سے بھی آزاد کیا ہے اور ساتھ ہی ان کے سماجی اور معاشی حقوق کو خاطر خواہ تحفظ فراہم کیا ہے۔ ایک شادی شدہ عورت اپنی جائداد کی خود مالک ہوگی اور معاشی طور پر اپنے شوہر سے آزاد ہوگی جو اس کی ضروی اخراجات اور گھریلو اشیاء کی فراہمی کا مکلف اور ذمہ دار ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلام نے عورتو کو بے پناہ محبت اور بے نظیر شفقت ومحبت سے نوازا ہے ان کی روزی روٹی اور نان ونفقہ کی ذمہ داریاں ان کے مرد رشتہ داروں پر ڈال کر۔

خور ونوش کی اشیا غذا، کپڑا، اور مناسب رہائش پر مشتمل ہیں، جب ایک بچی کی ولادت عمل میں آتی ہے تو اس کی روزی روٹی کی ذمہ داری اس کے والد پر عائد ہوتی ہے، لیکن جب وہ رشتہ ازدواج سے منسلک ہوتی ہے تو یہ ذمہ داری باپ سے منتقل ہو کر شوہر کی طرف چلی جاتی ہے، جب اس کا شوہر انتقال کرتا ہے تو یہ ذمہ داری بیٹے پر عائد ہوتی ہے اور جب اس عورت کے پاس کوئی نہ ہو تو پھر یہ ذمہ داری مرد رشتہ داروں پر عائد ہوتی ہے۔ قرآن کریم اور صحیح سنت سے بھی یہ واضح ہے کہ مرد حضرات کو خواتین کی ذمہ داریاں لینی چاہیے،

اور عورت اور اس کے بچے کی روزی روٹی، خوراک اور نان ونفقہ وسکنی کا ذکر کتاب وسنت میں عام طور سے ایک ہی ساتھ کیا گیا ہے، اور دونوں کو الگ الگ ذکر کیا جانا یا ایک دوسرے سے علیحدہ کرنا ایک مشکل ترین امر ہے، چنانچہ میں کچھ دلائل وبراہین نقل کروں گی جن سے اس بات کا اثبات ہو گا کہ ایک نوجوان عورت، چھوٹے بچوں اور بیوی کی خوراک کی ذمہ داری حسب ترتیب باپ اور شوہر پر عائد ہو گی۔ ارشاد باری تعالی ہے:"لینفق ذو سعة من سعتہ ومن قدر علیہ رزقہ فلینفق مما آتاہ اللہ ".{ سورۃ الطلاق رقم الآیۃ ۷}ترجمہ: صاحب استطاعت شخص کو اپنی استطاعت کے مطابق اور غریب شخص کو اللہ نے جو کچھ دیا ہے اس میں سے خرچ کرنا چاہیے۔

یہ آیت والد کو اس بات کا ذمہ دار بناتی ہے کہ وہ اپنے بچوں کی خوراک کا انتظام کرے خواہ وہ لڑکا ہوں یا لڑکی، اور ہر باپ کو اپنی حیثیت واستطاعت کے مطابق اپنے بچوں کے تئیں اپنا فریضہ انجام دینا چاہیے۔ علامہ ابن کثیر کہتے ہیں:"باپ یا سرپرست کو اپنے بچوں پر خرچ کرنا چاہیے، غریب شخص کو اپنی استطاعت کے مطابق اور جو کچھ اللہ نے اس کو دیا ہے اسی کے تناسب سے خرچ کرنا چاہیے، کیونکہ اللہ تعالی اپنے بندوں کو اس کی حیثیت سے زیادہ کا مکلف نہیں بناتا ہے۔ فرمان باری تعالی ہے:"لا یکلف اللہ نفسا الا وسعھا". یعنی اللہ تعالی کسی کو اس کی وسعت کے بقدر ہی کسی شے کا مکلف بناتا ہے۔ جبکہ دوسری جگہ فرماتا ہے:"ولا تؤتوا السفھاء أموالکم ألتي جعل اللہ لکم قیاما وارزقوھم فیھا واکسوھم ". یعنی اپنا مال کم عقلوں کے حوالے نہ کرو، جسے اللہ نے تمہارا ذریعہ معاش بنایا ہے، اور اس میں سے ان کے کھانے اور پہننے کا انتظام کرتے رہو، اور ان سے نرم لہجہ میں بات کرتے رہو۔ ﴿تفسیر القرآن العظیم لابن کثیر ج ۴ ص ۳۸۳﴾

علامہ ابن کثیر کا کہنا ہے کہ اللہ تعالی نے ہمیں ان لوگوں کو اموال سپرد کرنے سے منع فرمایا ہے جو ذہنی طور پر معذور اور عقلی طور پر مفلوج ہیں، ایسے لوگوں کو دولت وتجارت پر قبضہ فراہم کرنا غیر مناسب ہے، چنانچہ بچے، ذہنی طور پر بیمار اور کمزور لوگ والدین یا رشتہ داروں کی سرپرستی کے محتاج ہوتے ہیں۔ آیت میں اس بات کا بھی اشارہ ہے کہ اسلام خاندان کی منظم نگہداشت کا حکم دیتا ہے اور ساتھ ہی ان لوگوں کو کھلانے پلانے، مکمل تحفظ دینے، کپڑا فراہم کرنے، بہتر مشورہ سے نوازنے اور دیگر ضروریات کی تکمیل کی تلقین کرتا

ہے جو کسی شخص کی زیر سرپرستی ہیں۔﴿تفسیر القرآن العظیم لابن کثیر ج ا ص ۴۵۲﴾ مندرجہ ذیل آیت باپ اور شوہر کی خاندان اور پریوار کے تئیں ذمہ داریوں کو واضح طور پر بیان کرتی ہے:

والوالدات یرضعن اولادھن حولین کاملین لمن أراد أن یتم الرضاعۃ وعلی المولود لہ رزقھن وکسوتھن بالمعروف".{سورۃ البقرۃ رقم الآیۃ ۲۳۳} ترجمہ: اور مائیں اپنے بچوں کو پورے دو سال دودھ پلائیں، یہ ان کے لیے ہے جو مدت رضاعت پوری کرنی چاہیں، اور باپ پر دودھ پلانے والی عورتوں کا کھانا کپڑا عرف عام کے مطابق واجب ہے۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ شوہر کو اپنے بچوں کو دودھ پلانے والی ماں کا خرچہ برداشت کرنا چاہیے، اسے اس عورت کو اپنے ملک کے معیار کے مطابق کھانا اور کپڑا فراہم کرنا چاہیے، اسے ایسا کرنے کے دوران نہ تو بہت زیادہ اسراف وفضول خرچی سے کام لینا چاہیے اور نہ بہت زیادہ بخیلی، کنجوسی اور کفایت شعاری کا مظاہرہ کرنا چاہیے، بلکہ اسے اپنے ذرائع آمدنی کے حساب سے خرچ کرنا چاہیے خواہ امیر ہو یا غریب۔ امام ضحاک کا کہنا ہے:" اگر کوئی شخص اپنی بیوی کو طلاق دے دیتا ہے اور طلاق یافتہ ہونے کے باوجود بھی اگر وہ اس کے بچہ کو دودھ پلاتی رہتی ہے، تو شوہر کو بھی اسے خوشگوار طریقہ سے نان ونفقہ اور کپڑا دینا چاہیے "۔﴿تفسیر القرآن العظیم لابن کثیر ج ا ص ۳۸۳﴾ یہ آیت اشارہ کرتی ہے کہ ایک طلاق یافتہ عورت جب تک بچہ کو دودھ پلاتی رہے گی تب تک اس کا نان ونفقہ اور کپڑے کا انتظام کیا جانا چاہیے۔

ایک مطلقہ ماں کو نان ونفقہ اور کپڑا اور بچوں کو سامان غذا فراہم کرنے کے ساتھ ساتھ اس ماں کو جائے رہائش بھی فراہم کرنا چاہیے، جیسا کہ علمانے مندرجہ ذیل آیت سے یہ مسئلہ مستنبط کیا ہے۔ اللہ تعالی کا فرمان ہے:" اسکنوھن من حیث سکنتم من وجدکم ولا تضاروھن لتضیقوا علیھن وإن کن اولات حمل فانفقوا علیھن حتی یضعن حملھن فإن ارضعن لکم فآتوھن اجورھن واتمروا بینکم بمعروف وإن تعاسرتم فسترضع لہ أخری".{سورۃ الطلاق رقم الآیۃ ٦} ترجمہ: مسلمانو! تم مطلقہ عورتوں کو وہیں ٹھہراؤ جہاں تم اپنی استطاعت کے مطابق خود ٹھہرتے ہو، اور تم انہیں تکلیف نہ دو تاکہ ان کا جینا دوبھر کر دو، اور اگر وہ حاملہ ہوں تو ان کا خرچ دو یہاں تک کہ وہ بچے جن دیں، پس اگر وہ تمہارے بچوں کو دودھ پلائیں تو انہیں ان کی اجرت دو، اور دودھ پلانے کے مسئلہ میں

نیک نیتی کے ساتھ آپس میں مشورہ کر لو، اور اگر معاملہ طے کرنے میں تمہارے درمیان مشکل پیش آئے، تو اس کے بچہ کو کوئی دوسری عورت دودھ پلائے گی۔

یہ آیت وضاحت کرتی ہے کہ باپ کو اپنی طلاق یافتہ بیوی کو سامان غذا اور جائے سکونت فراہم کرتے رہنا چاہیے جب تک بیوی بچے کو دودھ پلانے سے متعلق ذمہ داری کو انجام دے رہی ہے۔ علامہ ابن کثیر کہتے ہیں: "اللہ رب العالمین مومن مردوں کو حالت طلاق میں بھی اپنی بیویوں کو جائے رہایش فراہم کرنے کا حکم دیتا ہے جبکہ وہ حالت حیض میں ہوں، "اسکنوھن" کا مطلب ہے کہ انہیں اپنے گھروں میں ٹھہراؤ"۔﴿تفسیر القرآن العظیم لابن کثیر ج ۴ص ۳۸۲﴾ اللہ تعالی نے اس بات کی بھی وضاحت کر دی ہے کہ مرد عورتوں پر کیوں فضیلت اور برتری رکھتے ہیں جن میں سے ایک وجہ مردوں کا عورتوں پر انفاق کرنا ہے، اللہ تعالی کا فرمان ہے: "الرجال قوامون علی النساء بما فضل اللہ بعضھم علی بعض وبما أنفقوا من أموالھم". {سورۃ النساء رقم الآیۃ ۳۴} ترجمہ: مرد عورتوں کے نگہبان اور محافظ ہیں، کیونکہ اللہ نے ان میں سے ایک کو دوسرے پر فضیلت بخشی ہے، اور اس لیے بھی کہ مرد اپنے مال میں سے عورتوں پر خرچ کرتے ہیں۔

اس آیت میں مہر، نان ونفقہ اور ان اخراجات کی جانب اشارہ ہے جسے اللہ نے مردوں پر عورتوں کے حق میں فرض کیا ہے اور اپنی کتاب کے ذریعے اس پر مہر تصدیق ثبت کر دی ہے اور اس کے رسول کا فرمان بھی بطور تائید موجود ہے۔﴿تفسیر القرآن العظیم لابن کثیر ج ا ص ۴۹۱﴾ اس مسئلہ کی تائید میں متعدد احادیث موجود ہیں، ہم مشتے نمونہ از خروارے کے طور پر حضرت جابرؓ کی روایت کردہ حدیث کو پیش کرتے ہیں، حدیث جابر یہ ہے: "یہ تمہاری ذمہ داری ہے کہ تم عورتوں کو سامان رسد فراہم کرو اور ان کے کپڑے کا بندوبست کرو وہ بھی حسن سلوک اور عمدہ طریقہ کے ساتھ"۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ عورتیں حصول رزق کی ذمہ داری سے آزاد اور مستثنی ہیں، کیونکہ انہیں روزی بہم پہنچانا مرد کی ذمہ داری ہے۔ علما کی اکثریت کا اس بات پر اتفاق ہے کہ اپنی بیوی کا خرچ برداشت کرنا اور اپنے بچوں کی ماں کے اخراجات کا متحمل ہونا مرد کی ذمہ داری اور فریضہ ہے۔ گرچہ علمانے اس کے لیے کسی مقدار کو متعین نہیں کیا ہے، تاہم ان کا اس بات پر اتفاق ہے کہ رقم اتنی مقدار میں ہونی چاہیے جس سے خرچ پورا ہو سکے اور ضروریات کی تکمیل بھی ممکن ہو۔ "پہلے ان سے شروع کرو جو تمہارے اوپر منحصر ہیں"، اس کا مطلب یہ ہے کہ تمہیں ان لوگوں سے آغاز کرنا چاہیے جن کے اخراجات

تمہارے ذمہ ہیں، انہیں کچھ دینے کا مطلب یہ ہے کہ کسی پریوار کو کچھ دیکر یہ یقین حاصل کر لیا جائے کہ اس کے پاس بقدر ضرورت خوراک اور کپڑا موجود ہے، یہ حدیث شوہر اور باپ کو تاکیدی حکم دیتی ہے کہ دیگر مذہبی ذمہ داریوں کی بنسبت اسے ترجیحی حیثیت فراہم کی جائے۔﴿حوالہ سابق﴾

آپ ﷺ نے فرمایا: "خوف خدا کھاؤ اور اپنی بیویوں سے حسن سلوک کا مظاہرہ کرو، اللہ تعالی کی جانب سے وہ تمہارے سپرد کی گئی ہیں، اور اللہ کے کلمہ کے ذریعے وہ تمہارے لیے حلال بنائی گئی ہیں، اور ان کو روزی اور کپڑا مناسب انداز میں فراہم کرنا تمہاری ذمہ داری ہے"۔﴿صحیح مسلم بشرح نووی کتاب الحج ج۳ص ۳۴۴﴾

ان مقدس کلمات کے توسط سے آپ ﷺ نے روٹی کپڑا اور مکان سے متعلق عورتوں کے حقوق کو ہمیشہ کے لیے تحفظ فراہم کر دیا ہے۔

جب حکیم بن معاویہ قشیری کے والد محترم نے آپ ﷺ سے عورت کے اپنے شوہر پر حق کے متعلق سوال کیا، تو آپ نے جواب دیا: "جب تم کھاؤ تو اسے بھی کھلاؤ، جب تم پہنو تو اسے بھی پہناؤ؛ اس کے چہرے پر مت مارو؛ اسے گالی مت دو اور اسے تنہا مت چھوڑو الا یہ کہ وہ گھر میں ہو"۔﴿عون المعبود فی شرح سنن ابی داؤد ج۶ کتاب النکاح ص۱۸۰﴾

حضرت عائشہ سے مروی ہے، کہتی ہیں کہ ہند بنت عتبہ نے کہا: "اے اللہ کے رسول! ابوسفیان بخالت کے شکار ہیں اور مجھے اتنا نہیں دیتے جس سے میری اور میرے بچوں کی ضرورت کی تکمیل ہو سکے، کیا میں ان کی اطلاع کے بغیر ان کے مال سے کچھ لے سکتی ہوں؟ آپ نے فرمایا: "جو آپ کے اور آپ کے بچوں کے لیے کافی ہے اسے لے لیں، لیکن رقم مناسب اور متوازن ہونی چاہیے"۔﴿فتح الباری بشرح صحیح البخاری ج ۹ کتاب النفقات ص۵۰۷﴾

مذکورہ بالا احادیث سے یہ انکشاف ہوتا ہے کہ شوہر کو اپنے پریوار اور بچوں پر خرچ کرنا چاہیے، لیکن حدیث خرچ کی مقدار کو متعین نہیں کرتی ہے۔ اگر کوئی شوہر اپنی بیوی کی ذمہ داری کو نہیں ادا کرتا ہے، تو بیوی

کے لیے جائز ہے کہ اپنے شوہر کے مال سے اس کی اطلاع کے بغیر حسب ضرورت لے سکے، جس سے اس کی اور اس کے بچوں کی ضروریات کی تکمیل ہو سکے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ خالق کائنات نے مرد اور عورت کو مختلف ذمہ داریوں کے ساتھ پیدا فرمایا ہے، عورت کی ذمہ داری بچہ پیدا کرنا، بچوں کی پرورش و پرداخت کرنا، انہیں تعلیم وتربیت سے آراستہ و پیراستہ کرنا اور گھریلو امور کو انجام دینا ہے، ساتھ ہی وہ اپنے شوہر کی قانونی رفیق سفر اور شرعی شریک حیات بھی ہے ۔انصاف خداوندی نے یہ فیصلہ صادر کیا ہے کہ مرد کو اپنے پریوار کے تئیں معاشی طور پر ذمہ دار ہونا چاہیے تاکہ اس کی بیوی کو روزی کمانے کی مشقت نہ اٹھانی پڑے اور ساتھ ہی بحیثیت ماں اور بیوی گھریلو ذمہ داری کی انجام دہی میں سہولت سے لطف اندوز ہو سکے۔ مرد کو کھانے، پینے، اوڑھنے، سونے، بیٹھنے اور پہننے سے متعلق عورت کی جو ضرورت ہے اس کی تکمیل میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کرنا چاہیے، اور ان ضروریات کی تکمیل میں احسن انداز اور خوش کن طریقہ کار اختیار کرنا چاہیے۔ یہ شوہر کی قانونی ذمہ داری ہے کہ وہ بیوی کی ہر جائز حاجت کی تکمیل کی کوشش کرے، بصورت دیگر عورت کو شریعت اختیار دیتی ہے کہ وہ اپنے شوہر سے گلو خلاصی حاصل کرلے۔﴿المغنی لابن قدامہ ج ۹ کتاب النفقات ص ۲۴۳﴾ حق مہر:

یہ عورتوں کا معاشی حق ہے، یہ ایک تحفہ ہے جو دلہن کو دلہا کی طرف سے پیش کیا جاتا ہے شادی باسعید کے موقع سے، زمانہ جاہلیت میں یہ حق مختلف طریقے سے عورتوں سے سلب کرلیا گیا تھا، باپ یا دیگر سرپرست حضرات شادی کو ایک تجارت کی شکل میں برتتے تھے، جس میں عورت کو خوردہ سامان تجارت کی مانند بیچا جاتا تھا، زمانہ جاہلیت میں مرد عورتوں کو جس سے چاہتے تھے فروخت کردیتے تھے اور حسب مرضی قیمت وصول کر لیتے تھے، ایک متبادل طریقہ نکاح شغار کا بھی رائج تھا، یہ کچھ اس قسم کا نکاح تھا جس میں وہ بیٹیوں اور بہنوں کا بغیر مہر کے تبادلہ کرتے تھے، کیونکہ ہر عورت ایک دوسرے کا مہر تسلیم کی جاتی تھی، یہ نکاح درحقیقت دو لوگوں کے بیچ تجارتی معاہدہ کی مانند تھا جہاں مرد فائدہ میں اور عورت خسارہ میں ہوتی تھی، لیکن جب اسلام آیا تو غیر مشروط طور پر اس نکاح کو ممنوع قرار دے دیا۔

اسلام نے دو لوگوں کی شادی کے پس پردہ ایک بلند مقصد اور ارفع منصوبہ مخفی رکھا ہے، اسلام نے مہر کو عورتوں کا بلاشرکت غیرے ایک قانونی اور واجبی حق بتلایا ہے، یہ ایک قانونی اور معاشی حق ہے جسے کوئی بھی

ذی شعور شخص نظر انداز نہیں کر سکتا، اللہ تعالی کا فرمان ہے:" وآتوا النساء صدقاتھن نحلۃ". {سورۃ النساء رقم الآیۃ ۴} یعنی عورتوں کو ان کا حق مہر بخوشی دے دو۔

ان کلمات کے ذریعے اللہ رب العالمین نے مہر کو مردوں پر لازم قرار دیا ہے اور انہیں حکم دیا ہے کہ نئی بیوی سے ملاقات کے وقت یہ حق مہر بطریق احسن ادا کریں۔ قابل ذکر بات یہ ہے کہ ایک بار خلیفہ ثانی حضرت عمر نے لوگوں کو حکم دیا تھا کہ مہر کے معاملے میں حد سے تجاوز نہ کریں، بلکہ مہر کی قابل برداشت مقدار متعین کریں، لیکن بعد میں حضرت عمر نے اپنے قول سے رجوع کر لیا تھا ﴿تفسیر القرآن العظیم لابن کثیر ج اص ۴۶۶﴾ لیکن آج یہ لڑکی کے والد اور سرپرست کا مزاج بن گیا ہے کہ وہ لڑکی کا مہر لیکر اس کے سامان زیبایش اور متاع آرایش پہ صرف کر دیتے ہیں، یا پھر گھریلو اشیا پر یا پھر نئے فرنیچر پر۔ اسلامی قانون کے مطابق یہ بات درست نہیں ہے کیونکہ اس طرح کے خرچ کا ذمہ دار شوہر ہے اور مہر فقط عورت کی ملکیت ہے اور وہ محض اسی کے پاس رہنا چاہیے۔ مہر ایک شرعی اور قانونی حق ہے جسے اللہ نے عورتوں کو فراہم کیا ہے، چنانچہ اس سلسلہ میں فرمان باری تعالی ہے:" فانکحوھن باذن اھلھن وآتوھن اجورھن بالمعروف". {سورۃ النساء رقم الآیۃ ۲۵} ترجمہ: ان کے گھر والوں کی اجازت سے ان سے شادی کرو اور ان کے مہر کو احسن انداز میں انہیں دے دو ۔

اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ غلام عورتوں کو ان کا مہر خوش دلی، انصاف اور آزاد عورتوں کے ساتھ امتیاز کیے بغیر دے دینا چاہیے۔ اہل کتاب کی عورتیں بھی حق مہر رکھتی ہیں اگر ان سے کوئی مسلمان شادی کرنا چاہے ۔ فرمان باری تعالی ہے:" والمحصنات من المؤمنات والمحصنات من الذین اُوتوا الکتاب من قبلکم اِذا آتیتموھن اُجورھن ". { سورۃ المائدۃ رقم الآیۃ:۵} ترجمہ: اور مومن پاک دامن عورتیں اور ان کی پاک دامن عورتیں جنہیں تم سے پہلے کتاب دی گئی (حلال کر دی گئی ہیں) بشرطیکہ تم عقد زواج کی نیت سے ان کا مہر ادا کر چکے ہو۔

اس آیت میں اللہ تعالی بیان کرتا ہے کہ مسلمانوں کی آزاد، پاکباز اور نیک طینت عورتوں سے شادی کرنا جائز ہے اور اس کا ذکر مندرذیل آیت کی تمہید کے طور پر ہوا ہے، " والمحصنات من الذین اُوتوا الکتاب من قبلکم "، یعنی ان لوگوں کی پاک طینت اور نیک سیرت عورتوں سے جو تم سے قبل کتاب دیے گئے ہیں

۔چونکہ وہ پاک دامن اور بااخلاق ہیں اور تمام تر آلائش اور گندگی سے محفوظ ہیں، اس لیے انہیں بخوشی اور خوش دلی کے ساتھ ان کا مہر دے دینا چاہیے۔﴿تفسیر القرآن العظیم لابن کثیر ج ۲ ص ۲۰﴾ یہ شوہر کا مذہبی فریضہ ہے کہ اپنی بیوی کو شادی کے وقت متعین کئے گئے مہر کو ادا کرے، اگر شوہر بعد میں چل کر مہر دینے سے انکار کرتا ہے تو عورتوں اس کے خلاف فرد جرم عائد کرسکتی ہے، یا پھر اس کی مرضی کے خلاف اس مہر کو لے سکتی ہے ۔یہ ایک حق ہے جسے شوہر کو بہر صورت ادا کرنا چاہیے، ہاں اگر بیوی اسے ایک مناسب موقع فراہم کرتی ہے تاکہ بآسانی مہر کی متعین رقم جمع کرسکے، یا پھر اس کی معاشی پوزیشن اور اقتصادی بحران کے پیش نظر حق مہر کو معاف کردیتی ہے، یا پھر ازراہ ہمدردی وبغرض خیر خواہی شوہر کو مہر نہ دینے کی اجازت فراہم کردیتی ہے تو اس میں کوئی حرج کی بات نہیں ہے۔﴿حقوق الزوجین لأبي الأعلی المودودي تعریب احمد إدریس ص ۲۶﴾ اللہ تعالی کا فرمان ذیشان ہے:"ولاجناح علیکم فیما تراضیتم بہ من بعد الفریضۃ إن اللہ کان علیما حکیما".{سورۃ النساء رقم الآیۃ: ۲۴} ترجمہ: اور مہر مقرر ہو جانے کے بعد، اگر تم آپس میں کسی مبلغ کے گھٹانے بڑھانے پر اتفاق کرلیتے ہو تو کوئی حرج کی بات نہیں ہے، بے شک اللہ بڑا علم والا، بڑی حکمتوں والا ہے۔اس آیت کا ماحصل اور خلاصہ یہ ہے کہ مہر کی رقم متعین ہو جانے کے بعد اگر عورت بغرض تخفیف کچھ مال مہر کم کردیتی ہے، یا معاف کردیتی ہے تو میاں بیوی دونوں میں سے کوئی بھی مجرم اور گناہ گار نہیں ہوگا۔﴿تفسیر القرآن العظیم لابن کثیر ج ا ص ۴۵۷﴾ اہل علم بھی اس بات پر متفق ہیں کہ مہر کی کوئی متعین مقدار نہیں ہے، نہ اس کی کوئی مخصوص قیمت ہے، بلکہ اس سلسلہ میں فرمان باری تعالی ہے:"وإن أردتم إستبدال زوج مکان زوج وآتیتم احداھن قنطارا فلا تأخذوا منہ شیئا اتاخذونہ بھتانا واثما مبینا".{سورۃ النساء رقم الآیۃ: ۲۰} ترجمہ: اور اگر تم ایک بیوی کے بدلے دوسری بیوی کرنا چاہو، اور ان میں سے ایک کو مال کثیر دیا تھا، تو اس میں کچھ واپس نہ لو، کیا تم وہ مال اس پر بہتان باندھ کر اور صریح گناہ کرکے لینا چاہتے ہو۔

اس سلسلہ میں علامہ ابن کثیر رقم طراز ہیں:" یہ آیت اس بات کا اشارہ کرتی ہے کہ بوقت شادی مہر کی ایک قلیل مقدار بھی متعین کی جاسکتی ہے۔ سہل بن سعد کا بیان ہے کہ ایک عورت رسول اللہ ﷺ کے پاس آئی اور بولی:"اے اللہ کے رسول! میں آپ کے پاس اس لیے آئی ہوں تاکہ آپ کے ساتھ ازدواجی رشتہ قائم کروں"، آپ ﷺ اس کی طرف نظر التفات اٹھائے اور اسے بغور دیکھنے لگے، اپنی نگاہیں اس پر مرکوز

کر دی، اور پھر اپنا سر خم کر لیا، جب اس عورت نے دیکھا کہ آپ نے کوئی جواب نہ دیا تو اپنی جگہ پر بیٹھ گئی، اصحاب رسول میں سے کوئی کھڑا ہوا اور بولا: "اے اللہ کے رسول! اگر آپ اس سے شادی کرنے کے خواہشمند نہیں ہیں تو پھر میری کرا دیجیے"، آپ نے پوچھا: "کیا تمہارے پاس بطور مہر کچھ دینے کی چیز ہے؟" اس شخص نے جواب دیا: "نہیں، اے اللہ کے رسول!" آپ نے فرمایا: "اپنے گھر جاؤ اور کچھ دینے کے لیے تلاش کرو"، چنانچہ وہ شخص گیا اور یہ کہتے ہوئے واپس لوٹا: "نہیں، اے اللہ کے رسول! مجھے گھر میں کچھ بھی نہیں ملا"، آپ نے کہا: "دوبارہ جاؤ اور کچھ ڈھونڈھو گرچہ ایک چھوٹی سی انگوٹھی ہی سہی"۔ وہ گیا اور یہ کہتے ہوئے واپس لوٹا: "اللہ کی قسم، اے اللہ کے رسول! مجھے کچھ بھی نہیں ملا حتی کہ ایک چھوٹی سی انگوٹھی بھی نہ ملی، لیکن یہ میری ازار ہے"، اس شخص کے پاس اوپر پہننے کو کچھ بھی نہ تھا، اس نے مزید کہا: "میں اس کا نصف حصہ اسے دے دوں گا"، اللہ کے رسول نے فرمایا: "تمہاری ازار سے اسے کیا فائدہ ملے گا؟، اگر تم اسے استعمال کروگے تو اس کے جسم پر کچھ نہ بچے گا اور اگر وہ پہنے گی تو پھر تیرے پاس کچھ نہ بچے گا"۔ چنانچہ وہ شخص کافی دیر تک بیٹھا رہا، پھر چلنے کے لیے کھڑا ہوا، جب آپ ﷺ نے اسے رخت سفر باندھتے ہوئے دیکھا تو لوگوں کو حکم دیا کہ اسے بلایا جائے۔ وہ آیا، آپ نے اس سے پوچھا: "تمہیں قرآن کی کتنی معلومات ہیں؟" اس شخص نے جواب دیا: "مجھے فلاں اور فلاں آیتیں یاد ہیں"، اور کچھ سورتوں کے اس نے نام بھی بتلائے۔ آپ نے پوچھا: "کیا تم انہیں زبانی یاد کر اسکتے ہو؟"، اس نے کہا کہ ہاں۔ آپ نے کہا، "جاؤ! میں اسے تمہاری زوجیت میں دیتا ہوں، جو قرآنی آیات تم کو یاد ہیں ان کو بطور مہر مان کر"۔ ﴿فتح الباری بشرح صحیح البخاری ج ۹ کتاب النکاح ص ۱۸۰﴾

آپ ﷺ نے کسی بھی نکاح کی بغیر مہر کے اجازت نہیں دی، بے شک علم نہایت ہی اہم اور بیش قیمت ہے بنسبت پیسہ کے، اور اپنی بیوی کو تعلیم دیکر ایک شوہر مہر کی اس رقم کی تلافی کر لے گا جسے اسے بطور مہر دینا پڑتا، اور جس رقم کو اس کی بیوی کو ادا کرنا پڑتا اگر کسی شخص کے پاس ان معلومات کو حاصل کرنے جاتی۔

چنانچہ اس سے اندازہ ہوا کہ اسلام میں مہر کی کوئی متعین مقدار نہیں ہے، ہمیں حدیث رسول سے یہ پتہ چلتا ہے کہ صحابہ کرام حسب حیثیت مہر دیا کرتے تھے، حضرت انس سے روایت ہے کہ عبد الرحمن بن عوف نے کھجور کی گٹھلی کے بقدر سونا دیکر اپنا نکاح کیا ﴿حوالہ سابق﴾ حالانکہ آپ ﷺ کا فرمان ہے: "جب تم شادی کرو، تو مہر دو گرچہ ایک لوہے کی انگوٹھی ہی سہی" ﴿حوالہ سابق ص ۲۱۶﴾ عقد نکاح کے جواز کے لیے رب

حکیم نے مہر کو لازمی شرط قرار دیا ہے، اس کی بنیادی وجہ یہی ہے کہ شوہر کو اپنی ذمہ داری کا احساس ہو جائے، اور بیوی کے اخراجات سے متعلق جو ذمہ داریاں اس پر عائد ہو رہی ہیں ان کی انجام دہی میں مخلصانہ کوشش کرے؛ بیوی سے متعلق اس کی ذمہ داری یہ ہے کہ اسے کھانا کھلائے، پانی پلائے، روزی کا سامان فراہم کرے، روٹی کا بندوبست کرے، بستر کا انتظام کرے، اور کپڑا پہنانے کا اہتمام کرے، اس کے بچوں کی تعلیم و تربیت اور نشو و نما پر خصوصی توجہ دے، غرضیکہ عورت اور اس کے بچوں سے وابستہ جتنے بھی ضروریات ہیں ان کی تکمیل میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کرے۔ یہ مہر اس حقیقت کی علامت اور صداقت کی پہچان ہے کہ بیوی اپنے شوہر کی خصوصی نگرانی، دیکھ ریکھ، حفاظت و صیانت اور مدد و اعانت کی حقدار ہو گی، اور اس حقیقت کا آئینہ دار و غماز بھی کہ شوہر اپنی ذمہ داری کو انجام دے گا، بیوی کی مدد کرے گا اور تادم حیات اس کی نصرت و حمایت کا پابند عہد رہے گا۔ مہر شوہر کی اتحاد و اتفاق پیدا کرنے کی خواہش کی علامت ہے، اور یہ مہر براہ راست بیوی کی زندگی پر خوش گوار اثر چھوڑتا ہے۔

لیکن غلط فہمی کے سبب بعض لوگ یہ سوچتے ہیں کہ مہر عورت کی ایک خوردہ قیمت ہے یا پھر ایک تاوان و ہرجانہ ہے جسے عورت کے والد کو دیا جاتا ہے، یا پھر ایک تجارت ہے جس کی وجہ سے عورت شوہر کے لیے جائز اور حلال ہو جاتی ہے۔ اس نقطہ نظر کی تردید اور ابطال کے لیے میں بطور دلیل مندرجہ ذیل حدیث پیش کروں گی:

حضرت جابرؓ سے مروی ہے، کہتے ہیں کہ اللہ کے رسول نے اپنے حجۃ الوداع کے خطاب میں ارشاد فرمایا: "عورتوں کے بارے میں اللہ کا خوف کھاؤ، کیونکہ تمہیں وہ اللہ کی طرف سے بطور امانت دستیاب ہوئی ہیں، اور تمہارے لیے جائز قرار دی گئی ہیں"۔ ﴿صحیح مسلم بشرح نووی ج ۳ کتاب الحج ص ۳۴۴﴾

در حقیقت مہر ایک حق ہے جو عورتوں کو تعظیم و تکریم بخشتا ہے اور شوہر کی وفاداری، پیار و محبت ،حفاظت و نگرانی اور حسن سلوک کی علامت ہے جس کا پوری ازدواجی زندگی میں شوہر اہتمام کرتا ہے۔ حق وراثت:

اسلام میں عورتوں کی تعظیم و تکریم کا اظہار ان کے حق وراثت سے ہوتا ہے، اس وقت عورتوں کے حقوق کے تئیں یہ ایک انقلاب عظیم تھا جبکہ کفار و مشرکین اور راہ راست سے منحرف عرب قائدین عورتوں کو

حق وراثت سے محروم رکھتے تھے، وراثت میں حصہ فقط مردوں کے لیے خاص تھا جو ان کے بقول جنگ لڑتے تھے، تلوار اٹھاتے تھے، میدان قتال میں داد شجاعت دیتے تھے، قبیلہ کی حفاظت کرتے تھے اور سرحد کی نگرانی کرتے تھے۔ عورتوں کی حالت کافی ناگفتہ بہ تھی، اپنے رشتہ داروں سے وراثت میں کچھ پانے کی بجائے وہ خود بطور میراث کے تقسیم کی جاتی تھیں، ایک عورت میت کا مال متروک سمجھی جاتی تھی جس کی دیگر متروکات کی مانند مرد ورثاء میں تقسیم عمل میں آتی تھی، اور درحقیقت دیگر جانوروں کی طرح ان کو بھی میت کے وارثین آپس میں بانٹ لیتے تھے، میت کا قریب ترین رشتہ دار اس کی بیوی کو بطور ورثہ رکھ لیتا تھا، قرآن کریم کے نزول کے سبب تذلیل واہانت پر مبنی یہ عمل اپنے اختتام کو پہنچا اور عورتوں کو معاشرہ میں باعزت حیثیت ملی، چنانچہ فرمان باری تعالی ہے: "یا أیھا الذین آمنوا لایحل لکم أن ترثوا النساء کرھا ولا تعضلوھن لتذھبوا ببعض ما آتیتموھن إلا أن یأتین بفاحشۃ مبینۃ وعاشروھن بالمعروف فإن کرھتموھن فعسی أن تکرھوا شیئا ویجعل اللہ فیہ خیرا کثیرا". {سورۃ النساء، رقم الآیۃ: ١٩} ترجمہ: اے ایمان والو! تمہارے لیے یہ حلال نہیں ہے کہ تم عورتوں کے زبردستی وارث بن جاؤ، اور انہیں اس لیے نہ روک رکھو، تاکہ تم نے انہیں جو دیا تھا اس میں سے تمہیں کچھ واپس مل جائے، الا یہ کہ وہ کھلی برائی کا ارتکاب کریں، اور ان کے ساتھ معاشرت اور بود وباش میں اچھا برتاؤ کرو، اگر وہ تمہیں ناپسند ہوں، تو ہو سکتا ہے کہ تمہیں ایک چیز ناپسند ہو، اور اللہ نے اس میں تمہارے لیے بہت سی بھلائیاں رکھی ہوں۔

اس آیت کی تفسیر میں ابن عباس کہتے ہیں: "اگر ایک آدمی مر جاتا تو اس کے رشتہ دار اس کی بیوی کو بطور وراثت کے لینے کا حق رکھتے تھے، ان میں سے کوئی ایک جس کی خواہش اس عورت سے شادی کرنے کی ہوتی تھی تو شادی کر لیتا تھا، اگر اس کی مرضی اس عورت سے شادی کرنے کی نہ ہوتی تھی، تو اسے وہ شادی کرنے کی اجازت دیتے تھے اور بسا اوقات نہیں بھی دیتے تھے، کیونکہ وہ اس عورت کا خود کو زیادہ حقدار سمجھتے تھے بنسبت دیگر رشتہ داروں کے، اور یہی وجہ ہے کہ اس آیت کا نزول ہوا"۔ ﴿صحیح بخاری طبعۃ دار الفکر ج ٥ کتاب التفسیر ص ١٧٨﴾

اسلام نے کفر پر مبنی اس عمل کو کالعدم قرار دیا، عہد جاہلیت میں عورتوں کے ساتھ ظلم وستم اور تشدد کے رویہ پر قدغن لگایا، ان کی عفت وعصمت اور تقدس کو بحال کیا، ان کی انسانیت کو مستحکم کیا، اور انہیں

وراثت میں لیے جانے اور اہانت کیے جانے کی بجائے انہیں وراثت حاصل کرنے کا حق فراہم کرکے ان کی معاشرتی حیثیت کو عروج بخشا، حالانکہ اس سے قبل وہ حق وراثت سے محروم تھیں۔عورتیں ترکہ میں قانونی طور پر حق رکھتی ہیں اور اسلام انہیں میت کے مال متروک میں سے شرعی قواعد کے مطابق اپنا حق لینے کی اجازت دیتا ہے، اور وراثت کا یہ قاعدہ قرآن مقدس میں احسن انداز میں مذکور ہے، چنانچہ ارشاد باری تعالی ہے:"للرجال نصیب مماترک الوالدان والاقربون وللنساء نصیب مماترک الوالدان والاقربون مما قل منہ أو کثر نصیبا مفروضا".{سورۃ النساء رقم الآیۃ:۷} ترجمہ: والدین اور قریبی رشتہ دار جو مال چھوڑ جائیں اس میں مردوں کا حصہ ہوتا ہے، اور والدین اور قریبی رشتہ دار جو مال چھوڑ جائیں اس میں عورتوں کا حصہ ہوتا ہے، چاہے مال تھوڑا ہو یا زیادہ اور یہ حصے اللہ کی طرف سے مقرر کر دیے گئے ہیں۔

سعید بن جبیر رقم طراز ہیں:"کافر عرب اپنی جائداد میں سے فقط بالغ مرد ہی کو وراثت دیتے تھے، ان کے یہاں عورتوں اور بچوں کو کچھ دینے کا رواج نہ تھا، اسی لیے اللہ تعالی نے اس آیت کو نازل فرمایا، جس میں واضح طور پر اشارہ ہے کہ ہم سب اللہ کی نظر میں یکساں اور برابر ہیں، اور اسی یکسانیت کے سبب حق وراثت رکھتے ہیں، گرچہ فیملی کے مختلف ممبران کو حصہ وراثت تقسیم کرنے میں مختلف حصے بنتے ہیں"۔﴿تفسیر القرآن العظیم لابن کثیر ج ۱ ص ۴۵۴ تفسیر سورۃ النساء﴾ اسی موضوع پر خامہ فرسائی کرتے ہوئے سید قطب کہتے ہیں:" مساوات و یکسانیت کے عام ضابطہ کے مطابق مذہب اسلام میں عورتوں کو حق وراثت دیا گیا ہے اور چھوٹے بچوں کے حقوق کی حفاظت کو یقینی بنایا گیا ہے، کافر عرب ہر شخص کے حق کی تشخیص اس کی معاشی پیداوار کے اعتبار سے کیا کرتے تھے، اور میدان جنگ میں اس کی شجاعت و بہادری کو پیش نگاہ رکھتے تھے؛ لیکن اسلام نے اپنے مضبوط آئین اور پاکیزہ ضابطہ کے مطابق ہر کسی کو بحیثیت انسان دیکھا ہے، اور اس کی انسانیت کے مطابق اس کی تشخیص کی ہے، اور یہ ایسا قیمتی سرمایہ اور اساسی جوہر ہے جو کسی بھی حال میں انسانیت سے جدا نہیں ہوتا ہے۔ اگر دوسرے ناحیہ سے دیکھا جائے تو اسلام نے ہر فرد بشر کے عملی فرائض کو قابل اعتنا سمجھا ہے خصوصا فیملی کو اور عموما سماج کو"۔﴿فی ظلال القرآن سید قطب ج ۱ ص ۵۸۸ تفسیر سورۃ النساء﴾ مندرجہ ذیل آیتیں مختلف حالات میں عورتوں کی میراث کے حصہ کی وضاحت کرتی ہیں اور ان کے حصے کی تخصیص و تعیین کرتی ہیں، اللہ تعالی نے

تقسیم میراث کے متعلق قرآنی آیات کا نزول فرما کر ایک مبنی بر عدل و انصاف قانون لوگوں کو فراہم کر دیا ہے، تا کہ اپنے بچوں اور رشتہ داروں کے بیچ جائداد و وراثت کو خوش اسلوبی کے ساتھ تقسیم کر سکیں:

"یوصیکم اللہ فی أولادکم للذکر مثل حظ الانثیین فإن کن نساء فوق اثنتین فلھن ثلثا ما ترک وإن کانت واحدۃ فلھا النصف ولابویہ لکل واحد منھما السدس مما ترک إن کان لہ ولد فإن لم یکن لہ وورثہ أبواہ فلامہ الثلث فإن کان لہ إخوۃ فلامہ السدس من بعد وصیۃ یوصی بھا أو دین آباؤکم وابناؤکم لا تدرون ایھم أقرب لکم نفعا فریضۃ من اللہ إن اللہ کان علیما حکیما". {سورۃ النساء رقم الآیۃ:۱۱} ترجمہ: اللہ تمہیں تمہاری اولاد کے بارے میں حکم دیتا ہے کہ لڑکے کا حصہ دو لڑکیوں کے برابر ہے، اگر لڑکیاں دو سے زیادہ ہوں تو انہیں ترکہ کا دو تہائی ملے گا، اور اگر ایک لڑکی ہوگی تو اسے آدھا ملے گا، اور اگر اس کا کوئی لڑکا ہے تو اس کے والدین میں سے ہر ایک کو ترکہ کا چھٹا حصہ ملے گا، اور اگر اس کا کوئی لڑکا نہیں ہے اور اس کے وارث اس کے والدین ہیں، تو اس کی ماں کو تہائی حصہ ملے گا، اگر میت کے کئی بھائی ہیں تو پھر اس کی ماں کو چھٹا حصہ ملے گا، (وراثت کی یہ تقسیم) میت کی وصیت کی تنفیذ، یا اگر اس پر قرض ہے تو اس کی ادائیگی کے بعد ہوگی، تم نہیں جانتے کہ تمہارے آباء اور تمہارے لڑکوں میں سے کون تمہارے لیے زیادہ نفع بخش ہیں، اس لیے اللہ کے مقرر کردہ حصوں کو نافذ کرو، بے شک اللہ بڑا علم والا اور بڑی حکمت والا ہے۔

اس حدیث کی تشریح کرتے ہوئے امام بخاری ایک حدیث نقل کرتے ہیں، وہ حدیث جابر بن عبد اللہ سے مروی ہے، حضرت جابر کہتے ہیں: "میں بیمار پڑ گیا، اور آپ ﷺ سے سوال کیا: "اے اللہ کے رسول! میں اپنی جائداد کے متعلق کیا کروں؟ میں اس کی تقسیم کیسے کروں؟ اس سوال کا آپ نے کوئی جواب نہیں دیا، حتی کہ وراثت سے متعلق آیتیں نازل ہو گئیں"۔ ﴿صحیح بخاری طبعۃ دار الفکر ج ۸ کتاب الفرائض ص ۳﴾

آیت میراث کے نزول کے متعلق دوسری حدیث بھی پیش کی گئی ہے، حضرت جابر بن عبد اللہ سے مروی ہے کہ سعد بن ربیع کی بیوی اللہ کے رسول کے پاس آئی اور بولی: "اے اللہ کے رسول! یہ سعد بن ربیع کی دو بیٹیاں ہیں اور سعد جنگ احد میں جام شہادت نوش کر گئے، ان یتیم لڑکیوں کے چچا نے ان کا مال غصب کر لیا ہے، اور ان کے لیے کچھ بھی نہیں چھوڑا ہے، چنانچہ ان کے پاس کچھ نہ ہونے کی وجہ سے ان کی شادی بھی دشوار

ہو جائے گی"، آپ نے جواب دیا:" اللہ رب العالمین مسئلہ کو حل کرے گا"، اسی وقت آیت میراث کا نزول ہوا تھا، آپ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نے ان لڑکیوں کے چچا کے پاس ایک پیغام ارسال فرمایا، جس میں یہ حکم مذکور تھا:"لڑکیوں کو دو تہائی دے دو، آٹھواں حصہ ان کی ماں کو دے دو اور باقی ماندہ اپنے پاس رکھ لو"۔﴿سنن الترمذی کتاب الفرائض ج۴ص ۴۱۴﴾

دونوں حدیثیں بلحاظ سند مضبوط اور صحیح ہیں، اس سے قطع نظر کہ کس واقعہ کے بعد آیت قرآنی کا نزول ہوا، قابل ذکر بات یہ ہے کہ اللہ تعالی نے اس آیت میں والدین کو اولاد کے تعلق سے نصیحت کی ہے، ان کے حقوق کو واضح کیا ہے اور ان کے لیے مال میراث کی مقدار متعین کر دی ہے۔ عبد اللہ بن عباس سے مروی ہے، کہتے ہیں:"مال لڑکے کا ہوتا تھا، اور وصیت والدین کے لیے ہوتی تھی، چنانچہ اللہ تعالی نے حسب مشیئت اس حکم کو بدل ڈالا، مرد کے لیے دو عورتوں کے مساوی حصہ متعین کیا، والدین میں سے ہر ایک کے لیے چھٹا حصہ، بیوی کے لیے آٹھواں حصہ متعین کیا اور شوہر کے لیے آدھا اور چوتھائی حصہ متعین فرمایا ہے"۔﴿صحیح بخاری طبعۃ دار الفکر ج ۸ کتاب الفرائض ص ۷﴾ پھر میت کی بیوی کے لیے متعین حصہ کی وضاحت کرتے ہوئے اللہ تعالی کہتا ہے:"ولکم نصف ماترک ازواجکم إن لم یکن لھن ولد.............. واللہ علیم حلیم". {سورۃ النساء، رقم الآیۃ: ۱۲}

ترجمہ: اور تمہاری بیویوں کے ترکہ کا تمہیں آدھا حصہ ملے گا، اگر ان کا کوئی لڑکا نہیں ہوگا، اگر ان کا کوئی لڑکا ہوگا، تو تمہیں ان کے ترکہ کا چوتھا حصہ ملے گا، اور یہ تقسیم ان کی وصیت کی تنفیذ اور قرض کی ادائیگی کے بعد ہوگی، اور تمہارے ترکہ کا بیویوں کو چوتھا حصہ ملے گا، اگر تمہارا کوئی لڑکا نہیں ہوگا، اگر تمہارا کوئی لڑکا ہوگا تو انہیں تمہارے ترکہ کا آٹھواں حصہ ملے گا، اور یہ تقسیم تمہاری وصیت کی تنفیذ اور قرض کی ادائیگی کے بعد ہوگی، اور اگر میت ایسا آدمی ہو جس کے وارث کلالہ ہوں (یعنی جس کے باپ اور بیٹا بیٹی نہ ہوں) یا کوئی ایسی عورت ہو اور اس کا بھائی بہن ہو، تو ان میں سے ہر ایک کو چھٹا حصہ ملے گا، اگر بھائی بہن ایک سے زیادہ ہوں، تو وہ سب تہائی مال میں شریک ہوں گے، (وراثت کی یہ تقسیم) وصیت کی تنفیذ اور قرض کی ادائیگی کے بعد ہوگی، بشرطیکہ اس وصیت یا قرض سے کسی کو نقصان پہنچانے کا قصد نہ ہو، اللہ کے اس حکم کو نافذ کرو، اور اللہ بڑا علم والا اور بڑا بردبار ہے۔

دوسری جگہ ارشاد باری تعالی ہے:" یستفتونک قل اللہ یفتیکم فی الکلالۃ...... واللہ بکل شيء علیم ".{سورۃ النساء رقم الآیۃ ۱۷۶}

ترجمہ: لوگ آپ سے فتوی پوچھتے ہیں، آپ کہہ دیجیے "کلالہ " کے بارے میں اللہ تمہیں فتوی دیتا ہے، اگر کوئی آدمی مرجائے جس کی کوئی اولاد نہ ہو، اور اس کی ایک بہن ہو، تو اسے نصف ترکہ ملے گا، اور اگر بہن مرجائے اور اس کی کوئی اولاد نہ ہو تو وہ بھائی اس کا وارث ہو گا، اگر بہنیں دو ہوں گی تو ان دونوں کو مال کا دو تہائی ملے گا، اور اگر کئی بھائی بہن ہوں گے تو ہر مرد کو دو عورتوں کے مساوی ملے گا، یہ حکم اللہ تعالی بیان کر دے رہا ہے، تاکہ تم گمراہ نہ ہو جاؤ، اور اللہ ہر چیز کو بخوبی جانتا ہے۔

عرب مسلمانوں کے لیے اپنے باپ دادا سے حاصل کردہ رسم ورواج سے گلو خلاصی اور کنارہ کشی اختیار کرنا ممکن نہ تھا کہ جسے ترک کر کے وہ حکم الہی پر عملدر آمد کرتے، اور خاص طور سے اس حالت میں جبکہ عورتوں کو حق میراث دینے کا قانون نافذ ہو گیا جبکہ اسلام سے قبل میراث پر فقط مردوں ہی کی اجارہ داری قائم تھی، کیونکہ زمانہ جاہلیت کے قانون میں عورتوں کے تعلق سے ایسا کوئی پہلو موجود نہ تھا جو اسے میراث میں حق دلوا سکے۔ الہی قانون وراثت کو بھی بسرعت تمام اور شرح صدر کے ساتھ نہیں اپنایا گیا، نہ اہل عرب نے اس کی خاطر خواہ ستایش کی، کیونکہ ان کے ذہن ودماغ میں عہد جاہلیت کا امتیاز پر مبنی قانون رچا بسا ہوا تھا، مرد وزن کے ساتھ مساوات پر مشتمل قانون دیکھ کر وہ حیران و ششدر اور انگشت بدنداں تھے، وہ ایک دوسرے سے تعجب کے لہجے میں کہا کرتے تھے:" عورت کو چوتھا اور آٹھواں حصہ ملے گا؛ لڑکی بھی آدھا حصہ حاصل کرے گی اور چھوٹا بچہ بھی وراثت میں حصہ کا حقدار ہو گا! ارے! وہ بھی حصہ پائے گا جو جنگی مہم کا حصہ نہ بنا اور مال غنیمت بھی حاصل کرے گا! اس آیت کو نہ یاد کرو نہ اس کا کہیں ذکر کرو، تاکہ یہ نبی پاک کے ذہن سے حرف غلط کی طرح مٹ جائے؛ یا پھر ہم خود ہی ان سے اس پر سوال کرلیں، تاکہ وہ اس میں کچھ حذف واضافہ اور ترمیم کر ڈالیں۔ اس میں سے کسی نے کہا:" اے اللہ کے رسول! کیا آپ ایک لڑکی کو اس کے والد کی جائداد کا نصف حصہ دے رہے ہیں، حالانکہ نہ تو وہ گھوڑے پر سوار ہوتی ہے، نہ دشمنوں سے جنگ کرتی ہے؟ کیا آپ ایک بچہ کو ایک حصہ

فراہم کر رہے ہیں جو ہماری معاشی ترقی اور اقتصادی بلندی میں کوئی کردار نہیں ادا کرتا؟"۔ ﴿تفسیر طبری ج ۸ ص ۳۲﴾

بحیثیت مسلمان ہمیں ہر حال میں قانون الٰہی کو نافذ کرنا چاہیے، اور حکم خداوندی پر عمل پیرا ہونا چاہیے، تبھی جاکر عورتوں کے حقوق بحال ہوسکتے ہیں اور ان کی عفت و عصمت کو تحفظ مل سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے پیش کردہ قانون وراثت اور نظام میراث نے عدل و انصاف کو یقینی بنادیا ہے اور عورتوں پر ظلم و ستم کے سیل رواں پر بند باندھ دیا ہے، یہ قانون مقدس در حقیقت "ذمہ داریوں کی منصفانہ تقسیم" کے اصول پر مبنی، اور "ذمہ داریوں کے بقدر منافع" کے فلسفہ پر قائم ہے، جو ایک وسیع وہمہ گیر مفہوم رکھتا ہے۔ اسلام نے عورتوں کو فکر معاش سے بے نیاز اور مسائل اقتصاد سے آزاد فرمایا ہے، اور اس بار گراں کو مردوں کے دوش توانا پر رکھ دیا ہے، ایک مرد اپنی بیوی، بچوں، اور خاتون رشتہ داروں کی معاشی ضروریات اور گھریلو حاجات کی تکمیل کا مکلف ہے، اپنی بیوی کو مہر دینا اس کی ذمہ داری اور اس پر عائد معاشی جرمانہ کی ادائیگی اس کا فریضہ ہے، اسی لیے یہ بات فطرت کے عین قریب اور عدالت و انصاف سے بالکل ہم آہنگ ہے کہ مردوں کو عورتوں کے بالمقابل دوگنا حصہ دیا جائے، تاکہ اپنی مختلف معاشی ذمہ داریوں سے بسہولت تمام عہدہ بر آں ہوسکیں۔

امام نووی اس نکتہ کی وضاحت کرتے ہوئے کہتے ہیں: "رب العالمین کی دانشمندانہ حکمت نے مردوں پر عائد تمام طرح کی ذمہ داریوں اور فرائض کو پیش نگاہ رکھا ہے، جیسے اہل خانہ کو اشیاء خور و نوش فراہم کرنا، مہمانوں کی تعظیم و تکریم کرنا اور زائرین کی حفاظت و نگہداشت اور خاطر خواہ ضیافت کرنا؛ اسی طرح گداگروں کی دلجوئی کرنا، کسی طرح کا تاوان وہرجانہ ادا کرنا، اور اسی طرح کی دیگر ذمہ داریاں، اور ان ذمہ داریوں سے اللہ ہی بحسن وخوبی واقف ہے"۔ ﴿صحیح مسلم بشرح نووی ج ۴ کتاب الفرائض ص ۱۳۷﴾ یہ بات صداقت پر مبنی ہے کہ آپ ﷺ سے ثابت شدہ حدیث نے اس سلسلے میں اللہ کے احکام کی تصدیق اور اس کے ہدایات کی توثیق کردی ہے، مندرجہ ذیل حدیث غیر مشروط طور پر عورتوں کو رفعت وبلندی اور عظمت و تقدس فراہم کرتی ہے ان کے حق وراثت کو تحفظ دیکر: سعد بن وقاص کہتے ہیں: "مجھے ایک بیماری لاحق ہوگئی جس کے سبب میں بستر مرگ پر دراز ہوگیا، نبی پاک ﷺ میری تیمارداری اور مزاج پرسی کے لیے تشریف لائے، میں نے آپ سے پوچھا: "اے اللہ کے رسول! میرے پاس ڈھیر ساری جائداد ہے اور ایک بیٹی کے علاوہ کوئی میراوارث

بھی نہیں ہے، کیا میں اپنی جائداد کا دو تہائی حصہ راہ خدا میں وقف کر دوں؟"، آپ نے بطور جواب کہا: "نہیں"، میں نے پوچھا: "اس کا آدھا؟"، آپ نے کہا: "نہیں"، میں نے پوچھا: "اس کا ثلث"، آپ نے کہا: "ہاں تم ایسا کر سکتے ہو، لیکن ایک تہائی بھی بہت زیادہ ہے، کیونکہ اپنے بچوں کو امیری اور دولت کی حالت میں چھوڑنا غربت کی حالت میں چھوڑنے سے بہتر ہے کہ وہ دوسروں کے سامنے دست سوال دراز کرتے رہیں۔ اور تم رضائے الٰہی کے پیش نظر جو کچھ بھی خرچ کروگے اس کا تمہیں بھرپور اجر ملے گا، حتی کہ اگر بیوی کے منہ میں ایک نوالہ ڈالو گے تو وہ بھی اجر و ثواب کا باعث ہوگا"۔ ﴿بخاری شریف ج ۸ ص ۵﴾ گرچہ حضرت سعد کو ایک ہی لڑکی تھی، تاہم آپ ﷺ نے باپ کی جائداد میں اس کے حق کو محفوظ رکھا اور اسے تاکیدی طور پر ادا کرنے کا حکم دیا، اور اس فیصلہ ربانی کے پیچھے مخفی حکمت کی وضاحت بھی فرمائی۔ چنانچہ مذکورہ بالا واقعات سے یہ حقیقت طشت از بام ہوتی ہے کہ اللہ تعالی عورتوں کے حقوق کو تحفظ فراہم کرتا ہے اور ان کی زندگی کے تمام احوال و کیفیات میں وراثت میں ان کے مخصوص حصہ کو یقینی بناتا ہے، جیسے لڑکی کی حیثیت سے، بہن کی حیثیت سے، ماں کے لحاظ سے اور بیوی کے اعتبار سے۔

تیرھواں باب:

اسلام میں بیٹی کے فرائض

میں اس کتاب کے دوسرے حصے کو اسلام میں عورتوں کے حقوق کے تعلق سے خاص کر دی ہوں، تیسرا حصہ اسلام میں عورتوں کی ذمہ داری اور ان کے فرائض پر روشنی ڈالے گا، منظم انداز میں صلب موضوع کو زیر بحث لانے کے لیے میں نے ذمہ داریوں کو تین حصوں میں منقسم کرنے کی کوشش کی ہے عورت کی زندگی میں پیدا شدہ مختلف احوال وظروف کے اعتبار سے:

پہلا حصہ: ایک نوجوان عورت کی حیثیت سے ذمہ داری

دوسرا حصہ: بیوی کی حیثیت سے ذمہ داری

تیسرا حصہ: ماں کی حیثیت سے ذمہ داری

مذہب اسلام کی طرف سے عورتوں کو فراہم کردہ حقوق کے عوض میں، جیسے زندگی کا حق، تحفظ کا حق، روزی کا حق، عزت واحترام کا حق، تعلیم وتربیت کا حق، حسن سلوک کا حق اور معاشی وسیاسی حقوق، ان تمام حقوق کے بدلے میں ایک عورت کو مختلف ذمہ داریوں کو انجام دینا پڑتا ہے، جس میں سے چند کا ذکر کیا جاتا ہے:

ا۔ اپنے خالق کے تئیں عورت کا حق:

ہر انسان کی پہلی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ اس بات کا اعتقاد رکھے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود بر حق اور کارساز حقیقی نہیں ہے، اور اللہ کی ذات میں نہ کسی کو شریک ٹھہرائے اور نہ ہی شرکت کا عقیدہ رکھے۔ اللہ تعالی کا فرمان ہے: "واعبدوا اللہ ولا تشرکوا بہ شیئا". {سورۃ النساء رقم الآیۃ:۳۶} ترجمہ: اور اللہ کی عبادت کرو، اور اس کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ بناؤ۔

علامہ ابن کثیر کا کہنا ہے: "اللہ رب العالمین ہمیں فقط اپنی ہی عبادت کرنے کی تلقین کرتا ہے، اور اپنی عبادت میں کسی کو بھی شریک کرنے سے منع فرماتا ہے، کیونکہ اللہ ہی خالق ہے، وہی رازق ہے، وہی کارساز اور وہی مشکل کشا ہے، اسی کی ذات ہے جو اپنے بندوں پر ہمہ وقت نوازشیں کرتی ہے اور ہر حال میں مدد بہم پہنچاتی

ہے، اسی لیے صرف وہی لائق عبادت اور سزاوار بندگی ہے، اور اس بات کا مستحق ہے کہ بلاشرکت غیرے اس کی عبادت کی جائے"۔ ﴿تفسیر القرآن العظیم لابن کثیر ج ا ص ۴۹۳﴾

نبی پاک کے مقدس فرامین نے خالق کائنات کے تئیں مخلوق خدا کی ذمہ داری کی وضاحت کر دی ہیں، جو اللہ کی وحدانیت کا اعتراف ہے اس عقیدہ کے ساتھ کہ اس کے سوا کوئی معبود برحق اور کارساز حقیقی نہیں ہے، یہ عقیدہ در حقیقت کچھ ذمہ داریاں بھی عائد کرتا ہے جیسے اللہ کے فرامین پر عمل پیرا ہونا، اس کے نبی کی سنت پر عمل کرنا، حق تعالی کے احکام کی بجاآوری کرنا جو مقدس قرآن میں مذکور ہیں اور جن کی وضاحت نبی پاک کی عملی زندگی سے ہوتی ہے۔ اسی طرح ان تمام چیزوں سے کنارہ کشی اختیار کرنا جنہیں شریعت نے ممنوع قرار دیا ہے، اللہ کی ذات پر کامل یقین رکھنا، اس کی کتابوں پر ایمان لانا، اس کے انبیاء پر ایمان لانا، قیامت کے دن پر ایمان لانا، اور اسی طریقہ سے اچھی یا بری تقدیر پر ایمان لانا۔ یہ عقیدہ ایمان کے مبادیات اور مذہبی عملیات پر بھی مشتمل ہے، جیسے نماز، زکاۃ، حج، روزہ اور وہ تمام قوانین جسے اللہ نے مسلمانوں کی انفرادی و اجتماعی زندگی کی تشکیل کے لیے وضع کیا ہے، بلاشبہ، یہ تمام چیزیں ایمان کے اہم عناصر میں سے ہیں، یہ بات پوری تفصیل کے ساتھ حدیث رسول میں بھی بیان کی گئی ہے۔ حضرت عمر بن خطاب سے مروی ہے، کہتے ہیں: "ایک دن ہم لوگ دربار نبوی میں بیٹھے ہوئے تھے کہ ہمارے سامنے ایک نہایت ہی سفید پوش شخص نمودار ہوا، اس کے بال بے پناہ حد تک کالے تھے، اس پر آثار سفر بھی نمودار نہیں ہو رہے تھے، ہم میں سے کوئی بھی اسے پہچان نہ سکا، در حقیقت، وہ نبی پاک کے سامنے بیٹھ گیا، اپنے گھٹنوں کو آپ کے گھٹنوں پر رکھتے ہوئے اور اپنے ہتھیلیوں کو آپ کے ران پر رکھتے ہوئے اس نے کہا: " محمد! مجھے اسلام کے تعلق سے کچھ معلومات فراہم کریں"، محمد ﷺ نے فرمایا: "اسلام یہ ہے کہ تم اس بات کی شہادت دو کہ اللہ کے سوا کوئی معبود برحق نہیں اور یہ کہ محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں، اور اسلام کا تقاضا یہ بھی ہے کہ تم نماز کا اہتمام کرو، زکاۃ کی ادائیگی کرو، رمضان المبارک کا روزہ رکھو اور اگر زاد راہ دستیاب ہو تو خانہ کعبہ کا حج کرو"، اس سائل نے کہا: "آپ نے سچ کہا "، پھر اس نے مزید کہا: "آپ مجھے ایمان کے متعلق اطلاعات فراہم کریں"، آپ ﷺ نے اسے جواب دیا: " ایمان یہ ہے کہ آپ اللہ پر اعتقاد رکھو، اس کے فرشتوں پر ایمان لاؤ، اس کی کتابوں میں یقین رکھو، اس کے رسولوں پر ایمان لاؤ، یوم آخرت پر اعتقاد بحال کرو، اور یہ کہ تم تقدیر پر ایمان لاؤ، خواہ اچھی ہو یا بری "، اس

سائل نے کہا:" آپ نے سچ ہی کہا ہے "۔ پھر اس سائل نے مزید کہا:" آپ مجھے احسان کے متعلق کچھ بتائیں "، آپ ﷺ نے کہا:" احسان یہ ہے کہ تم اللہ کی اس انداز میں عبادت کرو گویا تم اسے دیکھ رہے ہو، گرچہ تم اسے نہیں دیکھ رہے ہو مگر بالیقین وہ تمہیں دیکھ رہا ہے "، سائل نے پھر کہا:" آپ نے سچی بات کہی "، پھر سائل نے درخواست کی:" آپ مجھے قیامت کے تعلق سے کچھ بتائیں "، اس پر آپ نے تبصرہ فرمایا:" جس سے سوال کیا جارہا ہے وہ سوال کرنے والے سے زیادہ نہیں جانتا ہے "، تب سائل نے کہا:" مجھے کچھ اس کے آثار اور علامات تو بتلا دیں "، اس پر آپ نے جواب دیا:" جب تم دیکھو کہ غلام عورت اپنی مالکن کو جننے لگے، اور جب برہنہ پاؤں، قلاش اور بکری کے چرواہے فلک بوس عمارتیں بنا کر اظہار فخر کرنے لگیں "۔(تو سمجھ لو کہ قیامت سامنے ہے)

عمر بن خطاب نے کہا:" پھر سائل چلا گیا، لیکن میں نبی پاک ﷺ کے ساتھ کچھ دیر تک بیٹھا رہا، پھر آپ نے مجھ سے کہا:" عمر، تمہیں پتہ ہے کہ یہ کون شخص تھا؟" میں نے جواب دیا:" اللہ اور اس کے رسول ہی کو بہتر پتہ ہے "، آپ ﷺ نے جواب دیا:" وہ جبریل امین علیہ السلام تھے، وہ تمہارے پاس تمہارا دین سکھانے آئے تھے "۔﴿صحیح مسلم بشرح نووی ج ۱ کتاب الایمان ص ۱۳۳﴾

اس سلسلہ میں امام نووی رقم طراز ہیں:" یہ حدیث تمام مذہبی عبادات اور دینی وظائف کے وسیع و ہمہ گیر مفہوم پر مشتمل ہے، خواہ وہ ظاہری عبادت ہو یا پھر باطنی عبادت، جن کا صدور ہمارے اعضاو جوارح سے ہوتا ہو، جیسے اللہ کے احکام کی بجا آوری، ہمارے اعضاو جوارح کی حرکت، یا پھر جس کا تعلق ہمارے باطن سے ہو، جیسے دل کا خلوص اور بری حرکات پر قابو۔ مزید برآں اسی حدیث کی طرف شریعت کے تمام علوم و معارف لوٹتے ہیں اور اسی کی جڑ سے تمام شاخیں نکلتی ہیں اور واجبات و سنن، مرغوبات و مکروھات اور حلال و حرام کوئی بھی اس کے تینوں اقسام سے خارج نہیں ہیں "-﴿حوالہ سابق﴾ یہ حدیث تمام عورتوں بشمول باندیوں کی اپنے آقا کے تئیں ذمہ داریوں کو اجاگر کرتی ہے کہ ایک عورت کا اللہ کے تعلق سے، اس کے رسول کے تعلق سے کیا عقیدہ ہونا چاہیے، اسی طریقہ سے معاشرہ میں دیگر لوگوں کے ساتھ اس کا کیا تعامل ہونا چاہیے:

اللہ تعالی کی ذات پر عقیدہ:

اللہ کے وجود اور اس کی وحدانیت پر مکمل ایمان رکھنا؛ اس اعتبار سے کہ وہی خالق ہے، وہی تمام مخلوقات کا پالنہار اور روزی رساں ہے، کائنات پر اسی کی حکمرانی ہے، اور اسی کے حسن انتظام پر اس دنیائے آب وگل کے وجود کا انحصار ہے۔ نیز اس بات کی گواہی دینا کہ اللہ کا کوئی شریک کار اور ساجھی نہیں ہے، وہ اپنے تمام مخلوق سے اعلی، ارفع وبالاتر ہے، اور اس کی مخلوقات میں سے کوئی بھی شے اس کے مشابہ نہیں ہے، اور نہ کوئی بھی انسانی خصائص اللہ کے خصائص کی مانند ہیں۔ وہی محض اس لائق ہے کہ اس کی عبادت کی جائے، اور عبادت کا کوئی بھی عمل اس کے علاوہ کسی اور کے لیے انجام دینا ازروئے شرع شرک ہے۔ وہ بلاشبہ پاک ہے، مکمل ہے اور تمام تر نقائص سے منزہ ومبرا ہے، اپنی ذات کا تعارف کراتے ہوئے اللہ تعالی کہتا ہے: "لیس کمثلہ شيء وھو السمیع البصیر". {سورۃ الشوری رقم الآیۃ:۱۱} ترجمہ: اس کے مانند کوئی چیز نہیں ہے، اور وہ سننے والا، دیکھنے والا ہے۔

بے شک، اللہ ایک ہے، بے مثال اور عدیم النظیر ہے:

"قل ھو اللہ أحد اللہ الصمد لم یلد ولم یولد ولم یکن لہ کفوا أحد". {سورۃ الإخلاص} ترجمہ: اے نبی! آپ کہہ دیجیے کہ اللہ ایک ہے، وہ بے نیاز ہے، نہ اس نے (اپنے بطن سے) کسی کو پیدا کیا، نہ وہ پیدا کیا گیا، نہ کائنات کی حکمرانی میں اس کا کوئی ساجھی وشریک ہے۔

فرشتوں پر ایمان:

فرشتوں پر ایمان لانے کا مطلب یہ ہے کہ ان کے وجود پر ایمان لایا جائے، اور سلف صالحین نے ان کی جو ہیئت وساخت اور ماہیئت کو بیان کیا ہے اسی کے مطابق ان پر اعتقاد بحال کیا جائے۔ چنانچہ اللہ تعالی کا فرمان ذیشان ہے: "وقالوا اتخذ الرحمن ولدا سبحنہ بل عباد مکرمون لا یسبقونہ بالقول وھم بأمرہ یعملون". {سورۃ الأنبیاء رقم الآیۃ:۲۷} ترجمہ: اور انہوں نے کہا کہ اللہ نے اپنی اولاد بنا رکھی ہے، حالانکہ وہ اس عیب سے پاک ہے، بلکہ (فرشتے) اس کے معزز بندے ہیں، وہ اس سے پہلے (اپنی طرف سے) کوئی بات نہیں کرتے ہیں اور اس کے حکم کے مطابق عمل کرتے ہیں۔

اور اس بات پر بھی ایمان رکھنا کہ فرشتے متعدد امور کو انجام دیتے ہیں، جیسا کہ کتاب وسنت میں مذکور ہے۔ علامہ ابن حجر کا کہنا ہے: "اللہ رب العالمین نے فرشتوں کو کتابوں اور نبیوں پر بحیثیت ترتیب تقدم بخشا

ہے کہ اس نے وحی کو فرشتوں کے توسط سے اپنے انبیاء پر نازل فرمایا۔ بہر کیف، اس سے لازمی طور پر یہ بات نہیں سمجھ میں آتی ہے کہ فرشتوں کو انبیاء پر فوقیت اور ترجیح دینی چاہیے"۔ ﴿فتح الباری بشرح صحیح البخاری ج ۱کتاب الایمان ص۱۱۷﴾

اللہ کی کتابوں پر ایمان:

کتابوں پر ایمان لانے کا مطلب یہ ہے کہ ان کے تقدس، عظمت اور منزل من اللہ ہونے پر ایمان لایا جائے، اور اس بات پر بھی کہ ان کتابوں میں موجود مواد اور مضامین اللہ کی جانب سے ہیں جو آسمان اور زمین کا مالک ہے۔

انبیاء پر ایمان:

نبیوں پر ایمان لانے کا مطلب اللہ کے ان تمام قاصدین، پیغمبران اور نبیوں کی نبوت ورسالت پر ایمان لانا ہے جن کا ذکر اللہ تعالی نے اپنی مقدس کتاب میں کیا ہے، جو نوحؑ سے شروع ہو کر محمد ﷺ تک جا کر ختم ہوتی ہے۔ یہی وہ پیغمبران ہیں جنہیں اللہ نے اپنے ذی اہمیت اور پر وقار پیغام کے لیے منتخب کر لیا تھا، وہ اللہ کے پیغامات کے حاملین تھے، گناہوں سے بالکل خالی اور خطاؤوں سے بالکل عاری تھے، اللہ کی طرف سے اپنی اپنی قوم کے لیے بطور نمونہ اور آئیڈیل بھیجے گئے تھے، یہ عقیدہ اس بات کا بھی متقاضی ہے کہ ہم اعتقاد رکھیں کہ محمد ﷺ اللہ کے آخری رسول ہیں۔ فرمان باری تعالی ہے:"ماکان محمد ابا أحد من رجالکم ولکن رسول اللہ و خاتم النبیین". {سورۃ الأحزاب رقم الآیۃ:۴۰} ترجمہ: محمد ﷺ تم میں سے کسی کے باپ نہیں ہیں، وہ تو اللہ کے رسول اور انبیاء کے سلسلے کو ختم کرنے والے ہیں۔

اور اس بات پر بھی ایمان رکھنا کہ آپ ﷺ کا پیغام، آپ کی نبوت ورسالت عام ہے جو سب کے لیے ہے، اس میں کسی ذات، نسل، زبان، علاقہ، خطہ، ملک اور سرحد کی کوئی قید نہیں ہے، اللہ رب العالمین کا فرمان ذیشان ہے:" قل یا أیھا الناس انی رسول اللہ إلیکم جمیعا الذی لہ ملک السموات والأرض". {سورۃ الأعراف

رقم الآیۃ:۱۵۸} ترجمہ: آپ کہیے کہ اے لوگو! میں تم سب کے لیے اللہ کا رسول ہوں جو آسمانوں اور زمین کا بادشاہ ہے۔ قیامت کے دن پر ایمان:

قیامت کے دن کی حقیقت اور انصاف کے دن کی صداقت پر پختہ یقین رکھنا بھی عقائد کے باب میں سے ہے، یعنی یہ عقیدہ رکھنا کہ قیامت کا وقوع پذیر ہونا یقینی اور تمام تر شکوک وشبہات سے بالاتر ہے، اور اسی دن کے ساتھ انسانوں کی تخلیق کا مقصد بھی پایہ تکمیل کو پہنچ جائے گا، یہ سزا اور جزا کا دن ہے، جبکہ ہر شخص اپنے کار خیر کے سبب انعام سے سرفراز کیا جائے گا اور اپنی بد اعمالی اور بے راہ روی کے سبب سزا سے دوچار کیا جائے گا۔ اللہ تعالی کا فرمان ہے:"فمن یعمل مثقال ذرۃ خیرا یرہ و من یعمل مثقال ذرۃ شرا یرہ".{سورۃ الزلزال رقم الآیۃ:۸} ترجمہ: جو شخص ذرہ برابر بھی نیکی کرے گا وہ اسے دیکھ لے گا، اور جو شخص ذرہ برابر بھی برائی کا ارتکاب کرے گا وہ اسے اپنے سامنے دیکھ لے گا۔

اس دن ہر شخص یا تو جنت کی نعمتوں سے ہمکنار ہو گا، یا پھر جہنم کی آگ سے دوچار ہو گا۔

اچھی یا بری تقدیر پر ایمان:

قرآن کریم میں مذکور اچھی یا بری تقدیر پر ایمان لانا بھی اسلام کے بنیادی مبادیات اور اساسی تعلیمات میں سے ہے، یہ ایک طریقہ اور نظام ہے جس کو بروئے کار لاتے ہوئے اللہ تعالی نے اس کائنات کی تخلیق فرمائی ہے، اللہ تعالی نے اسباب ووسائل سے دنیا کو وابستہ کر دیا ہے اور انہی کے ذریعے قانون قدرت کو استحکام بخشا ہے، یہ بات حقیقت پر مبنی ہے کہ اللہ تعالی نے انسانوں کو خیر وشر کے انتخاب کے معاملے میں آزاد بنا کر پیدا کیا ہے اور یہ فیصلہ ربانی اور حکمت خداوندی کی بہترین مثال اور عمدہ نظیر ہے۔

امام خطابیؒ رقم طراز ہیں:"بہت سارے لوگوں کا گمان اور نظریہ یہ ہے کہ قضاوقدر کا معنی اللہ کا اپنے بندوں کو مجبور کرنا ہے اور ان کے معاملے میں اللہ تعالی نے جو فیصلہ کر دیا ہے اس پر انہیں جبر واکراہ کے ساتھ عمل کرانا ہے، لیکن بات وہ نہیں ہے جو لوگ سوچتے ہیں، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اچھی اور بری تقدیر کے پیش نظر بندوں سے جن اعمال کا صدور ہوتا ہے یا جو حرکات سرزد ہوتے ہیں اس کی پیشگی اطلاع اللہ رب العالمین کے پاس رہتی ہے"۔﴿صحیح مسلم بشرح نووی ج ا کتاب الایمان ص ۱۳۱﴾

آپ ﷺ نے فرمایا: ایمان کی بنیاد پانچ چیزوں پر رکھی گئی ہے: اس بات کی گواہی دینا کہ اللہ کے سوا کوئی معبود حقیقی نہیں ہے اور محمد ﷺ اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں، نماز قائم کرنا، زکاۃ کی ادائیگی کرنا، رمضان المبارک کا روزہ رکھنا، اور بیت اللہ کا حج کرنا"۔﴿صحیح مسلم بشرح نووی ج ۲ کتاب الایمان ص ۱۰۱﴾

اسلام کے یہ پانچوں بنیادی ارکان کسی شخص کے اللہ کی ذات پر ایمان وعقیدہ کا نتیجہ اور ثمرہ ہیں، یہ ارکان ہر اس مسلمان پر عائد بنیادی فرائض کے نقیب وترجمان ہیں، جس نے اللہ کو اپنے رب، اسلام کو اپنے مذہب اور محمد ﷺ کو اپنے نبی اور رسول کی حیثیت سے تسلیم کرلیا ہے۔

ایک نوجوان مسلم عورت کو عبادت وریاضت اور اخلاق وکردار سے متعلق شرعی امور کی انجام دہی کی مکلف بنایا گیا ہے، فقط ان امور کی انجام دہی کے بعد ہی وہ اپنے عقیدے میں اخلاص وللّٰہیت اور ایمان میں صداقت وحقانیت کا ثبوت پیش کرپائے گی، سابقہ سطور میں پیش کردہ حدیث ایمان اور اسلام کے بعد تیسرے درجہ کے مطلب کی وضاحت کرتی ہے جس کا نام احسان ہے، احسان کا مطلب اللہ کی عبادت میں مکمل خلوص اور اس کے وجود کی موجودگی کا مسلسل احساس وادراک ہے، اس کا مطلب اللہ کی خاطر خواہ تکریم اور اس کے احکام کے سامنے مکمل سپردگی ہے، جس میں اس احساس کی کرم فرمائی ہو کہ اللہ سب کچھ جانتا ہے اور ہم جو کچھ مخفی رکھتے ہیں اور جو کچھ ظاہر کرتے ہیں اس سے بحسن وخوبی واقف ہے، اگر کوئی لڑکی یا نوجوان عورت مرتبہ احسان کو پالیتی ہے، تو اپنے خالق کے تئیں ذمہ داریوں کی ادائیگی میں وہ کامیاب وکامران ہوجائے گی، مرتبہ احسان اور درجہ خشوع درحقیقت کامل یقین کا معیار اور اپنے رب کی ذات میں اعتقاد انتہائی منزل ہے۔اپنے والدین سے وابستہ ذمہ داری:

ہر بیٹی پر لازم ہے کہ وہ اپنے والدین کی وفادار، اطاعت شعار اور ان کے حکموں پہ جاں نثار ہو، اس میں کوئی شک نہیں کہ قرآن کریم میں اپنے والدین کے تئیں ذمہ داری کو بنیادی ذمہ داری اور اہم فریضہ کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے جسے ہم توحید کی ذمہ داری کہتے ہیں اور جس کا تقاضا یہ ہے کہ ایک اللہ کی عبادت کی جائے اور اس کی عبادت میں کسی کو شریک نہ کیا جائے، قرآن کریم میں اللہ تعالی کا یہ فرمان ہے:"واعبدوا اللہ ولا تشرکوا بہ شیئا وبالوالدین احسانا".{سورۃ النساء رقم الآیۃ: ۳۶} ترجمہ: اللہ کی عبادت کرو، اور اس کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ ٹھہراؤ اور اپنے والدین کے ساتھ حسن سلوک کرو۔

شرک کی ممانعت کے ساتھ ہی والدین کے ساتھ حسن سلوک کا ذکر کیا گیا ہے، اللہ تعالی کا فرمان ہے:" قل تعالوا اتل ما حرم ربکم علیکم ألا تشرکوا به شیئا و بالوالدین احسانا". {سورۃ الأنعام رقم الآیۃ:۱۵۱} آپ کہیے، آؤ، میں پڑھ کر تمہیں وہ چیزیں سناؤ جو تمہارے رب نے تمہارے اوپر حرام قرار دیا ہے، وہ یہ ہیں کہ کسی چیز کو اللہ کا شریک نہ بناؤ، اور والدین کے ساتھ حسن سلوک کرو۔

قرآن کریم کی دیگر آیات بھی اسی طرح کی پیغامات شیئر کرتی ہیں، اللہ تعالی کا فرمان ہے:"وإذ أخذنا بنی اسرائیل لا تعبدون إلا اللہ و بالوالدین احسانا". {سورۃ البقرۃ رقم الآیۃ:۸۳} ترجمہ: اور جب ہم نے بنی اسرائیل سے اقرار لیا کہ تم اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہیں کروگے، اور والدین کے ساتھ اچھا برتاؤ کروگے۔

علامہ ابن کثیر کا کہنا ہے:" در حقیقت یہ عظیم حق ہے اور تمام حقوق میں سب سے بڑا حق ہے؛ اللہ کا اس کے بندوں پر یہ حق ہے کہ وہ اسی کی عبادت کریں اور اس کی عبادت میں کسی کو شریک نہ کریں۔ اللہ تعالی کے حقوق کے بعد اس کی مخلوق کا حق آتا ہے جس میں والدین کے حق کو اولیت اور فضیلت حاصل ہے، اور یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالی نے اپنے حق کے ذکر کے بعد والدین کا اولاد پر حق کو ذکر کیا ہے، چنانچہ فرمان باری تعالی ہے:" أن اشکر لی ولوالدیک إلی المصیر". {سورۃ لقمان رقم الآیۃ:۱۴} ترجمہ: ہم نے اسے حکم دیا کہ تو میرا شکر ادا کر، اور اپنے ماں باپ کا شکر ادا کر، سب کو میرے ہی پاس لوٹ کر آنا ہے۔

والدین کے ساتھ حسن سلوک اور خوش کن تعامل کی تاکید اور توضیح اس آیت سے مزید ہو جاتی ہے جسے نیچے پیش کیا جارہا ہے:"وقضی ربک ألا تعبدوا إلا إیاہ وبالوالدین احسانا اما یبلغن عندک الکبر أحدھما أو کلاھما فلا تقل لھما اف ولا تنھرھما و قل لھما قولا کریما واخفض لھما جناح الذل من الرحمۃ و قل رب ارحمھما کما ربیانی صغیرا". {سورۃ بنی اسرائیل رقم الآیۃ:۲۴} ترجمہ: اور آپ کے رب نے یہ فیصلہ کردیا ہے کہ لوگو! تم اس کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو، اور ماں باپ کے ساتھ اچھا برتاؤ کرو، اگر ان میں سے ایک یادونوں تمہاری زندگی میں بڑھاپے کو پہنچ جائیں تو انہیں نہ اف کہو، اور نہ انہیں ڈانٹو، اور ان کے ساتھ نرمی اور ادب و احترام کے ساتھ بات کرو، اور جذبہ رحمت کے ساتھ ان کے سامنے تواضع اور انکساری اختیار کرو، اور دعا کرو کہ اے میرے رب! جس طرح ان دونوں نے بچپن میں میری پرورش وپرداخت کی تھی اسی طرح تو ان پر رحم فرمادے۔

ان آیات نے اپنے بچوں پر والدین کے حقوق کو نہایت ہی منظم، وسیع اور جامع انداز میں بیان کر دیا ہے، اپنے انداز اور اسلوب میں پختگی پیدا کرنے کے لیے "تمہارے رب نے فرض قرار دیا ہے" جیسی تعبیر کا استعمال کیا گیا ہے، یہ نہایت ہی عمدہ طرز تعبیر اور پر کشش اسلوب گفتگو ہے جس کے توسط سے یہ فرمان جاری کیا گیا ہے، یہ ایک واضح اور ناقابل تردید فریضہ کو پیش کر رہا ہے، امام قرطبیؒ رقم طراز ہیں: "اللہ نے فرض قرار دیا"، کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالی نے حکم دیا ہے، لازم قرار دیا ہے اور اس کو متعین کر دیا ہے"۔ ابن عباس، قتادہ اور حسن رحمہم اللہ اجمعین کا کہنا ہے: "اس سیاق میں "فرض قرار دیتا ہے" کا اشارہ کسی قانونی سزا کی طرف نہیں بلکہ شرعی تعلیمات کی طرف ہے"۔ ﴿الجامع لاحکام القرآن للقرطبی ج ۱۰ تفسیر سورۃ الاسراء ص ۲۳۷﴾ اس آیت کی تفسیر میں سید قطب کہتے ہیں: "اتنے پر شکوہ کلمات اور بلیغ استعارات کے ساتھ قرآن کریم احساس ذمہ داری کو بیدار کرتا ہے اور بچوں کے دلوں میں جذبات ترحم کو ابھارتا ہے، تاکہ وہ اپنے بوڑھے والدین کی ذمہ داری کے تئیں محتاط اور بیدار ہو جائیں جنہوں نے اپنے بچوں کی نگہداشت اور دیکھ بھال میں اپنی پوری توانائی، قوت اور طاقت صرف کر دی حتی کہ ان کے پاس کوئی سرمایہ باقی نہ رہا۔ ان آیات میں اپنے والدین کی اطاعت و تابعداری پر مشتمل ذمہ داری کی ایک فریضہ کی شکل میں وضاحت ہو رہی ہے جسے اللہ نے اپنے بندوں پر عائد کیا ہے، اور اس فریضہ کو تاکیدی طور پر شرک کی ممانعت کے بعد پیش کیا گیا ہے"۔ ﴿فی ظلال القرآن سید قطب ج ۴ ص ۲۲۱﴾ حصول علم کی ذمہ داری:

ایک مسلمان نوجوان عورت کو اسلامی آئین، اخلاق و اقدار، عبادت کے امور اور جائز و ناجائز اعمال کی معرفت حاصل کرنی چاہیے، بلفظ دیگر اسے اپنے دین کی پختہ معلومات اور سنجیدہ جانکاری رکھنی چاہیے۔ حقیقت میں جو عام طور پر جاننے کی چیزیں ہیں اس کا جاننا بہت ضروری ہے، اس سے عدم آشنائی اس کو اللہ کے تئیں ذمہ داریوں سے نجات نہیں دے سکتی ہے، آپ ﷺ کا فرمان ہے: "علم کا حاصل کرنا ہر مسلمان پر فرض ہے"۔ چنانچہ آپ ﷺ نے دینی تعلیمات کے حصول کو واجب قرار دیا اور ہر مسلمان مرد اور عورت پر اپنے مذہبی امور کی جانکاری کو ناگزیر بتلایا ہے۔

اس بات پر اتفاق ہے کہ عورتوں کی ذمہ داری میں سے اپنے دین کی معرفت حاصل کرنا بھی ہے، نماز ادا کرنا، روزہ رکھنا، زکاۃ کی ادائیگی کرنا، حج کو جانا، اچھائی کا حکم دینا اور برائی سے منع کرنا، اور ہر کار خیر کی انجام

دہی بھی اسی ذمہ داری میں شامل ہے، ایک مسلمان عورت ان ذمہ داریوں سے اسی وقت آشنا ہو سکتی ہے جب وہ اپنے دین کے بارے میں گہری معلومات حاصل کرے۔ مزید یہ کہ ایک عورت کو کچھ دنیوی معلومات بھی حاصل کرنی چاہیے جو اسے بحیثیت بیوی، ماں، بہن، بیٹی اور ایک قابل قدر مثالی خاتون کی طرح اپنی ذمہ داری ادا کرنے میں مدد و معاون ہو جو ہمارے معاشرے کے نصف حصہ کی نمائندگی کرتی ہے اور ہمارے ملک کی فلاح و بہبود اور عروج وارتقا میں اپنانا قابل فراموش کارنامہ انجام دیتی ہے۔

صحابیات رسول رضی اللہ عنہن اپنے ذمہ داریوں سے بحسن وخوبی واقف تھیں اور حصول علم کی راہ میں اصحاب رسول رضی اللہ عنہم سے مقابلہ و مسابقہ کرتی تھیں، وہ علمی حلقات اور مذہبی جلوس میں شرکت فرماتی تھیں اور آپ ﷺ سے اپنے دین کی حقیقت سمجھنے کے لیے درخواست کرتی تھیں۔ چنانچہ جب ایک عورت نبی ﷺ کے پاس آئی اور بولی: "اے اللہ کے رسول! محض مردوں ہی کو آپ کی پند و نصیحت سے فائدہ ہو رہا ہے، برائے مہربانی ہمارے لیے بھی کچھ وقت وقف کیجیے، کسی ایسے دن کا انتخاب کیجیے جس میں ہم آپ کے پاس آ سکیں، تاکہ آپ ہمیں وہ چیزیں سکھلا دیں جن کے ساتھ اللہ نے آپ کو مبعوث فرمایا ہے"، آپ ﷺ نے کہا: تم لوگ فلاں اور فلاں دن فلاں اور فلاں مقام پر اکٹھی ہو جاؤ"، وہ سب جمع ہوئیں اور آپ ﷺ تشریف لائے اور جو کچھ اللہ نے آپ ﷺ کو معلومات بہم پہنچائی تھی اس میں سے صحابیات رسول کو آپ نے سکھلایا، اور پھر گویا ہوئے: "تم میں سے کوئی بھی عورت جس نے اپنے تین بچوں کو کھو دی ہے وہ تینوں بچے اسے جہنم کی آگ کے لیے ڈھال بنیں گے"، ان میں سے ایک عورت نے کہا: "اے اللہ کے رسول! اگر اس کے دو بچے فوت ہوئے ہوں تو؟"، اس نے مسلسل دوبارہ یہ سوال پوچھا، جس پر آپ ﷺ نے کہا: "یہاں تک کہ دو، یہاں تک کہ دو، یہاں تک کہ دو"۔ ﴿صحیح بخاری ج ۸ کتاب الاعتصام بالکتاب والسنۃ ص ۱۴۹﴾ چنانچہ، ان صحابیات نے دین کی ٹھوس جانکاری حاصل کی اور کار خیر کی انجام دہی میں اس قدر پیش قدمی کرنے لگیں کہ عائشہ صدیقہؓ بطور تعجب بول پڑیں: "انصار کی عورتیں کتنی اچھی ہیں کہ شرم وحیا بھی حصول علم دین میں مانع نہ ہو سکی"۔ ﴿صحیح بخاری ج ۱ کتاب العلم باب الحیاء ص ۴۱﴾ ان عورتوں نے مذہب سے متعلق ہر طرح کے سوالات آپ ﷺ سے کیے، حتی کہ مسائل نسواں سے متعلق چھوٹے اور بڑے امور پر بھی آپ ﷺ سے سوالات کرتی تھیں۔ حضرت عائشہؓ سے مروی ہے، کہتی ہیں: "ایک عورت نے آپ ﷺ سے حالت حیض سے فراغت

کے بعد غسل کے متعلق سوال کیا، آپ ﷺ نے پوری تفصیل کے ساتھ طریقہ غسل کو واضح کیا"۔ علامہ ابن حجر کا کہنا ہے: "آپ ﷺ کے اس طرح کے مسائل پر تبادلہ خیال کرنے کی طرز عمل سے یہ حقیقت طشت از بام ہوتی ہے کہ ایک عورت کو کسی تعلیم یافتہ شخص سے دین سے متعلق سوال کرنے کی اجازت ہے، گرچہ وہ مسئلہ عورتوں کے مخفی امور ہی سے کیوں نہ تعلق رکھتا ہو، اور عائشہ صدیقہؓ نے آپ ﷺ سے دین سیکھا اور عورتوں کو سکھانے کے منصب پر فائز ہوئیں"۔ ﴿فتح الباری بشرح صحیح البخاری ج ا کتاب الحیض ص ۴۱۷﴾

مزید بر آں، آپ ﷺ صحابیاتؓ کو حلقہ علم اور دانشگاہ تربیت میں شرکت کی ترغیب دیتے تھے تا کہ وہ زیادہ سے زیادہ آپ ﷺ کی فراہم کردہ معلومات سے مستفیض ہو سکیں، آپ ﷺ انہیں نماز عید کے لیے باہر نکلنے کا حکم بھی دیتے تھے، اور ہر اہم خطبات و دروس کو سننے کی تلقین بھی کرتے تھے جسے آپ ﷺ ان اہم مواقع پر دیا کرتے تھے۔ حضرت حفصہؓ سے مروی ہے، کہتی ہیں: "ہم نوجوان عورتوں کو عیدین کی نماز سے روکتے تھے، ایک عورت آئی اور بنی خلف کے محل میں بیٹھ گئی اور اپنی بہن کے بارے میں بتلانے لگی جس کے شوہر آپ ﷺ کے ساتھ بارہ جنگوں میں شریک ہوئے تھے، اور اس کی بہن اپنے شوہر کے ساتھ ان جنگوں میں سے چھ میں شریک رہی تھی، اس عورت کی بہن بولی: "ہم زخمیوں کا علاج کرتے تھے، مریضوں کی تیمارداری کرتے تھے، اور ایک بار میں نے آپ ﷺ سے پوچھا: "کیا کسی عورت کے لیے گناہ کی بات ہے کہ وہ گھروں میں ٹھہری رہے جب اس کے پاس پہننے کے لیے کوئی مناسب کپڑا نہ ہو؟"، آپ ﷺ نے فرمایا: "اسے خود کو اپنی سہیلیوں کی چادر سے ڈھک لینا چاہیے، اور اچھے کاموں میں شرکت کرنی چاہیے، اور مسلمانوں کے مذہبی جلوس کا حصہ بننا چاہیے"، جب ام عطیہؓ آئیں، تو میں نے ان سے دریافت کیا کہ کیا اللہ کے رسول ﷺ سے آپ نے یہ بات سنی ہے تو انہوں نے اثبات میں جواب دیا"۔ ﴿حوالہ سابق﴾

یہی وجہ ہے کہ آپ ﷺ نے عورتوں کو مذہبی اجتماعات اور دینی جلوس میں شرکت سے مستثنیٰ نہیں قرار دیا، گرچہ انہیں چادر کی عدم دستیابی میں اپنی سہیلیوں ہی کا سہارا کیوں نہ لینا پڑے، کیونکہ آپ ﷺ نہیں چاہتے تھے کہ عورتیں دینی معلومات اخذ کرنے میں پیچھے رہیں، چنانچہ مسلم عورتیں اپنی ذمہ داری اور فرائض سے بدرجہ اتم آشنا تھیں، اور اپنے دین کی حقیقت جاننے اور بتلانے کے لیے پر عزم اور کوشاں تھیں۔

چودھواں باب

اسلام میں بیوی کے فرائض اور اس کی ذمہ داریاں

اسلام ایسی ازدواجی زندگی کا حامی ہے جس میں شوہر و بیوی کی زندگی نہایت پر سکون، خوشگوار اور کامیابی سے ہمکنار ہو، جس کی بنیاد باہمی تعاون پر رکھی گئی ہو۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ خاندان جتنے زیادہ مضبوط و مستحکم ہوں گے پوری قوم اتنی ہی زیادہ آپس میں متحد اور مضبوط ہو گی، کیونکہ ایک مستحکم و صحت مند معاشرہ کی تعمیر میں خاندان ہی کو مرکزیت حاصل ہے۔ اسی وجہ سے اسلام نے خاندان کے استحکام و مضبوطی کو خصوصی اہمیت دی ہے اور خاندان کی چہار دیواری کے اندر جنم لینے والے مسائل کو بہت خوش اسلوبی و حکمت کے ساتھ حل کیا ہے۔ اسلام میں ازدواجی زندگی کے مقاصد مندرجہ ذیل ہیں:

(ا) سکون اور باہمی محبت و ہمدردی کا حصول:

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "و من آیاتہ أن خلق لکم من أنفسکم أزواجا لتسکنوا إلیھا و جعل بینکم مودّۃ و رحمۃ إن فی ذٰلک لآیات لقوم یتفکرون" (الروم / ۲۱) (ترجمہ: اور اس کی نشانیوں میں سے ہے کہ تمہاری ہی جنس سے بیویاں پیدا کیں تاکہ تم ان سے آرام پاؤ، اس نے تمہارے درمیان محبت اور ہمدردی قائم کر دی، یقیناً غور و فکر کرنے والوں کے لیے اس میں بہت سی نشانیاں ہیں)

دوسری جگہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "ھو الذی خلقکم من نفس واحدۃ و جعل منھا زوجھا لیسکن إلیھا" (الأعراف / ۱۸۹) (ترجمہ: وہ اللہ تعالیٰ ایسا ہے جس نے تم کو ایک تن واحد سے پیدا کیا اور اسی سے اس کا جوڑا بنایا تاکہ وہ اپنے اس جوڑے سے انس حاصل کرے) اس آیت کی تشریح کرتے ہوئے ابن کثیر کہتے ہیں: "اللہ تعالیٰ نے انسان کے لیے اس کا جوڑا اس لیے پیدا کیا تاکہ وہ اس کے ذریعہ سکون پائے اور باہمی الفت و محبت کے احساس میں ڈوب جائے۔ یہی وجہ ہے کہ جو الفت و محبت شوہر و بیوی کے درمیان ہوتی ہے ویسی محبت کسی بھی دو روحوں کے درمیان نہیں ہوتی ہے۔[1]

قرآن مجید نے شوہر وبیوی کے باہمی رشتہ کو بیان کرنے کے لیے بہت ہی خوبصورت تعبیر کا استعمال کیا ہے جس سے اس رشتہ کے عظیم انسانی معنی و مفہوم کی وضاحت ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے زن و شوہر کے تعلق سے یہ بات کہی ہے: "هن لباس لكم و أنتم لباس لهن" (البقرة/۱۸۷) (ترجمہ: وہ تمہارا لباس ہیں اور تم ان کے لباس ہو) اس آیت میں یہ بتایا گیا ہے کہ شوہر و بیوی ایک دوسرے کے لیے لباس کی طرح ہیں۔

"لباس ایک ایسی چیز ہے جو انسان کے جسم سے بالکل متصل ہوتا ہے، لباس اور انسانی جسم کے درمیان کوئی چیز حائل نہیں ہوتی ہے، لباس انسانی جسم کی ستر پوشی کے ساتھ اسے مضرت رساں خارجی عوامل و اثرات سے بچاتا ہے۔ آیت میں زوجین کو ایک دوسرے کا لباس اس لیے کہا گیا ہے تاکہ زوجین کے باہمی تعلقات معنوی طور پر ویسے ہی ہوں جیسے کہ لباس اور جسم کا رشتہ ہوتا ہے۔ یعنی شوہر و بیوی دل اور روح ہر اعتبار سے ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہوں، دونوں ایک دوسرے کی پردہ پوشی کریں، دونوں ان عوامل و اسباب سے ایک دوسرے کی حفاظت کریں جو اخلاقی فساد و بگاڑ کا سبب بن سکتے ہوں اور عزت و ناموس کو داغدار کر سکتے ہوں۔ دو افراد کی آپسی محبت و ہمدردی کا یہی تقاضا بھی ہے۔"[۲]

(۲) پاکدامنی اور جنسی تسکین کا حصول:

شوہر و بیوی کے رشتہ ءازدواج سے منسلک کا مقصد ہی یہی ہے تاکہ دونوں ایک ساتھ رہ کر زندگی کے لمحات گزاریں اور ایک ساتھ رہتے ہوئے شریعت کے دائرہ کے اندر اپنی فطری جنسی خواہشات کی تکمیل بھی کریں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: "اے نوجوانوں کی جماعت! تم میں سے جو شخص بیوی کے مہر و نفقہ کا بوجھ اٹھانے کی استطاعت رکھتا ہے وہ شادی کرے، اس لیے کہ اس کی وجہ سے نگاہیں نیچی رہتی ہیں اور شرمگاہ کی حفاظت ہوتی ہے اور جو شخص اس کی سکت نہ رکھتا ہو اسے روزہ رکھنا چاہیے، اس لیے کہ اس سے جنسی خواہشات کا زور ٹوٹتا ہے۔"[۳]

(۳) حصول اولاد اور افزائش وبقائے نسل انسانی:

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "و الله جعل لكم من أنفسكم أزواجا و جعل لكم من أزواجكم بنين و حفدة" (النحل/۷۲) (ترجمہ: اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے تم میں سے ہی تمہاری بیویاں پیدا کیں اور تمہاری بیویوں سے تمہارے لیے تمہارے

بیٹے اور پوتے پیدا کیے) اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو بیٹے اور پوتے عطا کر کے ان پر احسان کیا۔ انسانوں کے لیے آل و اولاد ایک ایسی نعمت ہے جس پر رب ذوالجلال کا جتنا بھی شکر ادا کیا جائے کم ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: "تم بہت محبت کرنے والی اور بہت زیادہ بچے جننے والی عورت سے شادی کرو، اس لیے کہ میں تمہاری کثرت تعداد کی وجہ سے دیگر انبیائے کرام کی امتوں سے آگے نکل جاؤں گا۔[۴]" اس حدیث کی روشنی میں امت مسلمہ کی کثرت تعداد شادی کا ایک اہم و بنیادی مقصد قرار پاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے رشتۂ ازدواج کے ان تینوں مقاصد کے حصول کے لیے شوہر و بیوی کو ان کے باہمی حقوق کے ساتھ دونوں کو الگ الگ کچھ ذمہ داریاں بھی دی ہیں۔ "ذمہ داریوں کی مناسبت سے حقوق" کے اصول کے تحت انہیں یہ ذمہ داریاں دی گئی ہیں تاکہ وہ ایک دوسرے کے ساتھ آپسی مفاہمت اور ہم آہنگی کے ساتھ زندگی گزار سکیں۔ اسلام میں بیوی کی کچھ ذمہ داریاں مندرجہ ذیل ہیں:

پہلی ذمہ داری: شوہر کی مکمل اطاعت اور اس کے جان و مال کی حفاظت

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "فالصالحات قانتات حافظات للغيب بما حفظ الله" (النساء/۳۴) (ترجمہ: فرمانبردار عورتیں خاوند کی عدم موجودگی میں بہ حفاظت الٰہی نگہداشت رکھنے والیاں ہیں) اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں نیک بیویوں کی صفات یہ بتائی ہیں کہ وہ اپنے شوہروں کی فرمانبردار اور ان کے جان و مال کی حفاظت کرنے والی ہوتی ہیں۔ اس سلسلہ میں سدی اور دیگر مفسرین کا قول ہے کہ اس سے وہ بیویاں مراد ہیں جو شوہر کی غیر موجودگی میں اپنی عزت و آبرو اور شوہر کے مال کی حفاظت کرنے والی ہوں۔[۵]

سید قطب اس آیت کی تفسیر میں کہتے ہیں: "آیت میں لفظ "قنوت" استعمال ہوا ہے جس کے معنی ہیں ارادہ، توجہ، رغبت اور چاہت کے ساتھ اطاعت کرنا، جس میں سختی، مجبوری اور زبردستی کا پہلو بالکل نہ ہو۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے ایسی فرمانبردار بیویوں کو "قانتات" کہا ہے، انہیں "طائعات" نہیں کہا ہے۔ ایک جان کے دو قالبوں کے درمیان جو سکون و اطمینان، محبت و مودت اور ستر پوشی و حفاظت مطلوب ہے اس کے لیے ایسی ہی بے لوث اطاعت کی ضرورت ہوتی ہے۔ نیک اور مومنہ خاتون کی فطرت میں یہ بات شامل ہوتی ہے کہ وہ اپنے اور شوہر کے درمیان قائم شادی کے مقدس بندھن کی حرمت کی ہر لمحہ حفاظت کرتی ہے، چاہے شوہر اس کے آس پاس موجود ہو یا اس سے کوسوں دور ہو۔"

سنن نسائی میں ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت نقل کی گئی ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا گیا: کون سی عورت سب سے بہتر ہے؟ آپ نے فرمایا: وہ عورت سب سے اچھی ہے جس کا شوہر اسے دیکھے تو اسے خوش کر دے، اسے حکم دے تو اس کی اطاعت کرے اور اس کی جان و مال میں شوہر کو جو بات ناپسند ہو اسے انجام دینے سے باز رہے[٦]۔ اس اعتبار سے بیوی کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ تمام جائز و مباح کاموں میں شوہر کی مکمل اطاعت کرے۔ البتہ اگر شوہر کسی ناجائز کام کو کرنے کا حکم دے جس سے اللہ تعالیٰ کی ناراضگی حاصل ہوتی ہو تو وہ اس غیر شرعی کام کو کرنے کے لیے شوہر کی بات نہ مانے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: ”معصیت کے کاموں میں کسی کی اطاعت نہیں کی جائے گی، اطاعت صرف اچھے اور جائز کاموں میں ہے۔“[٧]

امام ابن حجر صحیح بخاری کے باب ”معصیت کے کاموں میں بیوی شوہر کی اطاعت نہیں کرے گی“ کے تحت کہتے ہیں: ”پہلے یہ بات کہی گئی کہ بیوی کے لیے شوہر کی ہر بات کو ماننا ضروری ہے، اس کے بعد یہ تخصیص کی گئی کہ شوہر کے صرف اسی حکم کی تعمیل کی جائے گی جس میں اللہ تعالیٰ کی معصیت و نافرمانی نہ ہو۔ اگر شوہر معصیت کے کام کا حکم دیتا ہے تو بیوی کے لیے ضروری ہے کہ وہ اس پر عمل نہ کرے۔“[٨]

بیوی کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ شوہر کے مال اور اس کی رکھی ہوئی امانت کی حفاظت کرے، اس نے اپنا جو مال اور عیال اس کے حوالہ کر رکھا ہے اس کی حفاظت کو یقینی بنائے اور ایمانداری کے ساتھ ان کی نگرانی و نگہبانی کرے۔ عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”تم میں سے ہر شخص نگراں و نگہبان ہے اور اپنے ماتحتوں کے بارے میں جواب دہ ہے، امیر بھی (اپنی رعایا کا) نگراں و نگہبان ہے، مرد اپنے گھر والوں کا نگراں ہے، عورت اپنے شوہر کے گھر اور اس کے بچوں کی نگراں ہے، تم سب لوگ نگراں و نگہبان ہو اور تم سے تمہارے ماتحتوں کے بارے میں پوچھا جائے گا۔“[٩]

اس حدیث شریف کی رو سے اولاد کی پرورش اور تعلیم و تربیت، خانگی امور کی انجام دہی، خدام و خادماؤں سمیت گھریلو امور کے دائرہ میں جو چیزیں بھی آتی ہیں سب کی دیکھ بھال و نگرانی و اصلاح بیوی کی ذمہ داریوں میں شامل ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: ”اللہ تعالیٰ ہر ذمہ دار و نگراں سے ان امور کے بارے میں سوال کرے گا جس کی ذمہ داری اس کے سپرد کی ہے۔“[١٠]

بیوی کو شوہر کی اطاعت کا پابند اس لیے بنایا گیا ہے کہ شوہر کو بیوی کا سرپرست مقرر کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "الرجال قوامون علی النساء بما فضّل اللہ بعضھم علی بعض و بما أنفقوا من أموالھم" (النساء/۳۴) (ترجمہ: مرد عورتوں پر حاکم ہیں اس وجہ سے کہ اللہ تعالیٰ نے ایک کو دوسرے پر فضیلت دی ہے اور اس وجہ سے کہ مردوں نے اپنے مال خرچ کیے ہیں)

اس آیت میں مذکور حکم الٰہی کی رو سے شوہر اپنی بیوی کا "قوّام" یعنی سرپرست اس معنی میں ہے کہ وہ اس کی ساری ضروریات پوری کرتا ہے اور اس کی جان و مال اور عزت و آبرو کی حفاظت کرتا ہے۔ لیکن اہل خانہ کی سرپرستی و قیادت مرد کے ذمہ دینے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ بیوی کے اوپر مطلق العنان حاکم ہے۔ اس کے برخلاف اسلام نے اس بات کی تاکید کی ہے کہ خانگی امور سے متعلق فیصلے لینے میں بیوی کے ساتھ مشاورت اور آپس کی باہمی رضامندی کا خیال رکھنا شوہر کے لیے ضروری ہے۔ اس آیت میں شوہر کو حاکمیت اور سرپرستی کا حق دینے کی وجہ بھی بتائی گئی ہے اور وہ ہے اہل خانہ کے اوپر اس کا مال خرچ کرنا اور گھر کے تمام افراد کی ضروریات پوری کرنے کی ذمہ داری۔ مرد ہمیشہ اپنے ماتحتوں کے نان و نفقہ کی ذمہ داری اٹھاتے ہیں اور دشمنوں کے حملہ سے اپنے اہل و عیال اور پورے خاندان کی حفاظت کرتے ہیں، باپ اپنی بیٹیوں کی نگہبانی اور تحفظ کا فریضہ انجام دیتے ہیں، شوہر اپنی بیوی کے جان و مال اور عزت و آبرو کی حفاظت کی ذمہ داری ادا کرتے ہیں۔ اس اعتبار سے مردوں کو جو حاکمیت و سرپرستی عطا کی گئی ہے اس میں عورتوں کی حق تلفی نہیں ہے جیسا کہ آج بہت سی عورتیں سمجھتی ہیں۔ یہ اصلاً ذمہ داری کا ایک بوجھ ہے جو مردوں کے سر ڈالا گیا ہے، نہ کہ خصوصی مراعات جس کی وجہ سے عورتوں کے حقوق کی ان دیکھی ہوتی ہو۔ حقوق اور ذمہ داریوں کا یہ نظام اس شرعی اصول و ضابطہ کے تحت بنایا گیا ہے کہ "جیسی ذمہ داریاں ہوں گی اسی کے حساب سے فوائد و منافع حاصل ہوں گے۔" علاوہ ازیں مردوں اور عورتوں کی جداگانہ ذہنی و جسمانی ساخت کو بھی مد نظر رکھتے ہوئے مرد کو خاندان کی قیادت و سرپرستی کے لیے موزوں قرار دیا گیا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ اولاد باپ کی طرف منسوب ہوتی ہے۔ وہی ان کے تمام اخراجات اور خوراک و لباس کی فراہمی کا ذمہ دار ہوتا ہے۔ وہی گھر کا مالک ہوتا ہے، رہائش کا انتظام کرنے اور اس کے اخراجات اٹھانے کی ذمہ داری اسی کے سر ہوتی ہے۔ مکان اور مکین کی حفاظت کا ذمہ دار بھی وہی ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ نے اس کے لیے اسے طاقت و قوت اور

جسمانی خصوصیات سے نوازا ہے جو اس کے مضبوط دست و بازو اور جسمانی صلابت و سختی کی صورت میں اسے صنف نسواں سے ممتاز کرتی ہے۔ اس کی وجہ سے اسے اپنی جان و مال اور اہل و عیال کا دفاع کرنے کی قدرت حاصل ہوتی ہے۔ مرد کی قوامیت اہل خانہ پر محض سرداری کا حصول نہیں ہے، بلکہ یہ سرداری اسی صورت میں اس کی قوامیت کہلاتی ہے جبکہ وہ اپنے ماتحتوں کی مناسب دیکھ بھال و حفاظت اور ان کے حقوق کو ادا کرنے کی اپنی ذمہ داری کو انصاف اور ایمان داری کے ساتھ ادا کرتا ہو۔

اللہ تعالیٰ نے پہلے اپنے اس علم کے ذریعہ جو کائنات کے ذرہ ذرہ کو محیط ہے مرد و عورت کی فطری صلاحیتوں کو سامنے رکھا اور اس کے بعد اس نے مرد کو عورت پر قوّام بنایا کیونکہ اس کے اندر سرداری و سرپرستی کی ذمہ داری ادا کرنے کی صلاحیت موجود تھی۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ”ألا يعلم من خلق و هو اللطيف الخبير“ (الملک/ ۱۴) (ترجمہ: کیا اسے ہی علم نہ ہوگا جس نے پیدا کیا ہے؟ جبکہ وہ باریک بین اور باخبر بھی ہے)

بہت سے مسلمان مردوں اور عورتوں نے ”قوامیت“ کا صحیح مفہوم سمجھنے میں غلطی کی ہے۔ مرد نے اس کا وہ مطلب سمجھا جو اسلامی نقطۂ نظر سے صحیح نہیں ہے، اسی وجہ سے عورت نے مرد کو خود ساختہ مطلب کے اعتبار سے ”قوّام“ ماننے ہی سے انکار کر دیا۔ جب عورت نے مرد کو خود ساختہ مفہوم کے اعتبار سے قوامیت کا حق نہیں دیا تو اس طرح عورت نے اپنے فرائض و ذمہ داریوں سے بھی راہ فرار اختیار کیا اور اسے ضائع کر دیا۔ اسی وجہ سے یہاں پر میرے لیے یہ ضروری ہو جاتا ہے کہ ہم ان بنیادوں کو واضح کر دیں جن پر اسلام میں خاندان کی عمارت تعمیر ہوتی ہے۔ اور لوگ ”قوامیت“ کے اس معنی و مفہوم کو سمجھ لیں جو اللہ تعالیٰ کے منشا و مرضی کے مطابق ہے۔ پھر مسلمان خواتین خوشدلی کے ساتھ مردوں کی ”قوامیت“ کو قبول کر لیں اور اپنے فرائض و ذمہ داری کو برضا و رغبت باہمی محبت و احترام کے ماحول میں ادا کریں تاکہ ایک مثالی اسلامی معاشرہ کی تشکیل کا خواب شرمندۂ تعبیر ہو سکے۔

اسلام میں جن بنیادوں پر خاندان کی عمارت تعمیر ہوتی ہے انہیں ذیل میں ذکر کیا جارہا ہے۔

پہلی بنیاد: مساوات

اللہ تعالیٰ نے جس طرح مردوں اور عورتوں کی ذمہ داریاں طے کی ہیں اسی طرح اس نے ان ذمہ داریوں کے بالمقابل ان کے حقوق بھی متعین کر دیئے ہیں تاکہ بنی نوع انسان کی دونوں صنفوں کے دلوں میں اللہ تعالیٰ کے نظام

عدل و انصاف کا احساس و شعور موجود رہے اور دونوں ایک پر سکون و مثالی معاشرہ کی تشکیل کے لیے اپنی اپنی قربانیاں پیش کر سکیں اور دونوں خوش و خرم رہ کر مکمل تال میل اور ہم آہنگی کے ساتھ زندگی بسر کر سکیں۔ اللہ تعالیٰ نے مردوں اور عورتوں کے حقوق و واجبات کو اس آیت کریمہ میں بڑی جامعیت کے ساتھ بیان کر دیا ہے: "و لهن مثل الذی علیهن بالمعروف" (البقرۃ/۲۲۸)(ترجمہ: اور عورتوں کے بھی ویسے ہی حق ہیں جیسے ان پر مردوں کے ہیں، اچھائی کے ساتھ)

امام قرطبی اس آیت کی تفسیر میں کہتے ہیں: "شوہروں پر بیویوں کے ویسے ہی ازدواجی حقوق ہیں جیسے کہ شوہروں کے بیوی کے اوپر ہیں، اسی لیے عبد اللہ ابن عباس رضی اللہ عنہ کا قول ہے: میں اپنی بیوی کے لیے زیب و زینت اختیار کرتا ہوں جس طرح وہ میرے لیے آرائش و زیبائش کا اہتمام کرتی ہے۔ میں اپنی بیوی سے اپنے تمام حقوق وصول کرنے کی کوشش نہیں کرتا ہوں ورنہ پھر مجھے بھی اس کے سارے حقوق ادا کرنے ہوں گے، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کا تو یہی ارشاد ہے کہ "بیویوں کے شوہروں پر بھی ویسے ہی حقوق ہیں جیسے کہ شوہروں کے بیویوں کے اوپر ہیں، یعنی ایسی زیب و زینت اختیار کرنا جو گناہ کے دائرہ میں نہ ہو۔ عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کا یہ قول بھی ہے کہ "اللہ تعالیٰ نے جس طرح بیویوں پر شوہروں کی اطاعت واجب کی ہے اسی طرح ان کو یہ حق بھی دیا ہے کہ شوہر ان کے ساتھ زندگی گزارنے میں حسن معاشرت کا نمونہ پیش کریں۔"[11]

اس آیت کی تشریح کرتے ہوئے محمد عزۃ دروزہ کہتے ہیں: "اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ شوہر جن مشروع چیزوں کا بیوی سے مطالبہ کرنے کا حق رکھتا ہے اور جس اچھے برتاؤ کی وہ بیوی سے توقع رکھتا ہے بیوی کو بھی اپنے شوہر سے ان تمام چیزوں اور حسن سلوک کا مطالبہ کرنے کا حق حاصل ہے مثلاً اطاعت و فرمانبرداری، امانت داری، عفت و پاکدامنی، اخلاص و خیر خواہی، حسن معاشرت، باہمی محبت و احترام، اعتماد و عزت افزائی، حسن سلوک و دل لگی، مزاج اور مصلحت کی رعایت، ضروریات کی تکمیل اور باہمی رسہ کشی، تشدد، بدکلامی، اذیت رسانی، بد خلقی، تکبر، اجبار، توہین آمیز سلوک سے پرہیز اور ایک دوسرے کو ایسے کام کے لیے مکلف کرنا جو استطاعت سے باہر ہو۔"[12]

یہ شوہر و بیوی کے درمیان مساوات کا بنیادی اصول ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس آیت کے فوراً بعد یہ بھی ارشاد فرمایا ہے: "و للرجال علیهن درجة" (البقرۃ/۲۲۸)(ترجمہ: ہاں مردوں کو عورتوں پر فضیلت ہے) اس سے یہ مفہوم نکلتا ہے کہ شوہر و بیوی کے حقوق کی تعیین میں امتیاز اور جانبداری برتی گئی ہے، اگر ایسا ہی ہو تو پھر یہ آیت کے پہلے حصہ "و لهن

مثل الذی علیهن بالمعروف" (البقرۃ/۲۲۸)(ترجمہ: اور عورتوں کے بھی ویسے ہی حقوق ہیں جیسے ان پر مردوں کے ہیں اچھائی کے ساتھ) کے برخلاف ہوگا، اس لیے صحیح بات یہ ہے کہ یہاں پر "درجۃ" سے مراد قوامیت ہے یعنی بیوی اور اہل وعیال کے اخراجات مہیا کرنے اور انہیں تحفظ عطا کرنے کی ذمہ داری۔ اس کی وضاحت اوپر کی سطور میں کی جاچکی ہے۔ واللہ اعلم۔

دوسری بنیاد: باہمی رضامندی اور مشاورت

شوہر اور بیوی کے باہمی رشتہ کی بنیاد باہمی مشاورت پر ہے۔ اسلام مرد وعورت کے درمیان اس طرح کے رشتہ کو قبول نہیں کرتا ہے جس میں کسی ایک کے پاس لامحدود اختیارات ہوں اور وہ دوسرے کے ساتھ تحکمانہ انداز میں برتاؤ کرے۔ ازدواجی رشتہ میں اس طرح کی مطلق العنانیت اسلام کو پسند نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ایک اچھے مومن کی صفت کے طور پر اس بات کا تذکرہ کیا ہے کہ "و أمرهم شوری بينهم" (الشوری/۳۸)(ترجمہ: اور ان کا ہر کام آپس کے مشورہ سے ہوتا ہے) قرآن مجید میں اس بات کی وضاحت کر دی گئی ہے کہ شوہر وبیوی سے متعلق کسی بھی معاملہ میں آخری فیصلہ دونوں کے درمیان باہمی مشاورت کے بعد ہی ہونا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "فإن أرادا فصالاً عن تراض منهما و تشاور فلا جناح عليهما" (البقرۃ/۲۳۳) (ترجمہ: اگر دونوں (یعنی ماں باپ) اپنی رضامندی اور باہمی مشورے سے دودھ چھڑانا چاہیں تو دونوں پر کچھ گناہ نہیں) اس آیت میں مطلقہ عورت کا حکم بیان کیا گیا ہے جو کہ اپنے بچہ کو دودھ پلا رہی ہو۔ بچہ کے مفاد کو دھیان میں رکھ کر جب مطلقہ عورت کو یہ حق دیا گیا ہے کہ اس کا سابق شوہر بچہ کا دودھ چھڑانے کے معاملہ میں اس کے ساتھ مشورہ کرے اور پھر دونوں باہمی رضامندی سے ایک مناسب فیصلہ کریں تو پھر وہ بیوی جو ابھی رشتۂ ازدواج میں منسلک ہے اور شوہر کے گھر کے اندر تمام خانگی امور کی ذمہ داری سنبھالے ہوئے ہے اسے بدرجہ اولیٰ یہ حق ہوگا کہ خانگی امور میں اس کے ساتھ صلاح ومشورہ کیا جائے اور گھریلو معاملات میں اس کی رضامندی کا بھی خیال رکھا جائے۔

تیسری بنیاد: اچھا برتاؤ

قرآن مجید نے شوہر وبیوی کے آپسی برتاؤ کو "تعامل بالمعروف" کا نام دیا ہے یعنی دونوں کے لیے ضروری ہے کہ وہ ایک دوسرے کے ساتھ خیر خواہی اور اعلیٰ ظرفی کا مظاہرہ کریں۔ اس لیے کہ تمام انسانی معاملات کی اصل خوبی یہ

ہوتی ہے کہ اس میں عمدگی، خیر خواہی اور نیک نیتی کا خیال رکھا جائے۔ قرآن مجید میں اس کے لیے کئی بار "المعروف" کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "و ائتمروا بینکم بمعروف" (الطلاق/٦)(ترجمہ: اور باہم مناسب طور پر مشورہ کر لیا کرو) ابن کثیر اس آیت کی تشریح کرتے ہوئے کہتے ہیں: "تمہارے باہمی امور و معاملات اچھے ڈھنگ سے طے پانا چاہیے جس میں کسی فریق کو کوئی نقصان و خسارہ نہ ہو۔"[۱۳]

ایک دوسری جگہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "و عاشروھن بالمعروف" (النساء/۱۹)(ترجمہ: ان کے ساتھ اچھے طریقہ سے بود و باش رکھو) ابن کثیر اس آیت کی تشریح کرتے ہوئے کہتے ہیں: "تم اچھے انداز میں ان سے بات کرو اور جہاں تک ممکن ہو ان کے ساتھ نرمی و مہربانی سے پیش آؤ اور اپنے حلیہ کو بھی درست رکھو جیسا کہ تمہاری خواہش ہوتی ہے کہ تمہاری بیویاں تمہارے سامنے سج سنور کر رہا کریں۔"[۱۴]

مختصر یہ کہ اسلامی معاشرہ میں ہر رشتہ ازدواج کی بنیاد ان تین اصول وضوابط پر ہونی چاہیے جو اوپر ذکر کیے گئے ہیں۔ اور گھر کے اخراجات کا بوجھ شوہر کو خوشدلی کے ساتھ اٹھانا چاہیے تاکہ گھر کے اندر کسی طرح کا کوئی اختلاف اور ناچاقی پیدا نہ ہو اور پورے معاشرہ میں امن سکون اور باہمی تال میل و ہم آہنگی کی فضا برقرار رہے۔

بیوی کی دوسری اہم ذمہ داری: شوہر کی جنسی خواہش کی تکمیل

دوسرے الفاظ میں شوہر کی جنسی ضروریات کی تکمیل بیوی کی اہم ذمہ داریوں میں شامل ہے۔ بیوی کسی معقول عذر یا کسی شرعی رکاوٹ کے بغیر شوہر کو جنسی آسودگی سے ہمکنار کرنے سے انکار نہیں کر سکتی ہے۔ متعدد احادیث میں مسلم خواتین کو متنبہ کیا گیا ہے کہ وہ شوہروں کے جنسی حقوق کی ادائیگی میں کوتاہی کر کے اپنے سر پر گناہ کا بوجھ نہ لیں۔ ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "جب کوئی عورت اپنے شوہر کے بستر سے الگ ہو کر رات گزارتی ہے تو فرشتے صبح تک اس پر لعنت بھیجتے ہیں۔[۱۵]" ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی ایک دوسری روایت میں منقول ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "جب مرد اپنی بیوی کو اپنے بستر پر آنے کے لیے کہتا ہے اور وہ آنے سے انکار کر دیتی ہے تو فرشتے اس عورت پر صبح تک لعنت بھیجتے ہیں۔"[۱٦]

ان ہی اسباب کی بناء پر عورتوں کے لیے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ ہدایت ہے کہ "اگر کسی خاتون کا شوہر گھر میں موجود ہو تو وہ اس کی اجازت کے بغیر نفلی روزہ نہ رکھے۔" کیونکہ اس صورت میں شوہر کو جب جماع کی

خواہش ہوگی تو بیوی اس کے اس حق کو ادا کرنے سے قاصر رہے گی۔ شرعی طور پر بیویوں کو شوہر کے اس حق کی ادائیگی کی خصوصی تاکید کی گئی ہے، اس لیے مرد کی جنسی خواہش کی تکمیل شادی کے بنیادی مقاصد میں سے ایک ہے اور شوہر کے اس حق کی ادائیگی بیوی کی ایک اہم ذمہ داری ہے۔ اسی طرح اسلامی شریعت نے عورتوں کے جنسی حقوق کو بھی نظر انداز نہیں کیا ہے، کیونکہ بسا اوقات مردوں سے اس حق کی ادائیگی میں کوتاہی ہوتی ہے۔ عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اے عبداللہ! کیا مجھے یہ بات معلوم نہیں ہوئی ہے کہ تم دن میں روزہ رکھتے ہو اور رات میں نماز پڑھنے میں مشغول رہتے ہو؟" میں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! آپ کو بالکل صحیح خبر پہنچی ہے۔ آپ نے فرمایا: "تم ایسا نہ کرو، کسی دن روزہ رکھو اور کسی دن روزہ چھوڑ دو، رات میں نماز بھی پڑھو اور آرام بھی کرو، بیشک تمہارے جسم کا بھی تمہارے اوپر حق ہے، تمہاری آنکھ کا بھی تم پر حق ہے اور تمہاری بیوی کا بھی تم پر حق ہے۔"۱۷

حافظ ابن حجر نے اس حدیث کی تشریح کرتے ہوئے ابن بطال کا قول نقل کیا ہے کہ "جب پچھلے باب میں بیوی کے اوپر شوہر کے حق کو بیان کر دیا گیا تو اب اس باب میں شوہر کے اوپر بیوی کے حق کو واضح کر دیا گیا ہے اور تارک الدنیا قسم کے مردوں کو یہ تنبیہ کی گئی ہے کہ وہ نفلی عبادات میں اس قدر زیادہ مشغول نہ ہوں کہ بیوی کی جنسی ضرورت کی تکمیل اور اس کے لیے وسائل زندگی کی فراہمی میں کوتاہی کر بیٹھیں۔۱۸" نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کو نفلی عبادات میں مشغول رہ کر خود کو بہت زیادہ ہلکان کرنے سے منع فرمایا تا کہ وہ اپنی بیوی کے حقوق کو بھی بحسن وخوبی ادا کر سکیں، یہ مرد و عورت کے درمیان اسلامی شریعت کے عدل و انصاف کا بہترین نمونہ ہے۔

زوجین ایک دوسرے کا یہ حق برضا و رغبت ادا کریں، شارع حکیم نے اس کے لیے چند ترغیبات کا بھی اعلان کیا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: "تمہاری شرمگاہوں کے (حلال طریقہ سے استعمال) میں بھی صدقہ ہے، صحابہ کرام نے حیرت کا اظہار کرتے ہوئے دریافت کیا: ایک شخص (بیوی سے) اپنی جنسی خواہش پوری کرتا ہے، اس میں بھی اسے اجر ملتا ہے؟ آپ نے فرمایا: اگر وہ حرام طریقہ سے اپنی جنسی خواہش کی تکمیل کرتا تو کیا اسے گناہ نہیں ہوتا؟ جب اس نے حلال طریقہ سے اپنی ضرورت پوری کی تو اس کے لیے اسے اجر ملے گا۔" اس ترغیب کی حکمت یہ ہے کہ

زوجین میں سے ہر ایک دوسرے کو خوش اور مطمئن کرنے کی کوشش کرے اور اس آپسی لین دین میں بھی شکر واحسان مندی کا جذبہ کارفرما رہے۔

بیوی کی تیسری بنیادی ذمہ داری: شوہر کی اجازت کے بغیر کسی کو گھر میں آنے کی اجازت نہ دے

شوہر گھر کا مالک ہوتا ہے، گھر کے تمام افراد کے اخراجات کا بوجھ اٹھانے کی ذمہ داری اس کے سر ہوتی ہے، وہ سب کو تحفظ بھی دیتا ہے، اس لیے بیوی کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ گھر کے اندر باہر کے لوگوں کی آمد و رفت کے سلسلہ میں شوہر کی مرضی اور اس کے جذبات کا خیال رکھے۔ وہ کسی ایسے شخص کو گھر کے اندر نہ آنے دے جس کا گھر میں قدم رکھنا شوہر کو ناپسند ہو۔ حدیث نبوی میں اس تعلق سے حکم موجود ہے۔ عمرو بن احوص رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "تم لوگ اس بات سے آگاہ رہو کہ تمہاری بیویوں پر تمہارا حق ہے اور تم پر تمہاری بیویوں کا بھی حق ہے۔ تمہارا حق تمہاری بیویوں پر یہ ہے کہ جو شخص تمہیں ناپسند ہو اسے تمہارے بستر پر نہ آنے دے اور جن لوگوں کو تم ناپسند کرتے ہو ان کو تمہارے گھر کے اندر آنے کی اجازت نہ دے۔ اور تمہاری بیویوں کا تم پر یہ حق ہے کہ تم انہیں اچھا سے اچھا کھلاؤ اور اچھا سے اچھا پہناؤ۔"[19]

شوہر کے ساتھ بیوی کے حسن معاشرت کا تقاضہ یہ ہے کہ بیوی شوہر کی پسند و ناپسند کا خیال رکھے۔ جو کام شوہر کو پسند ہو وہ کرے اور جو ناپسند ہو اس سے دور رہے، تاکہ آپسی محبت و مفاہمت ہمیشہ برقرار رہے۔ کسی بھی ایسے شخص کو گھر کے اندر آنے کی اجازت نہ دے جس کا آنا شوہر کو ناپسند ہو۔

اوپر نقل کردہ حدیث شریف میں "فراش" کا لفظ استعمال ہوا ہے، اس سے ہر وہ چیز مراد ہے جو گھر میں اٹھنے، بیٹھنے کے لیے استعمال ہوتی ہو مثلاً قالین، کرسیاں، چٹائیاں اور تکیے وغیرہ۔

عام طور پر لفظ "فراش" سن کر سونے کے بستر کی طرف ذہن منتقل ہوتا ہے یا کسی مرد کے ساتھ ناجائز خلوت کی طرف بھی ذہن جاتا ہے۔ اس سلسلہ میں یہ واضح رہنا چاہیے کہ بیوی کے لیے یہ جائز ہی نہیں ہے کہ وہ کسی غیر محرم کو اپنے سونے کے بستر پر آنے کی اجازت دے، یا کسی غیر محرم کے ساتھ خلوت میں ملاقات کرے، اس معاملہ میں شوہر کی رضامندی و ناپسندیدگی کا بھی کوئی اعتبار نہیں ہے۔ اور شوہر گھر کے اندر موجود ہو یا گھر سے باہر ہو کسی بھی صورت

میں بیوی کے لیے ایسا کرنا جائز نہیں ہے۔ حدیث شریف میں لفظ "فراش" کے تحت جو بات کہی گئی ہے اس سے عمومی ضیافت یا عمومی ملاقات مراد ہے۔

امام نووی کہتے ہیں: اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ بیوی شوہر کی مرضی کے خلاف کسی کو بھی گھر میں آنے اور بیٹھنے کی اجازت نہیں دے گی، چاہے وہ کوئی اجنبی مرد ہو یا عورت ہو یا بیوی کا کوئی محرم ہو۔ یہ ممانعت سب کو شامل ہے۔ اس مسئلہ میں فقہاء کی بھی یہی رائے ہے کہ بیوی کسی بھی مرد یا عورت یا اپنے کسی محرم رشتہ دار کو شوہر کے گھر کے اندر آنے کی اجازت نہیں دے گی، سوائے اس کے جس کے بارے میں بیوی کو علم ہو کہ اس کا گھر میں آنا شوہر کو ناپسند نہیں ہے۔

بیوی کی چوتھی ذمہ داری: منظم، صاف ستھری حالت میں، خندہ پیشانی کے ساتھ اچھے حلیہ میں شوہر کے سامنے آئے

بیوی کی یہ ایک اہم ذمہ داری ہے جس کا خیال رکھنا اس کے لیے نہایت ضروری ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ و سلم نے ایک اچھی اور مثالی بیوی کی صفات بیان کرتے ہوئے فرمایا: "سب سے اچھی بیوی وہ ہے جس کی طرف اس کا شوہر نظر اٹھا کر دیکھے تو اسے خوش کر دے، شوہر جب اسے کوئی حکم دے تو اس کی تعمیل کرے اور اپنی ذات اور اپنے مال میں شوہر کی ناپسندیدگی کا خیال رکھے اور اس کی مرضی کے خلاف کوئی کام نہ کرے۔"[۲۰]

روز مرہ کے کاموں میں مشغول رہنے کی وجہ سے انسان کے جسم سے پسینہ خارج ہوتا ہے، اس کا جسم اور چہرہ دھول مٹی اور گرد و غبار سے اٹ جاتا ہے اور مختلف قسم کی بو اس کے جسم اور کپڑے میں سرایت کر جاتی ہے، جس کی وجہ سے اس کے جسم سے ناپسندیدہ بو خارج ہوتی ہے۔ اسی لیے اسلام نے مرد و عورت دونوں کو صاف ستھرا رہنے کی بہت زیادہ تاکید کی ہے اور دونوں کو خاص موقعوں پر اہتمام کے ساتھ غسل کرنے کا حکم دیا ہے، مثلاً جنسی مباشرت کے بعد اور عورتوں کو ایام حیض کے ختم ہونے کے بعد۔ علاوہ ازیں دن میں کم از کم پانچ مرتبہ وضو کرتے وقت چہرہ اور ہاتھ پاؤں کو دھونے کا بھی حکم دیا ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمان خواتین کو ہمیشہ صاف ستھرا رہنے کی تاکید کی ہے اور ایام حیض کے ختم ہونے پر حیض کے خون کی ناپسندیدہ بدبو کو زائل کرنے اور اپنے جسم کو صاف کرنے کا طریقہ بھی انہیں سکھایا ہے ۲۱۔ اس طرح نبی رحمت وہدایت نے مسلمان عورتوں کو حیض کی غلاظت سے پاکی وطہارت حاصل کرنے کے طریقے بتائے تاکہ وہ اپنے گھر کے اندر ہمیشہ صاف ستھری اور پرکشش نظر آجائیں۔

اسلام میں ایک مسلم خاتون کو یہ حکم ہے کہ وہ اپنے چہرہ پر مسکراہٹ سجاکر اور خندہ پیشانی کے ساتھ اپنی مسلمان بہن سے ملے۔ اور اگر وہ اپنے شوہر کے سامنے ہو تو چہرہ پر فرحت وانبساط اور بشاشت کا ہونا اور زیادہ ضروری ہے، کیونکہ شوہر کا حق دوسروں پر مقدم ہے۔ ابوذر رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے فرمایا: "تم نیکی وبھلائی کے کسی بھی کام کو حقیر نہ سمجھو، اگرچہ یہ کسی مسلمان بھائی کے ساتھ مسکراتے ہوئے چہرہ کے ساتھ تمہارا ملنا ہی کیوں نہ ہو۔ ۲۲" اور ایک دوسری حدیث میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: "کسی مسلمان بھائی سے تمہارا مسکرا کے ملنا بھی صدقہ ہے۔" ۲۳

عورت کی پانچویں ذمہ داری: خانگی امور کا انتظام وانصرام

انصاف پر مبنی اسلامی شریعت کے آداب میں سے یہ ہے کہ گھر کے امور ومعاملات کو انجام دینے میں شوہر اور بیوی دونوں ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کریں گے۔ جس طرح مرد پر گھر کے تمام افراد کے اخراجات کو پورا کرنے اور زندگی کی دوسری ضروریات مثلاً کھانے پینے کی چیزوں اور سب کو لباس وپوشاک فراہم کرنے کی ذمہ داری ہے، اسی طرح بیوی کے اوپر بھی ذمہ داری ہے کہ وہ کھانا تیار کرنے، گھر کی صاف ستھرائی اور اس کے سامانوں کو منظم طریقہ سے رکھنے میں اور اندرون خانہ دیگر کاموں کو انجام دینے میں شوہر کا ساتھ دے۔ اس کے لیے وہ خود بھی ان گھریلو کاموں کو اپنے طور پر انجام دے سکتی ہے یا ان کاموں کو کرنے والے خادم وخادماؤں کی نگرانی کرکے اس ذمہ داری کو ادا کرسکتی ہے، اس لیے کہ وہ گھر کی نگراں ہے اور گھریلو امور کو انجام دینے کے لیے ذمہ دار ہے۔

شوہر کے گھر میں بیوی کے کام کرنے یا نہ کرنے کا معاملہ اصلاً عرف ورواج اور شوہر وبیوی کے باہمی مفاہمت ورضامندی سے تعلق رکھتا ہے۔ اس سلسلہ میں اکثر علماء کا یہ موقف ہے کہ مرد کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ بیوی کو

گھریلو کاموں کو کرنے پر مجبور کرے، اس لیے کہ وہ اس کی بیوی ہے، خادمہ نہیں ہے۔ اسی طرح شوہر کو بیوی کے خادم کو گھر سے باہر کرنے کا بھی حق نہیں ہے۔ جب تک وہ خادم شوہر و بیوی کی ضروریات کے مطابق کاموں کو انجام دے رہا ہے تب تک شوہر کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ اس خادم کا خرچ بھی اٹھائے۔

اس سلسلہ میں امام شافعی اور فقہائے کوفہ کہتے ہیں کہ بیوی کے اخراجات کے ساتھ اس کے خادم کے اخراجات مہیا کرانے کی ذمہ داری شوہر کی ہے۔ ۲۴ے

اس تعلق سے جو بھی صحیح احادیث مروی ہیں ان سے شوہر کے گھر میں بیوی کے کام کرنے کا ثبوت ملتا ہے۔ بیوی خوش دلی کے ساتھ رضاکارانہ طور پر شوہر کے گھریلو کاموں کو انجام دے گی، گھریلو امور کو انجام دینے میں اس کا ہاتھ بٹائے گی اور اس معاملہ میں اپنے شوہر کے ساتھ تعاون کرے گی جبکہ وہ اس کے لیے خادم مہیا کرنے کی سکت نہ رکھتا ہو، اس لیے کہ استطاعت نہ ہونے کے باوجود شوہر کو خادم مہیا کرنے کا مکلف بنانا اس کے لیے مشکلات کھڑی کرنے کا سبب بنے گا اور یہ ایک ایسے کام کے لیے اسے مجبور کرنا ہوگا جسے انجام دینا اس کی طاقت سے باہر ہے۔

اس سلسلہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادی فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا نے گھریلو کاموں میں شوہر کی معاونت کرکے مسلم خواتین کے لیے ایک بہترین نمونہ پیش کیا ہے۔ وہ اپنے شوہر علی مرتضی رضی اللہ عنہ کے گھر میں گھر کے کاموں کو اپنے ہاتھوں سے انجام دیتی تھیں جس کی وجہ سے ان کو سخت مشقت کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ امام بخاری نے روایت نقل کی ہے کہ ایک مرتبہ فاطمہ رضی اللہ عنہا اپنے والد ماجد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس یہ شکایت کرنے کے لیے آئیں کہ بہت زیادہ چکی چلانے کی وجہ سے ان کے ہاتھوں میں نشان پڑ گئے ہیں۔ ایک دوسری روایت میں منقول ہے کہ ایک مرتبہ فاطمہ رضی اللہ عنہا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک خادم مانگنے کے لیے آئیں تو آپ نے فرمایا: ”کیا میں خادم سے بہتر چیز کی طرف تمہاری رہنمائی نہ کردوں، تم سونے سے پہلے ۳۳ مرتبہ سبحان اللہ، ۳۳ مرتبہ الحمدللہ اور ۳۴ مرتبہ اللہ اکبر کہا کرو۔“ ۲۵ے

اس حدیث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ جب فاطمہ رضی اللہ عنہا نے اپنے والد ماجد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ہاتھ سے آٹے کی چکی چلانے کی وجہ سے ہاتھ میں چھالے پڑ جانے کی شکایت کی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے شوہر علی رضی اللہ عنہ کو یہ حکم نہیں دیا تھا کہ وہ چکی چلانے کے لیے کسی خادم کو رکھ لیں یا گھر کے سارے کام وہ خود انجام

دیا کریں۔ اگر علی رضی اللہ عنہ کی خادم رکھنے کی استطاعت ہوتی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم ضرور انہیں خادم رکھنے کا حکم فرماتے جیسا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں شادی سے پہلے فاطمہ رضی اللہ عنہا کا مہر ادا کرنے کا حکم دیا تھا جبکہ مہر کو بیوی کی رضامندی سے مہلت لے کر کچھ عرصہ بعد بھی ادا کیا جا سکتا ہے۔ یہاں اس نکتہ پر غور کرنے کی ضرورت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم علی رضی اللہ عنہ کو ایسے کام کا حکم کیسے دے سکتے تھے جو علی رضی اللہ عنہ کے اوپر واجب نہیں تھا۔ اور جس رقم کی ادائیگی علی رضی اللہ عنہ پر واجب تھی اس کے لیے حکم دینے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم پیچھے کیسے رہ سکتے تھے۔ اس سے یہ معلوم ہوا کہ اگر علی رضی اللہ عنہ پر فاطمہ رضی اللہ عنہا کے لیے خادم کی فراہمی واجب ہوتی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم ضرور اس کے لیے حکم صادر فرماتے۔ ابن بطال نے بعض علماء کا قول نقل کیا ہے کہ احادیث و آثار سے اس کا کوئی ثبوت نہیں ملتا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فاطمہ رضی اللہ عنہا کو اندرون خانہ سارے کام کو کرنے کا پابند بنایا تھا۔ اصلاً یہ سارے کام باہمی مفاہمت، حسن معاشرت اور اچھے اخلاق کی بنیاد پر انجام پاتے تھے۔۲۶

اسماء بنت ابو بکر رضی اللہ عنہا کو بھی شادی کے بعد اسی طرح کی تنگدستی اور محنت و مشقت کا سامنا کرنا پڑا جیسا کہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کو کرنا پڑا تھا۔ اسماء رضی اللہ عنہا شوہر کے گھر میں اندرون خانہ کے کاموں کو انجام دینے کے ساتھ گھر کے باہر کے بھی کئی طرح کے کام کیا کرتی تھیں۔ وہ خود بیان کرتی ہیں کہ زبیر رضی اللہ عنہ سے جب میری شادی ہوئی تو اس وقت ان کے پاس نہ تو ان کی اپنی کوئی زمین تھی، نہ غلام تھا اور نہ کوئی دوسری چیز۔ ان کے پاس پانی لانے کے لیے صرف ایک اونٹ تھا اور ان کا ایک گھوڑا تھا، میں ان کے گھوڑے کو چارہ دیتی، ان کے گھر کے لیے پانی لاتی، پانی لانے کے لیے مشکیزہ کو اپنے ہاتھوں سے سیتی، خود اپنے ہاتھوں سے آٹا گوندھتی، لیکن مجھے اچھی طرح روٹی پکانی نہیں آتی تھی، جماعت انصار سے تعلق رکھنے والی پڑوسن عورتیں میری روٹی پکا دیا کرتی تھیں، وہ سب صاف اور سچے دل کی دوسرے کے کام آنے والی عورتیں تھیں۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے زبیر رضی اللہ عنہ کو ایک زمین دی تھی، میں اس زمین سے کھجور کی گٹھلیاں اپنے سر پر رکھ کر لاتی تھی۔ وہ زمین میرے گھر سے دو تہائی فرسخ (یعنی دو میل) کے فاصلہ پر تھی۔۲۷

اسماء رضی اللہ عنہا قریش کے ایک معزز خانوادہ سے تعلق رکھنے والی ایک شریف زادی تھیں، وہ صرف اپنے شوہر کی تنگدستی و بدحالی کا لحاظ کر کے ہی اتنے سارے مشقت بھرے کاموں کو انجام دیتی تھیں۔ گھر میں مال و اسباب

کی کمی اور تنگدستی کی صراحت خود انہوں نے ان الفاظ میں کی ہے کہ "شوہر کے پاس اپنی کوئی زمین نہیں تھی اور نہ کوئی دوسری قابل ذکر چیز تھی سوائے ایک اونٹ کے جو کنوئیں سے پانی لانے کے لیے استعمال ہوتا تھا اور ایک گھوڑے کے۔

فاطمہ زہرا اور اسماء رضی اللہ عنہما کی زندگی حسن معاشرت اور زوجین کے درمیان بے انتہاء محبت ومفاہمت کی عمدہ مثال ہے۔ شوہر وبیوی کے آپسی تعلقات کتنے مضبوط و مستحکم اور خیر خواہانہ ہونے چاہئیں اس کے لیے یہ دونوں خواتین اسلام مسلم خواتین کے لیے بہترین نمونہ ہیں۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فاطمہ رضی اللہ عنہا کے مانگنے پر ان کے لیے خادم کا انتظام نہیں کیا تاکہ یہ عمل قانونی شکل اختیار نہ کرے اور بعد میں اس نظیر کی بنیاد پر شوہر کے لیے خادم کی فراہمی ضروری نہ ہو جائے۔ اس موقع پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بات کو اہمیت دی کہ شوہر وبیوی کے درمیان باہمی تعاون کا رشتہ قائم رہے۔ اسی لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی صاحبزادی فاطمہ رضی اللہ عنہا اور داماد علی رضی اللہ عنہ دونوں کو یہ مشورہ دیا کہ سونے سے پہلے ۳۳ مرتبہ سبحان اللہ، ۳۳ مرتبہ الحمدللہ اور ۳۴ مرتبہ اللہ اکبر پڑھ لیا کریں تاکہ اللہ تعالیٰ انہیں کام کرنے کی مزید طاقت عطا فرمائے اور اپنے روزمرہ کے کاموں کو انجام دینے کی استطاعت انہیں حاصل ہو جائے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی صاحبزادی اور ان کے شوہر کی ایک ایسے عمل کی طرف رہنمائی کی جو ان دونوں کے حق میں زیادہ بہتر تھا۔

ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کچھ دنوں کے بعد اپنی صاحبزادی اسماء رضی اللہ عنہا کے گھر ایک خادم بھیج دیا تاکہ وہ ان کے شوہر کے گھوڑے کی دیکھ بھال کی خدمت انجام دے اور اسماء رضی اللہ عنہا کو ایک ایسے کام سے نجات مل جائے جو عام طور پر مرد کے ذریعہ انجام دیا جاتا ہے۔ اس عمل کے ذریعہ ابوبکر رضی اللہ عنہ نے یہ نظیر قائم کی کہ اگر داماد کو مالی تعاون کی ضرورت ہو اور بیوی کے ماں باپ داماد کی مدد کرنے کی حالت میں ہوں تو انہیں بیٹی داماد کی خانگی مشکلات کو حل کرنے کی ضرور کوشش کرنی چاہیے اور ضرورت پڑنے پر انہیں تعاون کی پیشکش کرنی چاہیے۔

ان دونوں مثالوں سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ عورت کے لیے مستحسن یہ ہے کہ وہ اپنے شوہر کی مالی حیثیت کو مدنظر رکھتے ہوئے خوشدلی کے ساتھ گھریلو کاموں کو انجام دے، اندرون خانہ چیزوں کے انتظام وانصرام کو دیکھے اور اپنے گھر کو جس قدر بھی منظم ومرتب رکھ سکتی ہے اسے ویسا رکھنے کی کوشش کرے۔ اس کے بدلہ میں شوہر کی

یہ ذمہ داری ہے کہ وہ بیوی کی دلجوئی کے لیے استطاعت ہونے پر گھریلو کاموں کے لیے خادم کا انتظام ضرور کرے۔ اور خادم کے ذریعہ گھر کے کاموں کو انجام دینے کی ذمہ داری بیوی کے سپرد کردے۔ بیوی خادم سے خدمت لے گی اور اس کی نگرانی پر مامور رہے گی۔ اگر شوہر کو خادم مہیا کرانے کی استطاعت نہ ہو تو اس صورت میں اسے نبی کریم صلی اللہ علیہ و سلم کے نقش قدم کی پیروی کرتے ہوئے گھر کے کاموں میں بیوی کی معاونت کرنی چاہیے اور گھر کے لیے بیوی کی انتھک محنت و مشقت کی قدر کرتے ہوئے اسے گھریلو کاموں میں بیوی کا ہاتھ بٹانا چاہیے۔ عائشہ رضی اللہ عنہا سے دریافت کیا گیا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ و سلم کا گھر میں کیا معمول ہوتا تھا؟ انہوں نے بتایا کہ آپ گھر کے کاموں میں اپنی بیوی کا تعاون کرتے تھے اور اذان کی آواز سنتے ہی آپ گھر سے باہر نکل جاتے تھے۔ ۲۸؎

بیوی کی حیثیت سے ایک عورت کی یہ ذمہ داریاں ہیں جن کا ذکر اوپر کی سطروں میں کیا گیا۔ شوہر اور بیوی کی کچھ مشترکہ ذمہ داریاں بھی ہیں جنہیں اب نیچے کی سطروں میں بیان کیا جارہا ہے۔

(۱) ایک دوسرے کے راز کو فاش نہ کریں اور ایک دوسرے کے عیب کو بیان نہ کریں

شوہر و بیوی میں سے کوئی بھی ایک دوسرے کے راز کو افشاء نہ کریں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ و سلم کا ارشاد ہے: "قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے بدترین وہ شخص ہوگا جو تنہائی میں بیوی کے پاس جاتا ہے اور بیوی بھی اس کے ساتھ تنہائی و خلوت میں وقت گزارتی ہے، پھر وہ شخص بیوی کی پوشیدہ باتوں کو ظاہر کر دیتا ہے۔" ۲۹؎

امام نووی اس حدیث کی تشریح کرتے ہوئے کہتے ہیں: اس حدیث میں ان پوشیدہ باتوں کو ظاہر کرنے کی حرمت کا بیان ہے جو جنسی لذت اندوزی کے وقت اس کے اور اس کی بیوی کے درمیان پیش آتی ہیں، ان مخصوص لمحات کی تفصیلات کو بیان کرنا اور اس خاص لمحہ میں بیوی کے منہ سے نکلنے والی کسی بات یا اس کی کسی حرکت کو لوگوں سے بیان کرنا حرام ہے۔ یہ حکم شوہر و بیوی دونوں کے لیے ہے، اس لیے کہ شرعی احکام کے مکلف دونوں ہیں۔ ۳۰؎

(۲) ایک دوسرے کی خیر خواہی اور راہ حق کی طرف ایک دوسرے کی رہنمائی اور خیر کے کاموں میں ایک دوسرے کے ساتھ تعاون

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "يا أيها الذين آمنوا قوا أنفسكم و أهليكم نارا و قودها الناس و الحجارة عليها ملائكة غلاظ شداد لا يعصون الله ما أمرهم و يفعلون ما يؤمرون" (التحریم/٦) (ترجمہ: اے ایمان والوں! تم اپنے آپ کو اور اپنے گھر

والوں کو اس آگ سے بچاؤ جس کا ایندھن انسان ہیں اور پتھر، جس پر سخت دل فرشتے مقرر ہیں جنہیں جو حکم اللہ تعالیٰ دیتا ہے اس کی نافرمانی نہیں کرتے، بلکہ جو حکم دیا جائے بجالاتے ہیں)

چنانچہ ایک مسلمان کا یہ فرض ہے کہ وہ خود بھی جہنم کی آگ سے بچے اور اپنے اہل وعیال و بیوی کو بھی اس سے بچائے۔ یہ حکم مرد و عورت دونوں کے لیے ہے۔

ضحاک اور مقاتل کا قول ہے: ایک مسلمان کے اوپر یہ حق ہے کہ وہ اپنے اہل وعیال، رشتہ داروں، باندیوں اور غلاموں کو ان احکام سے واقف کرائے جو اللہ تعالیٰ نے ان پر فرض کیے ہیں اور انہیں ان امور کی بھی خبر دے جن سے اللہ تعالیٰ نے روکا ہے۔ [۱۳۱]

شوہر کی زندگی میں بیوی پر اس کے حقوق کو بیان کرنے کے بعد اب میں شوہر کی وفات کے بعد بیوی پر اس کے حقوق کو ذکر کر دینا مناسب سمجھتا ہوں۔

عورت کی چھٹی ذمہ داری: شوہر کی وفات پر عدت پوری کرنا اور سوگ منانا

اسلام نے بیوی کو یہ حکم دیا ہے کہ وہ شوہر کی وفات کے بعد چار ماہ اور دس دن تک عدت میں رہے۔ اس مدت کے دوران وہ گھر میں رہے اور غم و سوگ کا اظہار کرے، نہ زیب و زینت اختیار کرے اور نہ بلا شدید ضرورت کے گھر سے باہر نکلے، نہ اپنے آپ کو نکاح ثانی کے پیغام کے لیے پیش کرے اور نہ اس مدت کے دوران شادی کی خواہش کا اظہار کرے۔ اس کے لیے یہ ساری بندشیں اس لیے ہیں تاکہ شوہر کی وفات کے بعد بھی اس کی طرف سے ایک متعینہ مدت تک شوہر کے ساتھ گزارے ہوئے ایام کے تعلق سے وفاداری کا اظہار ہو۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "و الذین یتوفون منکم و یذرون أزواجا یتربصن بأنفسهن أربعة أشهر و عشرا فإذا بلغن أجلهن فلا جناح علیکم فیما فعلن فی أنفسهن بالمعروف و الله بما تعملون خبیر" (البقرۃ/۲۳۴)

(ترجمہ: تم میں سے جو لوگ فوت ہو جائیں اور بیویاں چھوڑ جائیں، وہ عورتیں اپنے آپ کو چار مہینے اور دس دن عدت میں رکھیں، پھر جب مدت ختم کر لیں تو جو اچھائی کے ساتھ وہ اپنے لیے کریں اس میں تم پر کوئی گناہ نہیں اور اللہ تعالیٰ تمہارے ہر عمل سے خبردار ہے)

ابن کثیر اس آیت کی تفسیر میں کہتے ہیں: ”ان تمام مسلمان عورتوں کے لیے اللہ تعالیٰ کا یہ حکم ہے جن کے شوہر وفات پا گئے ہوں کہ وہ چار ماہ اور دس دن تک عدت میں رہیں۔ یہ حکم ان تمام شادی شدہ عورتوں کے لیے جن کے ساتھ شوہر نے جنسی تعلق قائم کیا ہو یا نہ کیا ہو، اس پر اہل علم کا اجماع ہے۔“[۳۲]

”قرآن مجید میں ”یتربصن“ کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ ”تربص“ کے معنی ہیں نکاح ثانی کے لیے صبر اور انتظار کرنا اور شوہر کے گھر سے باہر نہ نکلنا، یعنی عدت گزارنے والی عورت رات اسی گھر میں گزارے گی جہاں وہ شوہر کے ساتھ رہتی تھی۔“[۳۳]

حدیث نبوی میں اس عورت کے عدت گزارنے کی صراحت آئی ہے جس کا شوہر فوت ہو گیا ہو۔ ام حبیبہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا: ”اللہ اور آخرت پر ایمان رکھنے والی کسی مسلم خاتون کے لیے کسی کی موت پر تین دنوں سے زیادہ سوگ منانا جائز نہیں ہے ہاں البتہ وہ اپنے شوہر کی موت پر چار ماہ اور دس دن سوگ منائے گی۔[۳۴]“ ایک بیوہ عورت چار ماہ اور دس دن کی مدت بطور عدت پورا کرے گی۔ اس درمیان وہ نہ تو نکاح ثانی کرے گی، نہ زیب وزینت اختیار کرے گی اور نہ بلاضرورت گھر سے باہر نکلے گی۔ اگر بیوہ عورت حاملہ ہو تو بچہ کی ولادت کے ساتھ ہی اس کی عدت مکمل ہو جائے گی۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ”و أولات الأحمال أجلهن أن يضعن حملهن“ (الطلاق/۴) (ترجمہ: اور حاملہ عورتوں کی عدت یہ ہے کہ وہ اپنے بچہ کی ولادت سے فارغ ہو جائیں)

اس آیت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایک حاملہ بیوہ عورت کی عدت چار ماہ اور دس دنوں سے کم بھی ہو سکتی ہے اور اس سے زیادہ بھی ہو سکتی ہے۔ اس کا انحصار اس پر ہو گا کہ وہ کتنے دنوں کی حاملہ ہے۔ اس اعتبار سے حاملہ بیوہ عورت کی عدت نو ماہ بھی ہو سکتی ہے اور چند دن بھی ہو سکتی ہے جیسا کہ عہد نبوی میں قبیلہ بنو اسلم کی خاتون سبیعہ اسلمیہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ پیش آیا تھا۔ امام بخاری نے ام المومنین ام سلمہ رضی اللہ عنہا کی روایت نقل کی ہے کہ بنو اسلم کی ایک خاتون جن کا نام سبیعہ تھا، جب ان کے شوہر کا انتقال ہوا تو اس وقت وہ حاملہ تھیں۔ اسی دوران ابو سنابل بن بعلک نے ان کو نکاح کا پیغام دیا تو انہوں نے اس پیغام کو مسترد کر دیا اور کہا کہ اللہ کی قسم، میں اس وقت تک نکاح ثانی نہیں کروں گی جب تک کہ میں دو مدتوں میں سے ایک کو بطور عدت گزار نہ لوں۔ دس دنوں کے بعد (جب وہ بچہ کی ولادت سے فارغ ہو گئی) وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئیں تو آپ نے فرمایا: اب تم نکاح کر لو۔“[۳۵]

صحیح بخاری میں یہ روایت بھی منقول ہے کہ عبید اللہ بن عبد اللہ نے اپنے والد کے بارے میں نقل کیا ہے کہ انہوں نے ابن ارقم کو خط لکھا کہ وہ سبیعہ اسلمیہ رضی اللہ عنہا سے دریافت کریں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں کیا فتوی دیا تھا۔ سبیعہ اسلمیہ رضی اللہ عنہا نے بتایا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے فتوی دیا تھا کہ میں بچہ کی ولادت کے بعد نکاح ثانی کرلوں۔[۳۶]" ان دونوں احادیث سے واضح طور پر یہ معلوم ہوتا ہے کہ حاملہ بیوہ عورت کی عدت بچہ کی ولادت کے بعد پوری ہو جاتی ہے۔

حواشی:

۱۔ تفسیر القرآن العظیم، **مؤلفہ: ابن کثیر، جلد ۶، ص ۲۷۴**

۲۔ حقوق الزوجین، **مؤلفہ: ابو الاعلی مودودی، ص ۱۹**

۳۔ صحیح بخاری، کتاب النکاح باب من لم یستطع الباءة، **جلد ۶، ص ۱۱۷**

۴۔ سنن نسائی، کتاب النکاح باب کراهیة تزوج العقیم، **جلد ۶**

۵۔ تفسیر القرآن العظیم، **مؤلفہ: ابن کثیر، جلد ۱، ص ۴۹۱**

۶۔ سنن نسائی، کتاب النکاح باب أي النساء خیر، **جلد ۶، ص ۶۸**

۷۔ صحیح مسلم مع شرح النووی، کتاب الإماره باب وجوب طاعة الأمراء فی غیر معصیة، **جلد ۱۲، ص ۲۲۷**

۸۔ فتح الباری شرح صحیح بخاری، کتاب النکاح، **جلد ۹، ص ۳۰۴**

۹۔ فتح الباری شرح صحیح بخاری، کتاب النکاح باب المرأة راعیة فی بیت زوجها، **ص ۲۹۹**

۱۰۔ سنن ترمذی، کتاب الجهاد باب ما جاء فی الإمام، **جلد ۴، ص ۲۰۸، حدیث نمبر ۱۷۰۵**

۱۱۔ الجامع لأحکام القرآن، **مؤلفہ: ابو عبد اللہ محمد بن أحمد الأنصاری القرطبی، جلد ۳، ص ۱۲۳ (تفسیر سورة البقرة)**

۱۲۔ المرأة فی القرآن و السنة، **مؤلفہ: محمد عزة دروز، ص ۳۰**

۱۳۔ تفسیر القرآن العظیم، **مؤلفہ: ابن کثیر، جلد ۴، ص ۳۷۳**

۱۴۔ تفسیر القرآن العظیم، **مؤلفہ: ابن کثیر، جلد ۱، ص ۴۶۶**

۱۵۔ فتح الباری شرح صحیح بخاری، کتاب النکاح باب إذا بانت المرأة مهاجرة فراش زوجها، **جلد۹، ص ۲۹۴**

۱۶۔ **حوالہ سابق**

۱۷۔ صحیح بخاری، کتاب النکاح باب لزوجک علیک حق، **جلد۶، ص۱۵۳**

۱۸۔ فتح الباری شرح صحیح بخاری، **جلد۹، ص۳۹۹**

۱۹۔سنن ترمذی، کتاب الرضاع باب ۱۱، **جلد۳، ص۴۵۸**

۲۰۔ سنن نسائی، کتاب النکاح باب أي النساء خیر، **جلد۶، ص۶۸**

۲۱۔ صحیح مسلم (شرح نووی) کتاب النکاح باب استحباب نکاح البکر، **ص۵۴**

۲۲۔ صحیح مسلم (شرح نووی) کتاب البر و الصلة و الآداب باب استحباب طلاقة الوجہ عند اللقاء، **ص ۴۸۳**

۲۳۔ سنن ترمذی، کتاب البر و الصلة باب ما جاء فی صنائع المعروف، **ص۳۴۰**

۲۴۔ فتح الباری شرح صحیح بخاری، کتاب النفقات باب خادم المرأة، **جلد۹، ص۵۰۷**

۲۵۔ **حوالہ سابق**

۲۶۔ **حوالہ سابق**

۲۷۔ فتح الباری شرح صحیح بخاری، کتاب النکاح باب الغیرة، **جلد۹، ص۳۱۹**

۲۸۔ **حوالہ سابق، ص۵۰۷**

۲۹۔ صحیح مسلم (شرح نووی) کتاب النکاح باب تحریم إفشاء سر المرأة، **ص۸**

۳۰۔ **حوالہ سابق**

۳۱۔ تفسیر القرآن العظیم، **مؤلفہ: ابن کثیر، جلد۴، ص۳۹۱**

۳۲۔ تفسیر القرآن العظیم، **مؤلفہ: ابن کثیر، جلد۱، ص۲۸۴**

۳۳۔ الجامع لأحکام القرآن، **مؤلفہ: ابو عبد اللہ محمد بن أحمد الأنصاری القرطبی، جلد۳، ص۱۷۶**

۳۴۔ صحیح البخاری، کتاب الطلاق باب تحد المتوفی عنها زوجها أربعۃ أشهر و عشراً، **جلد ۶، ص ۱۸۵**

۳۵۔ صحیح بخاری، کتاب الطلاق باب و أولات الأحمال أجلهن أن یضعن حملهن، **جلد ۶، ص ۱۸۳**

۳۶۔ *حوالہ سابق*

پندرہواں باب

اسلام میں ماں کے فرائض

اللہ تعالیٰ نے والدین پر اولاد کی صحیح تربیت اور مکمل نگرانی و دیکھ بھال کی ذمہ داری عائد کی ہے تاکہ وہ ہر اعتبار سے ایک بہتر اور معیاری انسان بن کر معاشرہ کا حصہ بن سکیں۔ حدیث نبوی میں بھی بچپن کی تعلیم و تربیت کی اہمیت اور بچوں کی زندگی پر اس کے گہرے اثرات کو واضح کیا گیا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: ”ہر بچہ فطرت پر پیدا ہوتا ہے، بعد میں اس کے والدین اسے یہودی، نصرانی یا مجوسی بنا دیتے ہیں جیسا کہ چوپائے ایک ہی طرح کے بچے جنتے ہیں، ان میں سے کوئی تم کو کان ناک کٹا ہوا عیب دار نہیں ملے گا۔“[1]

یہ حدیث نبوی ماہرین نفسیات اور بچوں کی تعلیم و تربیت کی ذمہ داری سنبھالنے والوں کو اس حقیقت سے آگاہ کر رہی ہے کہ عہد طفولیت ہی سے بچوں کی تعلیم و تربیت کی اہمیت کو سمجھنا اور اسی کے مطابق اس ذمہ داری کی ادائیگی کی طرف متوجہ ہونا نہایت ضروری ہے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے دنیا کے تمام بچوں کی تخلیق و تولید اس فطرت سلیمہ کے مطابق ہوتی ہے جس پر اس نے انسانوں کو پیدا کیا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کی اس تخلیق میں تبدیلی قابل قبول نہیں ہے۔ تربیت کی نازک اور عظیم ذمہ داری کو ادا کرنے والوں کے ہاتھوں میں بچے گوندھے ہوئے آٹے کی طرح ہوتے ہیں، وہ اس سے جیسی شکلیں چاہیں بنا سکتے ہیں۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے لیے چوپائے کی مثال دی ہے جو ایک جیسے بے عیب بچے جنتے ہیں۔ انسان ہی اپنے ہاتھ سے اللہ تعالیٰ کی تخلیق میں تبدیلی پیدا کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی انوکھی و شاہکار تخلیق کو بگاڑ کر بدشکل و بدنما بنا دیتا ہے۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے بچے کے تعلق سے اس فساد و بگاڑ کی نسبت والدین کی طرف کی ہے۔ یعنی اگر بچہ فطرت سلیمہ سے انحراف کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ کی نظر میں اس کے ذمہ دار اس کے والدین ہیں۔

ماں کی گود بچہ کی اولین پرورش گاہ کے ساتھ اس کی سب سے پہلی تربیت گاہ بھی ہوتی ہے۔ دوسرے لفظوں ماں ایک ایسا کارخانہ ہے جس کے زیر سایہ رہنے کے بعد بچہ ایک الگ ہی مخلوق بن کر معاشرہ میں اپنا اچھا یا برا رول

ادا کرنے کے لیے سامنے آتا ہے۔ماں ہی اسے عہد طفولیت میں یہودیت یا نصرانیت یا مجوسیت کی تعلیم سے روشناس کر کے ان تینوں مذاہب میں سے کسی ایک کا پیروکار بنا دیتی ہے۔ جس طرح عوام الناس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ اپنے حکمرانوں کے دین پر ہوتے ہیں اسی طرح بچہ کی نشو نما بھی ماں باپ ہی کے دین پر ہوتی ہے۔والدین کی دی ہوئی تربیت ہی کے ذریعہ مستقبل میں بچہ کے رجحان و میلان اور اس کے دین و عقیدہ کی تعیین ہوتی ہے۔اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ایک انسان کو مسلمان یا کافر بنانے میں بچہ کی ابتدائی تعلیم و تربیت کا کتنا اہم رول ہوتا ہے۔بچے والدین کے پاس بطور امانت ہوتے ہیں، انہیں بہترین تعلیم و تربیت سے آراستہ کرنا والدین کی بڑی اہم ذمہ داری ہوتی ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:"اللہ تعالیٰ (قیامت کے دن) ہر ذمہ دار شخص سے اس کے ماتحت کے بارے میں سوال کرے گا۔"[۲]

بچوں کی تربیت، انہیں تیار کرنا، انہیں تعلیم کے زیور سے آراستہ کرنا، انہیں صحیح راستہ پر چلانا، خیر کی طرف ان کی رہنمائی کرنا اور ان کی نگرانی و دیکھ بھال نہایت مشکل اور محنت و مشقت کا کام ہے۔کچھ لوگ اسے معمولی اور آسان کام سمجھتے ہیں، لیکن ایسا ہے نہیں۔ایک بچہ جوان ہونے سے پہلے اپنی زندگی کے مختلف مراحل سے گزرتا ہے اور وہ زندگی کے تمام مراحل میں ایک خاص نوعیت کی تربیت اور رہنمائی کا محتاج ہوتا ہے، اس لیے کہ ہر بچہ کے اندر فطری طور پر خیر و شر دونوں کو قبول کرنے کی صلاحیت ہوتی ہے۔ یہ ذمہ داری والدین کی ہوتی ہے کہ وہ اسے خیر کے راستہ پر ڈالیں تاکہ خیر اور صلاح و تقویٰ پر اس کی نشو و نما ہو سکے۔اور وہ بڑا ہو کر ایک اچھا، نیک اور خدا ترس انسان بن سکے۔

بچوں کی تربیت تین گوشوں پر مشتمل ہونی چاہیے، جسمانی تربیت، عقلی و فکری تربیت اور روحانی تربیت تاکہ وہ بچہ ان تمام تربیتی مراحل سے گزرنے کے بعد بہت حد تک ایک مکمل انسان بن جائے۔مذکورہ تینوں قسم کی تربیت ماں اور باپ دونوں کی مشترکہ ذمہ داری ہے۔دونوں کو مل کر اس ذمہ داری سے عہدہ بر آ ہونا چاہیے۔ جیسا کہ عرض کیا گیا بچہ کی تربیت کا یہ کام ماں اور باپ دونوں سے جڑا ہوا ہے، لیکن ضرورت پڑنے پر ان دونوں میں سے کوئی ایک ہی اس ذمہ داری کو ادا کرتا ہے، مثلاً ان دونوں میں سے کسی ایک کی وقتی یا دائمی غیر موجودگی کی وجہ سے بچہ کی تربیت کی یہ ذمہ داری ان میں سے کسی ایک کے سر آجاتی ہے۔

بچہ کی تربیت سے متعلق کچھ ایسی ذمہ داریاں ہیں جنہیں خود بخود ماں ہی کو انجام دینی پڑتی ہیں، اسی لیے بیٹوں کی تربیت کے معاملہ میں ماں اور باپ کی ذمہ داریوں کو الگ الگ کرنا بسا اوقات مشکل ہو جاتا ہے۔اسی وجہ سے میں یہاں پر

بچوں کی تربیت سے متعلق ان ذمہ داریوں کا تذکرہ کر رہا ہوں جو اصلاً تو باپ کی ہیں، لیکن ضرورت پڑنے پر ماں بھی بچہ کی تربیت کی اس ذمہ داری کو ادا کر سکتی ہے۔ البتہ وہ خاص معاملات جو مرد سرپرستوں سے تعلق رکھتے ہیں اور ماں چاہ کر بھی اس ذمہ داری کو ادا نہیں کر سکتی ہے مثلاً ولایت نکاح (یعنی لڑکی کے نکاح کے وقت ولی کی ذمہ داری ادا کرنا)، تو میں نے اس کتاب میں اس مسئلہ پر بات نہیں کی ہے۔

عام طور پر بچوں کی پرورش و پرداخت کی ذمہ داری ماں کے کندھے پر ہوتی ہے بالخصوص تب جبکہ وہ عہد طفولیت سے گزر رہے ہوتے ہیں۔ بچہ ماں کی زبان اور اس کے سلوک و برتاؤ کا اثر قبول کرتا ہے، شروع سے ہی اس پر ماں کی گہری چھاپ پڑتی ہے اس لیے وہ اپنی ماں ہی کے عادات و اطوار اور سلوک و برتاؤ کا حامل بن کر کارگاہ حیات میں قدم رکھتا ہے۔ اس اعتبار سے ماں بچوں کے لیے ایک رول ماڈل اور ایک ایسا سانچہ ہے جس میں ڈھل کر بچے معاشرہ میں قدم رکھتے ہیں۔ یہ سلسلہ صدیوں ہی سے نہیں بلکہ تخلیق بنی آدم سے چلا آ رہا ہے۔ اس سے ہم اندازہ لگا سکتے ہیں کہ بچے کی تربیت میں ماں کا کتنا اہم رول ہوتا ہے۔ بچے کی تربیت میں باپ کا رول بھی اہم ہوتا ہے اور اسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ہے تاہم بچہ جب عہد طفولیت سے گزر رہا ہوتا ہے اور ابھی وہ اسکول و مدرسہ جانے کے لائق نہیں ہوتا ہے۔ اس مرحلہ میں بچہ کی تربیت میں ماں کے مقابلہ باپ کا رول ثانوی ہوتا ہے۔

اسلام میں ماں گھر کی مستقل طور پر ذمہ دار ہوتی ہے، کیونکہ وہ اپنے شوہر کے گھر کی مالکن اور نگراں ہوتی ہے اور جو خانگی امور اس کے ذمہ ہوتے ہیں ان کی وہ جواب دہ ہوتی ہے۔ اس سلسلہ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: "تم میں سے ہر شخص نگراں ہے اور ہر ایک اپنے ماتحتوں کے بارے میں جواب دہ ہے، حاکم اور امیر بھی نگراں ہے، مرد اپنے گھر کا نگراں و ذمہ دار ہے، عورت اپنے شوہر کے گھر اور بچوں کی نگراں و ذمہ دار ہے، اس طرح ہر شخص نگراں و ذمہ دار ہے اور ہر ایک اپنے ماتحتوں کے تعلق سے جواب دہ ہے۔"[۳]

اسلام نے عورت کو گھر کا نگراں و نگہبان اور ذمہ دار بنایا ہے اور نگراں و ذمہ دار وہ ہوتا ہے جو اپنی ماتحتی میں آنے والی ہر چیز کے مفاد کا خیال رکھتا ہے۔ وہ اپنے ماتحتوں کی اصلاح، فائدہ اور خیر کے لیے پوری دلسوزی اور اخلاص کے ساتھ کوشش کرتا ہے۔ اسی لیے عورت کو بہ حیثیت بیوی اور ماں شوہر کے گھر کی ہر چیز بشمول رشتہ دار، اولاد، نوکر چاکر، اثاثے و سامان اور مال و متاع کے لیے ذمہ دار و جواب دہ بنایا گیا ہے۔ اس ذمہ داری کی ادائیگی کوئی آسان کھیل نہیں

ہے، اسی لیے مثالی ماں وہ ہوتی ہے جو اپنی اس ذمہ داری کو پوری ایمانداری و اخلاص اور محنت و مشقت کے ساتھ انجام دے کر گھر کو امن و سکون کا گہوارہ بنا دیتی ہے۔

ماں اپنی اولاد کی جسمانی طور پر پرورش کرنے کے ساتھ خیر و شر کے معاملہ میں اس کی رہنمائی بھی کرتی ہے۔ وہ اس کی جسمانی صحت کی دیکھ بھال کرنے کے ساتھ اسے غلط راہوں پر چلنے سے بچاتی ہے، وہ انہیں بچپن میں دین کی تعلیمات اور احکامات سے روشناس کراتی ہے، وہ انہیں شرور و فتن سے بچانے کی فکر کرتی ہے، مضر چیزوں کے بارے میں اسے بتاتی ہے تاکہ وہ اس سے دور رہیں۔ وہ انہیں ان کبیرہ گناہوں سے بھی دور رکھنے کی فکر کرتی ہے جن کے ارتکاب کے بعد انسان جہنم کا ایندھن بن سکتا ہے۔

اصلاً ماں کی ذمہ داری اسی وقت سے شروع ہو جاتی ہے جب بچہ اس کے پیٹ میں ایک جنین (غیر مولود جان) کی شکل میں ہوتا ہے۔ اس کے بعد سے بچہ کی پرورش و پرداخت سے لے کر اس کی تعلیم و تربیت تک کی ساری ذمہ داری مسلسل ماں کے کندھوں ہی پر رہتی ہے۔ بچہ کے تعلق سے ماں کی اہم ذمہ داریاں یہ ہیں:

(ا) رحم مادر میں پرورش پا رہی جان کی حفاظت

رحم مادر میں جنین کی موجودگی کے دوران ماں کے لیے یہ لازم ہے کہ وہ کوئی ایسی غذا نہ استعمال کرے جس سے اس جنین کو نقصان پہنچنے کا خطرہ ہو اور نہ کسی ایسی سرگرمی میں حصہ لے جس کی وجہ سے جنین کے ضائع ہو جانے کا اندیشہ ہو، بلکہ وہ اپنے طور پر جنین کو زندہ اور باقی رکھنے کے لیے ہر کوشش کو بروئے کار لائے، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے مسلمان عورتوں سے یہ عہد و پیمان لیا ہے کہ وہ اپنی اولاد کو قتل نہیں کریں گی۔ عورتوں کی بیعت سے متعلق آیت میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "و لا یقتلن أولادھن" (الممتحنہ / ۱۲) (ترجمہ: اور اپنی اولاد کو قتل نہیں کریں گی) امام قرطبی کا قول ہے: "اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ عورتیں اپنی بیٹیوں کو قتل نہیں کریں گی اور نہ اپنے رحم کے اندر موجود جنین کا اسقاط کریں گی۔[۴]" ابن کثیر نے اس آیت کی تشریح کرتے ہوئے کہا ہے کہ "اس میں بچہ کی پیدائش کے بعد اسے قتل کر دینا شامل ہے جیسا کہ زمانۂ جاہلیت کے لوگ فقر و افلاس کے ڈر سے اپنی اولاد کو قتل کر دیا کرتے تھے نیز اس میں رحم مادر کے اندر پرورش پا رہے جنین کو ضائع کر دینا بھی شامل ہے جیسا کہ بعض جاہل عورتیں حالت حمل سے بچنے کے لیے کچھ ایسی حرکتیں کرتی ہیں جس سے حمل باقی نہیں رہتا ہے۔ بدنیتی اور غلط مقصد کے تحت ہی ایسا کیا جاتا ہے۔"[۵]

اگر کوئی عورت اس طرح کا غلط کام کرے گی تو وہ اللہ کی اعلان کی ہوئی سزا کی مستحق ہو گی۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:" و إذا الموءودة سُئلت بأي ذنب قُتلت" (التکویر/۸-۹)(ترجمہ: اور جب زندہ گاڑی ہوئی لڑکی سے سوال کیا جائے گا کہ وہ کس گناہ کی وجہ سے قتل کی گئی؟)

اسی وجہ سے اسلام میں ماں کو بلاوجہ اسقاط حمل کا حق نہیں ہے۔ الا یہ کہ حمل کی وجہ سے ماں کی جان کو خطرہ لاحق ہو جائے۔ اس صورت میں بڑے نقصان سے بچنے کے لیے ہلکے نقصان کو گوارہ کرنے کے اصول کے تحت اسے اسقاط حمل کی اجازت ہو گی۔ اس طرح کے حالات میں اسقاط حمل کا فیصلہ کوئی قابل اعتماد مسلمان ڈاکٹر ہی کر سکتا ہے۔ اس اعتبار سے ماں کو بچہ کے تعلق سے ایک ذمہ دار کی حیثیت حاصل ہے اور رحم مادر میں اس بچہ کی جان کی حفاظت ماں کی ذمہ داری ہے۔ پھر ولادت کے بعد جب وہ دنیا میں آکر آنکھیں کھولتا ہے تو اسے ماں کی توجہ اور خصوصی دیکھ بھال کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور اس ضرورت کو پوری کرنا ماں ہی کی ذمہ داری ہے۔

(۲) رضاعت

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:" و الوالدات یرضعن أولادهن حولین کاملین لمن أراد أن یتمّ الرضاعة"(البقرۃ/۲۳۳) (ترجمہ: مائیں اپنی اولاد کو دو سال کامل دودھ پلائیں جن کا ارادہ دودھ پلانے کی مدت بالکل پوری کرنے کا ہو) اس آیت کریمہ کی رو سے ماں کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ مکمل دو سال تک اپنے بچہ کو دودھ پلائے۔ اس تعلق سے ابن کثیر کا قول ہے کہ:" اللہ تعالیٰ نے ماؤں کو یہ ہدایت کی ہے کہ وہ اپنے شیر خوار بچوں کی رضاعت کی مدت پوری کریں اور یہ مدت دو سال ہے۔[۶]" اس مدت کے دوران بچہ کو ماں کے دودھ کی لازمی ضرورت ہوتی ہے۔ اس مدت کے دوران ماں کا دودھ بچہ کو کئی طرح کی بیماریوں سے بچاتا ہے اور اس کی جسمانی و نفسیاتی صحت و تندرستی کے لیے بہت اہم مانا جاتا ہے۔

اس بارے میں علماء کا اختلاف ہے کہ آیا رضاعت ماں کا حق ہے یا اس کے فرائض میں شامل ہے؟ اس سلسلہ میں اکثر علماء کا موقف یہ ہے کہ رضاعت ماں کے اوپر عائد ہونے والا بچہ کا حق ہے جسے ماں کو ہی ادا کرنا چاہیے۔ اور آیت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ دو سال تک رضاعت ضروری نہیں ہے، اگر ضروری نہ ہو تو دو سال سے پہلے بھی رضاعت کا سلسلہ ختم کیا جا سکتا ہے۔ رضاعت کی دو سال کی مدت میں کمی یا بیشی کا انحصار اس پر ہو گا کہ اس کی وجہ سے بچہ کو کوئی نقصان لاحق نہ ہو۔

دینی اور شرعی نقطۂ نظر سے رضاعت کو چاہے ماں کی ذمہ داری و فرائض میں شامل کیا جائے یا نہ کیا جائے، لیکن یہ بچہ کی صحت و تندرستی کے لیے بہر حال ضروری ہے۔ عام طور پر مائیں اس ذمہ داری کو اپنی ممتا کے فطری جذبہ کے تحت ادا کرتی ہیں، لیکن بعض غیر فطری حالات میں ماں بچہ کو دودھ پلانے سے انکار بھی کر دیتی ہے۔ اس طرح کے حالات کو ان کے خاص تناظر میں دیکھا جانا چاہیے۔ دینی و شرعی لحاظ ایک ماں اللہ تعالیٰ کے روبرو رضاعت کی اس ذمہ داری کی ادائیگی کے تعلق سے جواب دہ ہے۔ میرے نزدیک یہ قول راجح ہے کہ رضاعت نومولود بچہ کے تئیں ماں کی اولین ذمہ داری ہے، الا یہ کہ اس حق کی ادائیگی کی راہ میں کوئی قدرتی رکاوٹ حائل ہو یا بیماری وغیرہ کے عذر کی وجہ سے ماں کے لیے بچہ کو دودھ پلانا ممکن نہ ہو۔

خاص طور پر ان حالات میں جبکہ طبی نقطۂ نظر سے عالمی سطح پر یہ ثابت ہو چکا ہے کہ بچہ کی صحت و تندرستی کے لیے فطری رضاعت نہایت اہم ہے۔ صحت سے متعلق ہونے والی تحقیقات نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ بچہ کی پیدائش کے بعد ابتدائی دو سالوں کے دوران اس کی صحت و تندرستی اور اچھی جسمانی و عقلی نشو و نما کے لیے فطری رضاعت بہت ضروری ہوتی ہے۔

اس میں کوئی دورائے نہیں ہے کہ بچہ دنیا میں آنکھیں کھولنے کے بعد پہلے ہی دن سے ماں کی شفقت و محبت اور خصوصی توجہ کا محتاج ہوتا ہے، لہٰذا ماں کو اپنا یہ فرض نبھانا ہی چاہیے کیونکہ اس سے راہ فرار کی کوئی گنجائش نظر نہیں آتی ہے۔

(۳) شفقت و مہربانی

دنیا میں آنکھیں کھولنے کے بعد بچہ ماں کی شفقت و محبت کا ویسا ہی محتاج ہوتا ہے جیسا کہ اسے کھانے پینے کی حاجت ہوتی ہے۔ مائیں اپنے بچہ کے لیے فطری طور پر شفیق و مہربان ہوتی ہیں لہٰذا وہ بچہ کی ضرورت کے مطابق اول دن سے اس پر اپنی شفقتیں اور مہربانیاں نچھاور کرنے لگتی ہیں۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بچہ کے لیے ماں کی شفقت و محبت کو اس کی ایک خوبی کے طور پر ذکر کیا ہے۔ ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”اونٹوں پر سواری کرنے والی دنیا کی بہترین عورتیں قریش کی عورتیں ہیں، وہ بچپن میں اپنے بچہ کے لیے سب سے زیادہ شفیق ہوتی ہیں اور شوہر کے مال کی سب سے بہتر طور پر حفاظت کرنے والی ہوتی ہیں۔“[۷]

اسلام دین رحمت ہے۔ وہ مسلمانوں کو ایک دوسرے کے ساتھ رحم دلی کا سلوک کرنے پر آمادہ کرتا ہے۔ ایک موقع پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو دوسرے پر رحم نہیں کرتا اس پر رحم نہیں کیا جاتا ہے۔ اس حدیث رسول کی تفصیل ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے بیان کی ہے کہ "ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حسن رضی اللہ عنہ کو بوسہ دیا جبکہ وہ چھوٹے بچے تھے۔ آپ کے پاس اقرع بن حابس تمیمی بیٹھے ہوئے تھے، انہوں نے کہا: میرے دس بچے ہیں لیکن میں نے آج تک ان میں سے کسی کا بوسہ نہیں لیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی طرف نظر اٹھا کر دیکھا اور فرمایا: جو رحم نہیں کرتا اس پر رحم نہیں کیا جاتا ہے۔۸" اس حدیث میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بتایا ہے کہ بچے پیار کے بھوکے ہوتے ہیں، وہ شفقت و مہربانی کے سلوک کو محسوس کرتے ہیں، اور اسی برتاؤ کے مطابق ان کا رویہ سامنے آتا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام کو بچوں کے ساتھ نرمی و پیار اور شفقت و محبت کا سلوک کرنے کی تعلیم دی، آپ نے انہیں عملی طور پر یہ بتایا کہ بچوں کو کس طرح بوسہ دیا جائے، اور انہیں پیار و شفقت کا احساس دلانے کے لیے کس طرح ان کو گدگدایا جائے اور ان کے ساتھ کھیلا جائے۔ عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت ہے کہ ایک دیہاتی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور کہا: کیا تم لوگ بچوں کو بوسہ دیتے ہو، ہم تو بچے کو بوسہ نہیں دیتے ہیں، یہ سن کر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اگر اللہ تعالیٰ نے تمہارے دل سے جذبہ رحم دلی کو نکال لیا ہے تو میں کیا کر سکتا ہوں؟"۹

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے نواسے اور صحابہ کرام کی اولاد کے ساتھ کھیلتے تھے۔ اس سلسلہ میں اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مجھے اپنے ایک زانو پر بٹھا لیتے اور حسن رضی اللہ عنہ کو اپنے دوسرے زانو پر بٹھا لیتے، پھر آپ دونوں کو سینے سے لگاتے اور فرماتے: اے اللہ! تو ان دونوں پر رحم فرما، میں بھی ان دونوں کے لیے مہربان اور شفیق ہوں۔"۱۰

اللہ تعالیٰ اپنے ان بندوں پر مہربان اور شفیق ہے جو اپنے بچوں کے ساتھ رحمدلی اور شفقت کا برتاؤ کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان ماؤں کو جنت کی بشارت دی ہے جو اپنی بچیوں کی خصوصی نگہداشت کے ساتھ پرورش کرتی ہیں اور انہیں پیار و شفقت کے ساتھ پالتی ہیں۔ عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ "ایک مسکین عورت اپنی دو بچیوں کے ساتھ میرے گھر آئی، میں نے اسے تین کھجوریں دیں۔ اس عورت نے اپنی دونوں بیٹیوں کو ایک ایک کھجور دے دیا اور ایک

کھجور کو خود کھانا چاہا، اتنے میں اس کی بیٹیوں نے وہ کھجور بھی کھانے کی خواہش ظاہر کی تو اس نے اس کھجور کے دو ٹکرے کر کے دونوں بیٹیوں کو کھلا دیا۔ اس عورت کے اس عمل پر مجھے بہت حیرت ہوئی، میں نے اس کا تذکرہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا تو آپ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے اس عمل کی وجہ سے اس عورت کے لیے جنت واجب کر دی یا اللہ نے اسے جہنم سے آزادی عطا کر دی۔"[11]

جب بچوں کو ان کے والدین سے پیار اور شفقت و محبت حاصل ہوتی ہے تو ایک صحت بخش ماحول میں ان کی نشو و نما ہوتی ہے اور پیار و محبت کی فضا میں وہ پروان چڑھتے ہیں، وہ زندگی کی ان اعلیٰ قدروں کو اپنے والدین سے سیکھتے ہیں، پھر وہ دوسروں کے ساتھ رحمدلی اور مہربانی کا سلوک کرتے ہیں۔

(۴) نوزائیدہ بچہ کا نام رکھنا

ماں کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ بچہ یا بچی کے باپ کے ساتھ مشورہ کر کے اس کے لیے ایک اچھا با معنی اور مناسب نام تجویز کرے۔ ابو درداء رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "قیامت کے دن تم لوگوں کو تمہارے ناموں اور تمہارے باپ کے ناموں کے ساتھ پکارا جائے گا، اس لیے تم لوگ اپنے لیے اچھے ناموں کا انتخاب کیا کرو۔"[12]

بچہ کے لیے ایک اچھا اور با معنی نام منتخب کرنا ماں اور باپ دونوں کی ذمہ داری ہے۔ اگر ان میں سے کسی ایک نے بچہ کا ایک اچھا نام رکھ دیا تب بھی کوئی حرج نہیں ہے۔ قرآن مجید میں مذکور ہے کہ عمران کی زوجہ نے اپنی بچی کا نام خود رکھا تھا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "فلما وضعتها قالت رب إني وضعتها أنثى و الله أعلم بما وضعت و ليس الذكر كالأنثى و إني سميتها مريم و إني أعيذها بك و ذريتها من الشيطان الرجيم" (آل عمران / ۳۶) (ترجمہ: جب بچی کو جنا تو کہنے لگیں کہ پروردگار! مجھے تو لڑکی ہوئی، اللہ تعالیٰ کو خوب معلوم ہے کہ کیا اولاد ہوئی ہے اور لڑکا لڑکی جیسا نہیں، میں نے اس کا نام مریم رکھا، میں اسے اور اس کی اولاد کو شیطان مردود سے تیری پناہ میں دیتی ہوں)

اگر بچہ یا بچی کی ماں اس کا نام رکھنے کا ارادہ رکھتی ہو تو اسے اس عمل میں سنت کی پیروی کرنی چاہیے، اسے پسندیدہ اور با معنی نام ہی رکھنا چاہیے اور اسلام میں جو نام ناپسندیدہ ہے اس سے بچنا چاہیے[13]۔ ابو وہب جشمی رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "تم لوگ انبیائے کرام کے ناموں سے اپنے بچوں کو موسوم کرو۔

اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے پسندیدہ نام عبد اللہ اور عبد الرحمٰن ہے اور سب سے سچا نام حارث اور ھمام ہے اور سب سے برا نام حرب اور مرہ ہے۔"[۱۴]

اوپر نقل کی گئی حدیث سے یہ واضح ہو گیا کہ سب سے اچھا نام عبد اللہ اور عبد الرحمٰن ہے، دونوں کے معنی ہیں اللہ کا بندہ۔ "الرحمٰن" اللہ تعالیٰ کے ننانوے صفاتی ناموں میں سے ایک ہے جس کے معنی ہیں بہت زیادہ مہربان۔ ان ناموں کے بعد سب سے اچھے نام انبیائے کرام کے نام ہیں۔

اسلام میں ملک الاملاک نام رکھنا حرام ہے۔ ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ و سلم نے فرمایا: "اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے گھٹیا اور ناپسندیدہ نام ملک الاملاک ہے۔ ابن ابی شیبہ نے ایک روایت میں یہ اضافہ کیا ہے کہ اللہ عزوجل کے سوا کوئی مالک نہیں ہے۔ اشعثی کے بقول سفیان نے کہا: شہنشاہ نام رکھنا بھی اسی کے حکم میں ہے۔"[۱۵]

ابوالقاسم نام رکھنا بھی ممنوع ہے، کیونکہ یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی کنیت تھی۔ جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ ہمارے درمیان رہنے والے ایک شخص کے گھر ایک بچہ کی ولادت ہوئی، اس نے اپنے بچہ کا نام قاسم رکھ دیا۔ ہم نے اس شخص سے کہا کہ ہم تمہیں ابوالقاسم کی کنیت سے اس وقت تک نہیں پکاریں گے جب تک کہ ہم اس کے بارے میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت نہ کرلیں۔ دریافت کرنے پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "تم لوگ میرے نام پر اپنا نام رکھو لیکن میری کنیت اختیار نہ کرو۔"[۱۶]

اس صحابی رسول نے اپنے نومولود بچہ کا نام قاسم رکھ کر خود اپنے لیے ابوالقاسم کی کنیت اختیار کرنے کا ارادہ کیا لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں ایسا کرنے سے منع فرما دیا۔ جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ ہمارے ایک ساتھی کے گھر ایک بچہ کی ولادت ہوئی تو انہوں نے اپنے نومولود بچہ کا نام قاسم رکھ دیا۔ ہم نے ان سے کہا: ہم تمہیں ابوالقاسم کی کنیت سے نہیں پکاریں گے اور نہ اس کنیت کی وجہ سے تمہاری تعظیم کریں گے۔ آپ صلی اللہ علیہ و سلم کو جب یہ بات معلوم ہوئی تو آپ نے فرمایا: "تم اپنے بچہ کا نام عبد الرحمٰن رکھ دو۔"[۱۷]

ایک مسلمان ماں کو "قاسم" نام رکھنے کی ممانعت سے باخبر ہونا چاہیے تاکہ وہ اپنے بچہ کا لاعلمی میں قاسم نام رکھ کر غلطی کا ارتکاب نہ کرے۔ کچھ لوگ جنہیں ابوالقاسم کی کنیت کے تعلق سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کا

علم نہیں ہوتا ہے وہ چاہتے ہیں کہ لوگ انہیں ابو القاسم سے پکاریں۔ وہ شرعی حکم سے ناواقفیت کی بنا پر ایسا کرتے ہیں۔ میں نے یہاں پر ان تمام باتوں کو اس لیے ذکر کیا ہے تا کہ لوگ بچہ کا نام رکھنے کے تعلق سے شرعی احکام و آداب سے واقف ہو جائیں اور ماؤں کو بھی بچہ کے نام رکھنے کے شرعی احکام سے واقفیت ہو جائے تو وہ اپنے بیٹے اور بیٹیوں کا نام رکھنے میں سنت پر عمل کریں۔ سنت نبوی میں بچوں کے بامعنی اور خوبصورت نام رکھنے کی بھی تاکید کی گئی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم برے ناموں کو اچھے ناموں میں تبدیل کر دیا کرتے تھے۔ عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ عمر رضی اللہ عنہ کی ایک بیٹی کو لوگ "عاصیہ" کے نام سے پکارتے تھے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا نام جمیلہ رکھ دیا۔۱۸"

ان نقل کردہ احادیث سے واضح ہو جاتا ہے کہ نومولود بچہ کا نام رکھنے کی ذمہ داری ماں اور باپ دونوں کی ہے، لہٰذا انہیں اپنی اس ذمہ داری کو بخوبی ادا کرنی چاہیے اور بچہ کا اچھا و مناسب نام رکھنے کے شرعی حکم کو بھی اپنے پیش نظر رکھنا چاہیے۔ رہا یہ سوال کہ بچہ کا نام کب رکھا جائے گا؟ تو اس کا انحصار والدین کے اوپر ہے۔ وہ چاہیں تو بچہ کی ولادت کے فوراً بعد بھی باہم مشورہ کر کے بچہ کا نام رکھ سکتے ہیں۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: "رات میرے گھر میں ایک لڑکے کی ولادت ہوئی ہے، میں نے اپنے باپ کے نام پر اس کا نام ابراہیم رکھا ہے۔۱۹" ولادت کے ساتویں دن بھی بچہ کا نام رکھا جاسکتا ہے جیسا کہ حدیث نبوی سے اس کی وضاحت ہوتی ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: "بچہ عقیقہ کے بدلہ گروی رکھا ہوا ہوتا ہے، ساتویں دن اس کا عقیقہ کیا جائے گا، اس کا نام رکھا جائے گا اور اس کے سر کے بال صاف کیے جائیں گے۔"۲۰

بچہ کی پیدائش کے بعد ان کے علاوہ کچھ اور کاموں کو انجام دینا مستحب ہے، مثلاً اس کے کان میں اذان دینا اور تحنیک یعنی کوئی میٹھی چیز چبا کر اس کے منہ میں ڈالنا۔

(۵) بچہ کے کان میں اذان دینا اور کوئی میٹھی چیز اس کے منہ میں ڈالنا

☆ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ طریقہ ہے کہ بچہ کی پیدائش کے فوراً بعد نومولود کے کان میں اذان دی جائے۔ ابو رافع رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ فاطمہ رضی اللہ عنہا نے جیسے ہی حسن رضی اللہ عنہ کو جنم دیا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے کان میں وہ اذان دی جو نماز کے لیے پکاری جاتی ہے۔"۲۱

بچہ کے کان میں اذان دینے کا راز واللہ اعلم جیسا کہ ابن قیم جوزیہ رحمہ اللہ نے ذکر کیا ہے، یہ ہے کہ "بلند ترین پکار کے کلمات سب سے پہلے انسان کی سماعت سے ٹکرائے جس میں رب کی کبریائی اور عظمت کا بیان بھی ہے اور اس شہادت کا تذکرہ بھی ہے جس کے ذریعہ انسان مذہب اسلام میں داخل ہوتا ہے۔ بچہ کے دنیا میں قدم رکھنے کے وقت ان کلمات اذان کی تلقین اسلام کا شعار ہے جیسا کہ دنیا سے رخصت ہوتے وقت اسے کلمۂ توحید کی تلقین کی جاتی ہے۔ بعید نہیں کہ اذان کے کلمات نومولود کے دل پر اثر انداز ہوتے ہیں اور وہ اس کا اثر قبول کرتا ہے، اگرچہ اسے شعور نہیں ہوتا ہے۔"[۲۲]

☆ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ بھی طریقہ ہے کہ کھجور کے ذریعہ اس کی تحنیک کی جائے، یعنی کھجور چبا کر اس کا کچھ حصہ بچہ کے منہ میں ڈالا جائے۔ ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ میرے گھر ایک بچہ کی ولادت ہوئی تو میں اسے لے کر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا، آپ نے اس کا نام ابراہیم رکھا اور کھجور چبا کر اس کے منہ میں ڈالا۔[۲۳] امام نووی کہتے ہیں: اس حدیث سے کئی باتیں معلوم ہوتی ہیں، ان میں سے ایک بچہ کی پیدائش کے بعد اس کی تحنیک ہے۔ اس کے سنت ہونے پر علماء کا اجماع ہے۔ دوسری بات جو اس حدیث سے معلوم ہوتی ہے، یہ ہے کہ کوئی نیک مرد یا نیک عورت ہی بچہ کی تحنیک کرے۔ انہوں نے مزید کہا ہے کہ علماء کا اس پر اتفاق ہے کہ بچہ کی پیدائش کے بعد کھجور کے ذریعہ تحنیک کا عمل مستحب ہے۔ اگر کھجور دستیاب نہ ہو تو اسی جیسی کسی میٹھی چیز کے ذریعہ تحنیک کی جائے گی۔"[۲۴]

تحنیک کے لیے کھجور کے بدلہ شہد کا استعمال بھی کیا جاسکتا ہے۔ تھوڑا سا شہد یا چبائے ہوئے کھجور کا تھوڑا سا حصہ انگلی پر رکھ کر اسے بچہ کے منہ کے اندر ڈالا جائے، بچہ اسے چوسنے لگے گا، اسی دوران نرمی کے ساتھ بچہ کے تالو کو رگڑا جائے۔ اس کی بظاہر حکمت یہ ہے کہ بچہ اس طریقہ سے ماں کے پستان کو منہ میں لینے اور اس کے ذریعہ دودھ چوسنے کے لیے تیار ہوتا ہے۔ تحنیک کے ذریعہ بچہ کا منہ ماں کا دودھ پینے کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔

(۶) عقیقہ

شرعی حکم عقیقہ کا مطلب یہ ہے کہ بچہ کی پیدائش کے ساتویں دن اگر لڑکا ہے تو دو بھیڑ یا بکری اور لڑکی ہے تو ایک بھیڑ یا بکری اس کے عقیقہ کے طور پر ذبح کی جائے۔ بچہ کی پیدائش کے بعد اس نومولود کا والدین کے اوپر یہ حق ہے کہ وہ اس کا عقیقہ کریں۔ سلمان بن عمار رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ میں نے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ

فرماتے ہوئے سنا: ”بچہ کے ساتھ اس کا عقیقہ بھی ہے۔ تم لوگ اس کی طرف سے جانور ذبح کر کے خون بہاؤ اور اس سے تکلیف کو دور کرو۔۲۵؎“ اس سے تکلیف دور کرنے کا مطلب یہ ہے کہ جانور ذبح کرنے کے بعد بچہ کے سر کے بال صاف کر دیئے جائیں۔

دیگر متعدد احادیث سے بھی عقیقہ کی مشروعیت معلوم ہوتی ہے۔ ان میں سے ایک حدیث وہ ہے جو پیچھے گزر چکی ہے کہ ”بچہ عقیقہ کے لیے گروی ہوتا ہے۔ پیدائش کے ساتویں دن اس کی طرف سے جانور ذبح کیا جائے، اس کا نام رکھا جائے اور اس کے سر کے بال صاف کر دیئے جائیں۔“۲۶؎

لڑکے کی طرف سے دو بکریاں اور لڑکی کی طرف سے ایک بکری بطور عقیقہ ذبح کرنا مسنون ہے۔ حدیث نبوی میں اس کی صراحت بھی آئی ہے۔ عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لڑکے کی طرف سے ایک جسامت کی دو بکریاں اور لڑکی کی طرف سے ایک بکری ذبح کرنے کا حکم دیا۔۲۷؎

عقیقہ کی مشروعیت کے حکم کے بارے میں فقہاء کا اختلاف ہے۔ کچھ لوگوں نے اسے سنت مؤکدہ کہا ہے اور دوسروں نے اسے واجب قرار دیا ہے۔ جمہور فقہاء کے نزدیک عقیقہ کرنا سنت ہے، ان کی دلیل نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد ہے: ”جس کے گھر میں کسی بچہ کی ولادت ہو اور وہ جانور قربان کرنے کا ارادہ رکھتا ہو تو اسے اس کام کو کر ڈالنا چاہیے۔“ امام حسن، لیث اور داؤد ظاہری کے نزدیک عقیقہ کرنا واجب ہے۔ ان کی دلیل آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد ہے: ”ہر نومولود بچہ اپنے عقیقہ کی وجہ سے گروی ہوتا ہے۔“ اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ نومولود بچہ عقیقہ ہونے تک گروی رکھے ہوئے سامان کی طرح قید میں ہوتا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عقیقہ کرنا ماں باپ کے اوپر واجب ہے۔

عقیقہ چاہے واجب ہو یا سنت بہر حال ایک ماں کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ بچہ کی ولادت کے بعد اس کے عقیقہ کی سنت ادا کرنے کی فکر کرے۔ پیدائش کے ساتویں دن وہ نومولود کے عقیقہ کی تقریب کا اہتمام کرے، اس دن وہ بچہ کے والد یا سرپرست سے کہے کہ وہ اس بچہ کی طرف سے جانور ذبح کرے، پھر وہ یا تو خود سے بچہ کے سر کے بال کو صاف کر دے یا کسی کو بلوا کر اس کے سر کے بال اتروا دے اور اس بال کے وزن کے برابر سونا یا چاندی صدقہ کر دے۔ فاطمہ رضی اللہ عنہا کے صاحبزادے حسن رضی اللہ عنہ کی پیدائش کے وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے یہ فرمایا تھا کہ ”اے فاطمہ! اس کے سر کے بال کو صاف کر دو اور اس کے بال کے وزن کے برابر سونا صدقہ کر دو۔“۲۸؎

نومولود بچہ کی ماں کو چاہیے کہ وہ اپنے احباب اور رشتہ داروں کو عقیقہ کا گوشت کھانے کی دعوت دے۔ عقیقہ کے گوشت کو استعمال کرنے کے سلسلہ میں مستحب یہ ہے کہ ہڈیوں کو توڑے بغیر ذبح کی ہوئی بکری کے اعضاء کو الگ الگ کر لیا جائے۔ اس سلسلہ میں عائشہ رضی اللہ عنہا کا قول ہے: "عقیقہ میں ذبح کیے ہوئے جانور کو مسلم پکایا جائے گا اور اس کی ہڈیاں توڑی نہیں جائیں گی، اس کا گوشت خود بھی کھایا جائے گا، دوسروں کو بھی کھلایا جائے گا اور صدقہ بھی کیا جائے گا۔"[۲۹]

نومولود بچہ کی ماں ان تمام شرعی ذمہ داریوں کو ادا کرتے ہوئے سنت نبوی پر عمل کرنے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقہ پر چلنے کی نیت کرے گی تاکہ اللہ تعالیٰ اس کے بچہ میں خیر وبرکت عطا فرمائے اور اسے ہر طرح کے شرور وفتن سے محفوظ رکھے۔ ان شرعی احکام پر عمل کرنے کا دوسرا اہم فائدہ یہ ہے کہ مسلم معاشرہ میں اس کی وجہ سے سنت نبوی پر عمل کرنے کا چلن عام ہوگا اور ان بہت ساری بدعات کا خاتمہ ہوگا جن پر ہر زمانے میں مائیں اپنے بچوں کی پیدائش کے وقت عمل کرتی رہی ہیں۔ افسوس کہ اس قبیل کی بہت سی بدعات وخرافات آج بھی ہمارے معاشرہ میں رائج ہیں۔

(۷) ختنہ

بچہ کا ختنہ ان امور میں سے ہے جو شرعی طور پر مطلوب ہیں۔ خاص طور پر لڑکے کا ختنہ ایک مذہبی فریضہ اور شرعی ذمہ داری ہے۔ اس کی مشروعیت کی دلیل ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "پانچ چیزیں فطرت میں سے ہیں؛ ختنہ کرنا، زیر ناف بالوں کو صاف کرنا، ناخن کاٹنا، بغل کے بال اکھاڑنا اور مونچھوں کے بال کترنا۔"[۳۰]

امام نووی کا قول ہے: ختنہ سے مراد یہ ہے کہ حشفہ کے اوپر کے چمڑے کو کاٹ کر الگ کر دیا جائے یہاں تک کہ حشفہ بالکل ظاہر ہو جائے۔ یہ ذمہ داری ولی کی ہے کہ وہ اپنے بیٹے کے بالغ ہونے سے پہلے اس کا ختنہ کرا دے۔ زیادہ بہتر یہ ہے کہ بچہ کی پیدائش کے ساتویں دن ختنہ کر دیا جائے۔"[۳۱]

پیدائش کے ساتویں دن بچہ کا ختنہ کرنا ضروری نہیں ہے لیکن مستحب یہ ہے کہ بچپن ہی میں بچہ کا ختنہ کرا دیا جائے تاکہ اسے زیادہ تکلیف کا احساس نہ ہو اور نہ نفسیاتی طور پر زیادہ متاثر ہو۔

ختنہ کی مشروعیت کے تعلق سے علماء کا اختلاف ہے ۳۲ کہ آیا یہ واجب ہے یا سنت ہے؟

امام مالک، امام شافعی اور امام احمد کا موقف یہ ہے کہ ختنہ واجب ہے۔ ان سب نے اس کے لیے کئی دلیلوں سے استدلال کیا ہے جن میں سے ایک یہ حدیث نبوی بھی ہے کہ ایک شخص نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور اس نے عرض کیا کہ میں نے اسلام قبول کر لیا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”تم زمانۂ کفر کے ان بالوں کو کٹوا لو اور ختنہ کرا لو۔“ ۳۳

امام ابو حنیفہ اور امام احمد کے چند اصحاب کا موقف یہ ہے کہ ختنہ کرانا سنت ہے۔ ان کے پاس بھی اس کے کئی دلائل ہیں جن میں سے ایک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد گرامی ہے کہ ”ختنہ مردوں کے لیے سنت اور عورتوں کے لیے باعث عزت افزائی ہے۔“ ۳۴

ختنہ کا یہ حکم لڑکے کے لیے ہے۔ جہاں تک لڑکی کا تعلق ہے تو اس کے لیے ختنہ جائز ہے لیکن واجب نہیں ہے، اس لیے کہ لڑکی کے ختنہ کے تعلق سے جو حدیث اوپر نقل کی گئی ہے وہ ضعیف حدیث ہے۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے جب اپنے عہد مبارک میں مسلمانوں کے لیے ختنہ کرانے کو مشروع کیا تھا تو یہ حکم مردوں کے لیے تھا، عورتوں کے لیے نہیں تھا۔ یہ ثابت نہیں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی عورت کو ختنہ کرانے کا حکم دیا ہو اور نہ عورتوں کے ختنہ کے سلسلہ میں کوئی صحیح حدیث وارد ہوئی ہے۔ واللہ اعلم۔

تربیت کی ذمہ داری

بچہ کے تعلق سے ان تمام ذمہ داریوں کو ادا کرنے کے بعد جن کا تذکرہ اوپر آیا ہے اور جو بچہ کی زندگی کے ابتدائی مرحلہ میں معمول کا حصہ ہوا کرتا ہے، بچہ کی باقاعدہ تربیت کا مرحلہ شروع ہوتا ہے۔ اس سے مراد بچہ کی جسمانی، عقلی اور روحانی تربیت ہے۔

جسمانی تربیت

یعنی شروع ہی سے بچہ کی جسمانی صحت کی حفاظت کی جائے تاکہ وہ ایک طاقتور اور صحیح سالم انسان کے طور پر نشو ونما پائے اور وہ ہر طرح کے امراض وعلل اور نقائص جسمانی سے محفوظ رہے تاکہ آگے چل کر اس کی زندگی میں کوئی رکاوٹ اور مشکل پیدا نہ ہو۔

عقلی و فکری تربیت

اس کے لیے شروع ہی سے ماں اپنے بچہ کو صحیح معلومات اور جانکاری فراہم کرے اور اسے مفید علوم سے لیس کرنے کی کوشش کرے تاکہ اس کے اندر صحیح طور پر غور و فکر کرنے اور زندگی کے ساتھ صحیح طور پر ہم آہنگ ہونے کی صلاحیت اور خود اعتمادی پیدا ہو اور آگے چل کر وہ اپنے لیے اور امت کے لیے ایک مفید انسان ثابت ہو۔

روحانی یا ایمانی تربیت

اس کے لیے شروع ہی سے بچہ کو صحیح عقیدہ پر مبنی معلومات فراہم کی جائے، اسلامی شریعت کی بنیادی باتوں کی اسے تعلیم دی جائے، مختلف طرح کی عبادات کو انجام دینے کا اسے عادی بنایا جائے، بلند اسلامی اخلاق کے زیور سے اسے آراستہ کیا جائے تاکہ وہ خیر و بھلائی کا دلدادہ اور شر و فساد سے نفرت کرنے والا ہو تبھی وہ ایک صالح و متقی مسلمان کہلانے کا مستحق ہو گا۔

امام غزالی نے اپنی کتاب "احیاء علوم الدین" میں بچہ کی تربیت کے موضوع پر گفتگو کی ہے۔ وہ کہتے ہیں: "تم سب اس حقیقت کو جان لو کہ بچوں سے متعلق کاموں اور ذمہ داریوں میں سب سے اہم اور ضروری ان کی تربیت کا کام ہے۔ بچہ والدین کے ذمہ امانت ہے، اس کا صاف و شفاف دل ایک نفیس جوہر کی طرح نقش و نگار سے پاک و صاف ہوتا ہے۔ اس کا دل ہر قسم کے نقش و نگار اور اشکال و صور کو قبول کرنے کی حالت میں ہوتا ہے اور ہر اس چیز کی طرف مائل ہونے کی صلاحیت رکھتا ہے جس کی طرف اسے مائل کیا جائے۔ اگر اسے خیر و بھلائی کا عادی بنایا جائے گا اور نیکی کی تعلیم دی جائے گی تو خیر ہی پر اس کی نشو و نما ہو گی اور دنیا و آخرت کی سعادت و کامرانی اس کے حصہ میں آئے گی۔ اس اجر و ثواب میں اس کے والدین، معلمین اور ادب سکھانے والے لوگ بھی اس کے ساتھ شریک ہوں گے۔ اور اگر اسے شر و فساد کا عادی بنایا گیا یا جانور کی طرح اسے بالکل آزاد چھوڑ دیا گیا اور اس کی تربیت کا اہتمام نہیں کیا گیا تو وہ بچہ شقاوت و بدبختی کا شکار ہو کر دنیا و آخرت دونوں جگہ تباہ و برباد ہو جائے گا۔ اور اس کا گناہ سرپرست اور والدین کی گردن پر ہو گا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "يا أيها الذين آمنوا قوا أنفسكم و أهليكم نارا" (التحریم/٦)(ترجمہ: اے ایمان والو! تم اپنے کو اور اپنے گھر والوں کو جہنم کی آگ سے بچاؤ) باپ ماں اپنے بچہ کو دنیا کی آگ سے بچانے کے لیے تو بہت جتن کرتے ہیں لیکن اصل ہمدردی و خیر خواہی یہ ہے کہ وہ اسے آخرت کی آگ سے بچالیں۔ اور بچہ کو آخرت کی آگ سے بچانے کا ایک ہی

راستہ ہے کہ اسے اچھے آداب و سلوک سے مزین کیا جائے، بچپن ہی سے اسے تہذیب و شائستگی کی تعلیم دی جائے اور اسے عمدہ اخلاق سے آراستہ کر دیا جائے نیز بری صحبتوں سے اس کی حفاظت کی جائے۔"۳۵ـ

ذیل میں تربیت کے ان تینوں گوشے پر تفصیل کے ساتھ گفتگو کی جائے گی۔

(ا)جسمانی تربیت

ماں بچہ کی جسمانی تربیت کے لیے جن باتوں کا خاص خیال رکھے گی تا کہ بچہ طاقت و قوت کے ساتھ صحیح سالم طور پر پروان چڑھ سکے وہ وہی تعلیمات ہیں جو ہمارے نبی ہادی و بشیر صلوات اللہ و سلامہ علیہ کے ذریعہ ہمیں دی گئی ہیں۔ ان تعلیمات نبویہ کو نیچے کی سطروں میں مختلف نکات کے تحت بیان کیا جارہا ہے۔

(۱) پہلی چیز: جسم، کپڑے اور جگہ کی صفائی

انسان کی جسمانی صحت کی بنیاد اور اس کا مضبوط ستون صفائی اور ستھرائی ہے۔ ایک اچھی اور صحت مند انسانی زندگی کے جو بنیادی اصول ہو سکتے ہیں ان میں سے ایک کو قرآن مجید نے واضح طور پر بیان کر دیا ہے اور وہ ہے صفائی و ستھرائی۔ اسلام نے انفرادی طور پر صفائی و ستھرائی کا اہتمام کرنے کی بھی تعلیم دی ہے اور ماحول کو صاف ستھرا بنا کر رکھنے کا بھی حکم دیا ہے۔ اسلام نے عبادات کی ادائیگی کے لیے طہارت کو بنیادی شرط قرار دیا ہے مثلاً نماز کے لیے سب سے اولین شرط یہ ہے کہ انسان کا بدن، کپڑا اور وہ جگہ پاک ہو جہاں پر وہ نماز پڑھنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ اسلام میں طہارت و صفائی کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس سلسلہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: "طہارت آدھا ایمان ہے۔"۳۶ـ

ایک مسلمان ماں کو اپنے گھر کو اس طرح پاک و صاف رکھنا چاہیے کہ اس میں نجاست و گندگی کا کہیں پر بھی کوئی شائبہ تک نہ ہو تا کہ گھر کے لوگ جہاں پر چاہیں نماز پڑھ لیں۔ عورت کا گھر ہی اس کے نماز پڑھنے کی جگہ ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "و عهدنا إلى إبراهيم و إسماعيل أن طهرا بيتي للطائفين و العاكفين و الرّكع السجود" (البقرة/۱۲۵)(ترجمہ:

ہم نے ابراہیم اور اسماعیل سے وعدہ لیا کہ تم میرے گھر کو طواف کرنے والوں، اعتکاف کرنے والوں اور رکوع سجدہ کرنے والوں کے لیے پاک صاف رکھو)

قرطبی اس آیت کی تفسیر میں کہتے ہیں کہ پاک وصاف رکھنے کے اس حکم میں تمام مساجد شامل ہیں جو کہ اللہ تعالیٰ کا گھر ہیں۔ چونکہ عورت کا گھر ہی اس کی سجدہ گاہ ہے اس لیے اسے اپنے گھر کو پاک وصاف رکھنا چاہیے۔ اس آیت میں خانہ کعبہ کو پاک وصاف رکھنے کا تذکرہ خصوصیت کے ساتھ اس لیے کیا گیا ہے کہ اس کی حرمت تمام مساجد سے بڑھ کر ہے۔"۳۷

ماں کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے چھوٹے بچوں کو بچپن ہی سے پاکی وطہارت کی بنیادی باتیں سکھائے۔ انہیں استنجاء، وضو اور غسل کے طریقے سکھائے اور ان سب کی عملی مشق کرائے اور بچے جب ان کاموں کو کر رہے ہوں تو یکسو ہو کر ان کی نگرانی کرے۔ اگر ان اولادوں میں سے کوئی بیٹی بھی ہو تو اس کے سن بلوغ کو پہنچنے کے وقت اسے علاحدہ طور پر حیض کے احکام سے واقف کرائے۔ اسے پاکی وطہارت کی تعلیم دیتے وقت یہ بتائے کہ دوران حیض وہ کیسے اپنے کپڑے اور لباس کی حفاظت کرے گی اور اسے نجاست سے بچائے گی۔ اور اگر وہ نجس خون کپڑے میں کہیں لگ جائے تو حفظان صحت کے اصولوں کی رعایت کرتے ہوئے کیسے اسے صاف کرے گی اور حیض کی مدت کے اختتام پر وہ کس طرح پاکی کا غسل کرے گی وغیرہ۔ بچوں کو پاکی وطہارت کی یہ تعلیم سنت نبوی کی اتباع میں دی جائے گی۔ آپ صلی اللہ علیہ و سلم خود عورتوں کو پاکی وطہارت کی تعلیم دیتے تھے، بسا اوقات آپ کی تعلیمات کو عورتوں تک پہنچانے میں آپ کی ازواج مطہرات واسطہ بنتی تھی جبکہ شرم وحیا کا کوئی معاملہ درپیش ہوتا تھا۔ نوجوان لڑکیوں کو پاکی صفائی اور طہارت کی تعلیم دینے کی حد درجہ اہمیت ہے، کیونکہ اسی پر ان کی صحت وتندرستی اور جسمانی بہتری کا دارومدار ہے۔ جب بچے پاکی وطہارت کے احکامات اور طریقے پر عمل کرتے ہوئے بڑے ہوں گے تو پھر وہ زندگی بھر ان صحت بخش اصولوں پر عمل کرتے رہیں گے۔ طہارت کے آداب میں کئی چیزیں شامل ہیں مثلاً:

(الف) بیت الخلاء کے آداب، استنجاء کا طریقہ، پیشاب کی چھینٹوں اور قطرات سے بچنے کا طریقہ، ان چیزوں کی عادت جب تک بچپن سے نہیں پڑے گی تو بڑے ہو کر بھی وہ پاکی وصفائی کا اہتمام نہیں کر پائے گا۔ پیشاب سے نہ بچنے والوں کے لیے حدیث میں سخت ترین وعید وارد ہوئی ہے۔ عبد اللہ ابن عباس رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ ایک

مرتبہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم دو قبروں کے پاس سے گزرے تو فرمایا: ان دونوں قبر والوں کو عذاب دیا جارہا ہے اور ان کو کسی بڑے گناہ کی وجہ سے عذاب نہیں دیا جارہا ہے۔ ان میں سے ایک کو چغل خوری کی وجہ سے عذاب دیا جارہا ہے اور دوسرے کو پیشاب کے قطرات سے نہ بچنے کی وجہ سے عذاب دیا جارہا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کھجور کی ایک تازہ ٹہنی منگائی اور اسے چیر کر دو ٹکرے کیے، پھر ان دونوں قبروں پر ایک ایک ٹہنی گاڑ دیا اور فرمایا: شاید ان کے عذاب میں اس وقت تک کے لیے تخفیف کر دی جائے جب تک یہ ٹہنیاں سوکھ نہیں جاتی ہیں۔"۳۸

اس حدیث نبوی میں یہ صراحت موجود ہے کہ ایک مسلمان کے لیے پیشاب کے قطرات سے بچنا ضروری ہے، اس کے بغیر اسے پاکی وطہارت حاصل نہیں ہو سکتی ہے، اس کے لیے پیشاب کرنے کے بعد عضو کو دھونا ضروری ہے تاکہ پیشاب کے قطرات سے جسم اور کپڑا ملوث نہ ہو۔ اگر کوئی شخص پیشاب کرنے کے بعد عضو کو دھونے کا اہتمام نہیں کرے گا تو اس کی وجہ سے اس کی نماز باطل ہو جائے گی، کیونکہ نماز کے صحیح ہونے کے لیے جسم، کپڑے اور جگہ کا پاک ہونا اولین شرط ہے۔

اس لیے یہ ماں کی ذمہ داری ہے کہ وہ بچوں کو پاکی وطہارت حاصل کرنے کی تعلیم دے، انہیں استنجاء وبیت الخلاء کے آداب سے واقف کرائے۔ صحیح حدیث سے یہ بات ثابت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پانی سے استنجاء کیا کرتے تھے۔ انس بن مالک رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب قضائے حاجت کے لیے باہر نکلتے تو میں ایک لڑکے کے ساتھ مل کر پانی کا برتن اٹھالیتا تھا، آپ اس پانی سے استنجاء کرتے تھے۔"۳۹

آپ صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کرام کو بیت الخلاء کے آداب بھی سکھاتے تھے۔ اس سلسلہ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: "تم میں سے کوئی شخص پیشاب کرتے وقت دائیں ہاتھ سے اپنی شرمگاہ کو نہ چھوئے اور نہ دائیں ہاتھ سے بول وبراز کے بعد گندگی کو صاف کرے اور نہ پانی پیتے وقت برتن میں سانس لے۔"۴۰

(ب) ماں کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے بچوں کو دن میں متعدد مرتبہ مسواک سے دانت صاف کرنے کا طریقہ سکھائے تاکہ اس کے ذریعہ وہ اپنے دانتوں کی حفاظت کو یقینی بنا سکیں اور اس کی وجہ سے وہ صحت مند بھی رہیں۔ اس طرح وہ اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت پر عمل کرنے والے بھی ہوں گے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: "مسواک منہ کی پاکی وصفائی کا ذریعہ اور رب کی خوشنودی کا سبب ہے۔"۴۱

اسلام نے دانتوں کی صفائی پر خصوصی توجہ دی ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی بہت زیادہ تاکید کی ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: "اگر مجھے یہ اندیشہ نہ ہوتا کہ میں اپنی امت کو مشقت میں ڈال دوں گا تو میں ہر نماز کے وقت ان کو مسواک کرنے کا حکم دیتا۔"[۴۲]

امام نووی کہتے ہیں: "اس حدیث سے وقفہ وقفہ سے مسواک کرنے کی فضیلت معلوم ہوتی ہے، خاص طور پر ہر نماز سے پہلے۔ اس حدیث میں مسواک کا اہتمام کرنے اور بار بار مسواک کرنے کی تاکید بھی موجود ہے۔"[۴۳]

سائنس نے مسواک کے اہتمام کی اس حکمت کو واضح کر دیا ہے جس کی وجہ سے اسلام میں مسلمانوں کو مسواک کرنے کی خصوصی تاکید کی گئی ہے۔ صحت کے نقطۂ نظر سے مسواک کی اہمیت کے عنوان کے تحت یہ وضاحت کی گئی ہے کہ دانتوں کی صفائی کا اہتمام کرنے کی وجہ سے انسان کی صحت اچھی رہتی ہے، اس کی وجہ سے وہ کئی طرح کی بیماریوں سے محفوظ رہتا ہے۔ انسان کا منہ اپنے جائے وقوع کے اعتبار سے انسان کے نظام ہضم اور نظام تنفس کا دروازہ ہے اور خارجی ماحول سے متصل ہونے کی وجہ سے وہ ان بہت سے جراثیم کی زد میں ہوتا ہے جسے ہم منہ کے خصوصی جراثیم کا نام دیتے ہیں۔ یہ جراثیم ایک صحت مند انسان کو متاثر کرنے میں ناکام رہتے ہیں لیکن جب انسان اپنے منہ کی صفائی اور اس کی صحت کی طرف سے غفلت برتتا ہے تو یہی جراثیم اس کے لیے موذی اور مہلک ثابت ہوتے ہیں، علاوہ ازیں جب انسان بیمار پڑ جاتا ہے اور اس کی وجہ سے اس کی قوت مدافعت کمزور ہو جاتی ہے تو اس صورت حال میں بھی یہ جراثیم متحرک ہو کر اس کی صحت کے لیے خطرہ بن جاتے ہیں۔ اس سے دانتوں کی صفائی اور اسے صحت مند رکھنے کی اہمیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

نیچے کی سطروں میں منہ اور دانتوں کے ان امراض کا تذکرہ کیا جا رہا ہے جو دانتوں کی دیکھ بھال اور صفائی نہ کرنے کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں:

۱۔ دانتوں کا کمزور اور کھوکھلا ہونا۔

۲۔ دانت کی جڑوں میں سخت قسم کی گندگی کا جم جانا۔

۳۔ دانت کا پیلا ہو جانا۔

۴۔ منہ اور مسوڑھے کی سوزش۔

۵۔ چھالے پڑ جانے کی وجہ سے منہ کی سوزش۔

۶۔ پھنسیوں کی وجہ سے منہ کی سوزش۔

یہ سب دانت اور منہ کے خطرناک امراض ہیں۔ اس کی وجہ سے نہ صرف دانتوں اور منہ کو نقصان پہنچتا ہے بلکہ منہ اور دانت سے تجاوز کر کے یہ جسم کے دیگر اعضاء کو بھی متاثر کر سکتے ہیں کیونکہ جسم کے دوسرے نظام بھی منہ سے جڑے ہوئے ہیں مثلاً نظام ہضم، نظام تنفس، نظام چشم اور نسوں کا نظام۔ ۴۴؎

ان تمام باتوں کا خلاصہ یہ ہے کہ اسلام میں مسواک کرنے اور اس کے ذریعہ دانتوں کو صاف رکھنے کی اہمیت مسلم ہے۔ اس کے بے شمار جسمانی فوائد ہیں جن سے ایک مسلمان صرف نظر نہیں کر سکتا ہے۔ اسے ہر حال میں اپنے دانتوں کی صفائی کے لیے مسواک کرنے کا اہتمام کرنا چاہیے۔ نیز اس سے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام حکموں کی تعمیل کرنے اور آپ کی اتباع کو لازم پکڑنے کی اہمیت بھی معلوم ہوتی ہے۔ اس لیے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی بھی حکم حکمت سے خالی نہیں ہے۔ آپ کے ہر حکم میں مسلمانوں کے لیے بے شمار فوائد و منافع موجود ہیں۔

(ج) ماؤں کی یہ ذمہ داری بھی ہے کہ وہ اپنے بچوں کو وضو کرنے کا طریقہ سکھائیں، اس لیے کہ نماز پڑھنے کے لیے وضو کرنا ضروری ہے اور بچوں کو سات سال کی عمر ہی سے نماز پڑھنے کا عادی بنانے کا حکم دیا گیا ہے۔ اسلام میں صفائی ستھرائی کی کتنی زیادہ اہمیت ہے اس کا اندازہ وضو سے لگایا جا سکتا ہے۔ مسلمانوں کو ہر نماز سے پہلے وضو کرنے کا حکم اسی لیے ہے تاکہ دن بھر ان کے اعضاء صاف ستھرے رہیں اور وہ اس کی تازگی کو محسوس کریں۔ وضو میں چہرے، دونوں ہاتھوں، کہنیوں اور دونوں پاؤں کو اچھی طرح پانی سے دن میں پانچ مرتبہ دھویا جاتا ہے۔ انسانوں کے یہ تمام اعضاء عام طور پر کھلے ہوتے ہیں اور ہمارے روزمرہ کے کاموں میں سب سے زیادہ استعمال ہوتے ہیں، اس کی وجہ سے ان اعضاء پر بار بار دھول مٹی لگنے کا امکان بھی زیادہ رہتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو ان الفاظ میں وضو کرنے کا حکم دیا ہے: ”یا أیھا الذین آمنوا إذا قمتم إلی الصلاۃ فاغسلوا وجوھکم و أیدیکم إلی المرافق و امسحوا برؤوسکم و أرجلکم إلی الکعبین“ (المائدۃ/٦) (ترجمہ: اے ایمان والو! جب تم نماز کے لیے اٹھو تو اپنے منہ کو اور اپنے ہاتھوں کو کہنیوں سمیت دھولو، اپنے سروں کا مسح کرو اور اپنے پاؤں کو ٹخنوں سمیت دھولو)

اس آیت مبارکہ کی تشریح اس حدیث نبوی میں موجود ہے جس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے وضو کی کیفیت کا بیان ہے۔ عبد اللہ بن زید بن عاصم مازنی رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو وضو کرتے ہوئے دیکھا، آپ نے پہلے منہ میں پانی ڈال کر کلی کی، پھر ناک میں پانی ڈال کر ناک کو صاف کیا، پھر تین مرتبہ

اپنے چہرہ کو دھویا، پھر دائیں ہاتھ کو تین مرتبہ، پھر بائیں ہاتھ کو تین مرتبہ دھویا، پھر از سر نو پانی لے کر سر کا مسح کیا، پھر اپنے دونوں پاؤں کو تین مرتبہ دھویا، یہاں تک دونوں کو بالکل صاف کر دیا۔۴۵ ؎" نیا پانی لے کر سر کا مسح کرنے کا مطلب یہ ہے کہ ہاتھ پر جو پانی لگا ہوا تھا اس سے مسح نہیں کیا بلکہ مسح کرنے کے لیے تازہ پانی استعمال کیا۔۴۶ ؎

(د) ماؤں کی یہ ذمہ داری بھی ہے کہ وہ بچوں کے اندر غسل کرنے کی عادت ڈالیں اور غسل کے احکام سے انہیں واقف کرائیں۔ جسم کو صحت مند اور صاف ستھرا رکھنے کے لیے غسل بہت ضروری اور اہم ہے۔ اسی لیے اسلام میں بعض حالات میں غسل کرنا واجب ہے اور کچھ حالات میں غسل کرنا مسنون ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جمعہ کے دن غسل کرنے کی تاکید اسی لیے کی ہے تاکہ کچھ لوگ اپنے جسم کی صفائی کرنے میں سستی نہ کریں جبکہ ان پر غسل واجب نہ ہو، اسی لیے آپ نے اس کی ایک ادنی حد مقرر کر دی اور بتا دیا کہ اسلام اس سے کم پر راضی نہیں ہے۔ اس سلسلہ میں عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے منبر پر کھڑے ہو کر فرمایا: "تم میں سے جو شخص جمعہ کے دن مسجد آئے تو اسے پہلے غسل کر لینا چاہیے۔۴۷ ؎" نیز ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "جمعہ کے دن ہر بالغ پر غسل واجب ہے۔۴۸ ؎" ماؤں کو چاہیے کہ وہ اپنے بچوں کو غسل کرنے کا عادی بنائیں اور انہیں جسم کی صفائی ستھرائی کی ترغیب دیں تاکہ بچپن ہی سے ان کے اندر غسل کرنے اور جسم کو صاف ستھرا رکھنے کی رغبت پیدا ہو۔

اسلام میں جس طرح جسم کی صفائی ستھرائی کی تعلیم دی گئی ہے اسی طرح کپڑے کو پاک وصاف رکھنے کی تاکید کی گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "و ثیابک فطھر" (المدثر/۴) (ترجمہ: اور آپ اپنے کپڑے پاک وصاف رکھیے) عبادات کے مقبول ہونے کے لیے کپڑے کا پاک ہونا شرط ہے۔ اس کے لیے ہر انسان کو اپنے کپڑے کو تمام قسم کی نجاستوں سے پاک رکھنے کی فکر کرنی چاہیے۔ ایک مسلمان کو صرف ظاہری زیب وزینت پر توجہ نہیں دینی چاہیے بلکہ اسے اپنے کپڑے کو پاک وصاف رکھنے کی فکر کرنی چاہیے۔ خاص طور پر اجتماعی عبادات اور اسلامی تہواروں عید الفطر اور عید الاضحی کے موقعوں پر کپڑے کی پاکی وصفائی کا زیادہ اہتمام کرنا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "یا بنی آدم خذوا زینتکم عند کل مسجد" (الأعراف/۳۱) (ترجمہ: اے اولاد آدم! تم مسجد کی ہر حاضری کے وقت اپنا لباس پہن لیا کرو) اس آیت

میں مسجد میں حاضر ہونے سے پہلے زینت اختیار کرنے کی بات کہی گئی ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ ایک مسلمان نمازوں کی ادائیگی سے پہلے مناسب لباس زیب تن کرے جس سے مکمل طور پر اس کی ستر پوشی ہوتی ہو۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے لباس کا خاص دھیان رکھتے تھے۔ آپ جب بھی گھر سے باہر نکلتے تو پر کشش نظر آتے تھے کیونکہ آپ اپنے لباس کی صفائی ستھرائی کا خاص خیال رکھتے تھے۔ آپ خود سے اپنے کپڑے میں پیوند لگاتے اور اس کی اصلاح فرماتے تھے۔ اسی طرح آپ اپنے جوتوں کو دھول مٹی سے صاف رکھتے تھے۔ آپ عام طور پر صحابہ کرام کی توجہ اس بات کی طرف مبذول کراتے تھے کہ وہ اپنے کپڑے صاف رکھا کریں اور اجتماعی مواقع پر جو میسر ہوں ان میں سے اچھے لباس زیب تن کیا کریں۔ بعض صحابہ کرام جمعہ کے دن کام کے کپڑے ہی میں مسجد چلے آتے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے ارشاد فرمایا: ”اگر تم میں سے کوئی شخص اپنے کام کے کپڑے کے علاوہ جمعہ کے لیے دو کپڑے خرید لے تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔“ ۴۹ؔ

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کو عطر اور خوشبو استعمال کرنے کی بھی ترغیب دی ہے تاکہ کوئی مسلمان اگر دوسروں کے ساتھ کسی جگہ موجود ہو تو صرف اچھی خوشبو ہی اس کے جسم سے نکلے اور مسجد کے اندر، عوامی مقامات پر اور راستہ میں کسی مسلمان کے جسم کی ناپسندیدہ بو سے دوسرے مسلمان کو اذیت محسوس نہ ہو۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس کے لیے صحابہ کرام کو ترغیب دیتے رہتے تھے۔ چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: ”جو شخص جمعہ کے دن غسل کرتا ہے، صفائی ستھرائی اور پاکی وطہارت کا اہتمام کرتا ہے، اپنے کپڑوں میں سے اچھا کپڑا زیب تن کرتا ہے اور گھر میں موجود خوشبو میں سے استعمال کرتا ہے پھر جمعہ کی نماز ادا کرنے کے لیے مسجد آتا ہے، نہ کوئی لغوبات کرتا ہے اور نہ دو لوگوں کے درمیان جدائی کراتا ہے تو اس کے ایک جمعہ سے دوسرے جمعہ تک کے سارے گناہ معاف کر دیئے جاتے ہیں۔“ ۵۰ؔ

خلاصۂ کلام یہ کہ قرآن مجید کی آیات اور بہت ساری احادیث میں مسلمانوں کو صاف لفظوں میں تاکید کی گئی ہے کہ وہ ایسے کپڑے استعمال کریں جو ان کے لیے زیب و زینت اور ستر پوشی دونوں کا کام کرے اور باطنی طہارت و پاکیزگی کو مزید نکھارنے کے لیے تیل اور خوشبو کا استعمال کریں۔

(۲) جسمانی تربیت کی دوسری اہم چیز: غذاء

اس میں کھانے پینے کی تمام چیزیں شامل ہیں۔ماؤں کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ کھانے پینے کے سامانوں کی فراہمی اور اس کے آداب کے تعلق سے سنت نبوی اور اصول صحت و تندرستی کی پیروی کریں۔

ماؤں کو کھانے پینے کے تعلق سے مندرجہ ذیل باتوں کا خیال رکھنا چاہیے:

(الف) گھر میں کھانے پینے کی جو بھی چیز استعمال ہو وہ مفید ہو، صحت کے لیے مضر نہ ہو۔ کھانے پینے کی وہ چیزیں غذائی نقطۂ نظر سے مفید ہوں، اس میں غذائیت کے تمام عناصر پائے جاتے ہوں جس کی بچہ کے جسم کو ضرورت ہو۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:"يا أيها الذين آمنوا كلوا من طيبات ما رزقناكم" (البقرة/١٧٢)(ترجمہ: اے ایمان والو! جو پاکیزہ چیزیں ہم نے تمہیں دے رکھی ہیں انہیں کھاؤ پیو)

(ب) کھانے پینے کی چیزیں حلال ہوں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:"يا أيها الناس كلوا مما في الأرض حلالا طيبا" (البقرة/١٦٨)(ترجمہ: لوگو! زمین میں جتنی بھی حلال اور پاکیزہ چیزیں ہیں انہیں کھاؤ پیو) ماؤں کو اس بات کی فکر ہونی چاہیے کہ اس کے بچے کو ملنے والی غذاء حلال کمائی سے ہو۔ جابر رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:"انسان کے جسم کا وہ حصہ جنت میں نہیں جائے گا جو حرام مال سے پرورش پایا ہو، حرام مال سے پرورش پایا ہوا انسانی جسم جہنم کی آگ کا زیادہ مستحق ہے۔[۵۱]" مسلمان ماؤں کو حرام مال کے استعمال سے ڈرنا چاہیے اور اپنے شوہروں کو یہ تاکید کرنی چاہیے کہ وہ رائی کے ایک دانہ کے برابر بھی حرام مال گھر لے کر نہ آئیں، اگرچہ اس کی وجہ سے انہیں بھوکے پیٹ سونا پڑے اور فاقہ کشی کی آزمائش سے گزرنا پڑے۔

(ج) کھانے کے اوقات مقرر ہونے چاہئیں تاکہ صحت کی حفاظت ہو سکے اور معدہ کو کھانا ہضم کرنے کی مہلت بھی ملتی رہے۔ صحابہ کرام سنت نبوی کی پیروی کرتے ہوئے بھوک محسوس ہونے پر ہی کھانا کھاتے تھے اور شکم سیر ہونے سے پہلے ہی دستر خوان سے اٹھ جاتے تھے تاکہ معدہ کے اندر پانی پینے اور سانس لینے کی جگہ باقی رہے۔ اس معاملہ میں وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد پر عمل کرتے تھے:"ابن آدم کے لیے چند لقمے کھانا تناول کرنا ہی کافی ہے جس سے اس کی پیٹھ سیدھی رہ سکے۔ اگر مزید کھانے کی خواہش ہو تو ایک تہائی کھانے کے لیے، ایک تہائی پینے کے لیے اور ایک تہائی سانس لینے کے لیے ہونا چاہیے۔"[۵۲]

طبی سائنس میں یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ ایک کھانا معدہ کے اندر چار سے چھ گھنٹے میں ہضم ہوتا ہے۔ ہم سب کو کھانے پینے کے معاملہ میں صحت کے اصولوں پر عمل کرنا چاہیے۔ ان اصولوں میں سے ایک یہ ہے کہ "آپ مناسب وقفے سے کھانا کھائیں اور کھانے کو اچھی طرح چبا کر کھائیں۔" ۵۳؎

(د) کھانے پینے کے معاملہ میں اعتدال ہو، افراط و تفریط نہ ہو۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "و کلوا و اشربوا و لا تسرفوا إنه لا يحب المسرفين" (الأعراف /۳۱) (ترجمہ: اور خوف کھاؤ اور پیو اور حد سے نہ نکلو، بے شک اللہ تعالیٰ حد سے نکل جانے والوں کو پسند نہیں کرتا ہے) اس آیت میں انسانوں کو کھانے کے لیے کہا گیا ہے، لیکن اس معاملہ میں افراط سے بچنے کی تاکید کی گئی ہے۔ اس سے یہ معلوم ہوا کہ کھانے پینے کے معاملہ میں بھی اعتدال مطلوب ہے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے اعتدال مومنوں کی صفت قرار دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "و الذين إذا أنفقوا لم يسرفوا و لم يقتروا و كان بين ذلك قواما" (الفرقان /۶۷) (ترجمہ: اور جو خرچ کرتے وقت بھی نہ تو اسراف کرتے ہیں اور نہ بخیلی، بلکہ ان دونوں کے درمیان معتدل طریقے پر خرچ کرتے ہیں)

مومن کی یہ پہچان ہے کہ وہ کھانے پینے سے لے کر زندگی کے تمام معاملات میں راہ اعتدال پر چلتا ہے۔ مسلمان اتنا نہیں کھالیتا کہ وہ بدہضمی کا سبب بن جائے، بدہضمی کی وجہ سے بہت سے دوسرے امراض جنم لیتے ہیں۔ اوپر کی سطروں میں حدیث نبوی کے یہ الفاظ گزر چکے ہیں کہ "انسان کے لیے چند لقمے کھالینا کافی ہے جس سے اس کی پیٹھ سیدھی رہ سکے۔" یہ حکیمانہ بات آپ کی نبوت پر دلالت کرتی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے چودہ سو سال قبل یہ بات بتادی تھی جس میں انسان کی صحت کا راز مضمر ہے۔ جدید سائنس نے اب جا کر اس راز کو پایا ہے اور کم خوراکی کے فوائد کو اب دریافت کیا ہے۔ کھانے میں مقدار کا اعتبار نہیں ہے بلکہ کھانے کے اندر غذائیت سے بھرپور عناصر کس قدر موجود ہیں اس کا اعتبار ہے۔ کھانے میں اس بات کا خیال رکھنے کی ضرورت ہوتی ہے کہ غذائیت سے بھرپور مواد مثلاً پروٹین، کاربوہائیڈریٹس، وٹامنس، چکنائی اور معدنیات کی ایک متوازن مقدار موجود ہے یا نہیں۔ کھانے کی بڑی مقدار پیٹ اور معدہ کے لیے بوجھ بن جاتی ہے اور اس کی وجہ سے نظام ہضم میں مشکل پیش آتی ہے۔ ۵۴؎

جب ایک مسلمان ماں صحت کے ان اصولوں کو اپنے پیش نظر رکھتی ہے اور اپنے بچوں کو ان اصولوں پر عمل کرنے کی تعلیم دیتی ہے اور ان کی روشنی میں ان کی پرورش کرتی ہے تو وہ موٹاپے کے مرض سے اپنے بچے کی حفاظت

کر لیتی ہے۔ موٹاپا ایک ایسا مرض ہے جو انسان کی صلاحیت اور سر گرمیوں کو محدود کر دیتا ہے اور بہت سے خطرناک امراض کا سبب بنتا ہے۔ صحت کے ان اصولوں پر عمل کرنے کی وجہ سے بچے صحت مند، پھرتیلے اور جسمانی طور پر مضبوط ہوتے ہیں۔ اس تعلق سے خلیفۂ ثانی عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کا قول ہے: "تم لوگ اس بات کی فکر کرو کہ تمہارا پیٹ باہر کو نہ نکلے، اس کی وجہ سے نماز پڑھنے میں سستی ہوتی ہے، جسم کے اندر فساد و بگاڑ پیدا ہوتا ہے اور یہ بیماری کا سبب بنتا ہے۔ تم لوگ اپنی خوراک کے معاملہ میں راہ اعتدال پر چلو، اس کی وجہ سے تم اسراف سے بچو گے، اپنے جسم کو صحت مند رکھ سکو گے اور عبادت کرنے کے لیے تمہیں زیادہ طاقت حاصل ہو گی۔"۵۵؎

عربوں کا یہ مقولہ ہے کہ "پیٹ نکلنے کے بعد ذہانت و فطانت ختم ہو جاتی ہے۔"

صحت کے ان اصولوں پر عمل کر کے مائیں اپنے بچوں کو توانا و مضبوط اور صحت مند رکھنے کے ساتھ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی خوشنودی بھی حاصل کر سکتی ہیں۔

وہ مسلمان عورتیں جن کے دلوں میں اللہ تعالیٰ کا خوف ہوتا ہے اور جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بتائے ہوئے راستہ پر چلتی ہیں انہیں بال بچوں کے تعلق سے اپنی ذمہ داری کا احساس ہوتا ہے۔ وہ راہ اعتدال کو اختیار کرتی ہیں اور اسراف سے بچتی ہیں، وہ گھر کے انتظام و انصرام میں امہات المومنین کی مثالوں کو اپنے سامنے رکھتی ہیں، تھوڑی اور حلال چیز پر قناعت کرتی ہیں اور حرام مال کو ہاتھ بھی نہیں لگاتیں چاہے وہ جتنی بڑی مقدار میں کیوں نہ ہو۔ اس طرح وہ خود کو، اپنے شوہر کو، بچوں کو اور گھر کے دیگر افراد کو جہنم کی آگ سے بچانے میں کامیاب ہوتی ہیں۔

ان باتوں سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ گھر والوں کے تعلق سے ایک عورت کی کتنی بڑی ذمہ داری ہے۔ اس ذمہ داری کو ایمانداری کے ساتھ احسن طریقے سے ادا کرنے ہی پر گھر والوں کی دنیاوی سعادت و کامرانی اور اخروی فوز و فلاح کا دار و مدار ہے۔ ماں کی حیثیت سے ایک عورت کا بنیادی کام یہی ہے کہ وہ اپنی چھوٹی سی مملکت، یعنی اپنے گھر اور اہل خانہ کی دیکھ بھال سے غافل نہ ہو۔ اس کی ذمہ داریوں میں یہ بات بھی شامل ہے کہ وہ اپنے بچوں کو کھانے پینے کے نبوی آداب سکھائے۔ یہ کام اسے اسی وقت شروع کر دینا چاہیے جبکہ بچے ابھی چھوٹے ہوں اور دستر خوان پر خود اپنے ہاتھوں سے کھانے کے قابل ہو چکے ہوں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہی طریقہ تھا، آپ چھوٹے بچوں کو کھانے کے آداب سکھاتے تھے، انہیں نصیحت کرتے تھے اور کھاتے وقت ان پر نظر رکھتے تھے۔

کھانے پینے کے آداب

بچے اللہ تعالیٰ کا نام لے کر کھانا شروع کریں اور ہر کھانے سے پہلے "بسم اللہ" پڑھیں، دائیں ہاتھ سے کھانا کھائیں اور اپنے سامنے سے کھائیں۔ متعدد احادیث نبوی میں ان باتوں کا حکم دیا گیا ہے۔ ان میں سے ایک عمر بن سلمہ رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے۔ وہ بیان کرتے ہیں کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زیر کفالت تھا، کھاتے وقت میرا ہاتھ پلیٹ میں ادھر ادھر بھٹکتا تھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے فرمایا: "اے لڑکے! اللہ کا نام لے کر کھاؤ، دائیں ہاتھ سے کھاؤ اور اپنے سامنے سے کھاؤ۔" ۵۶؎

نبی ہادی صلی اللہ علیہ وسلم نے بچوں کو بچپن ہی میں کھانے پینے کے آداب سکھانے کی سخت تاکید کی ہے اور اس معاملہ میں سستی ولاپرواہی برتنے سے منع فرمایا ہے تاکہ ان میں بچپن ہی سے اس کی عادت پڑ جائے اور وہ بڑے ہو کر بھی کھانے پینے کے اسلامی آداب کا خیال رکھیں۔ حذیفہ رضی اللہ عنہ کی اس روایت سے اس کی مزید وضاحت ہوتی ہے۔ وہ بیان کرتے ہیں کہ جب ہم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کسی کھانے میں شریک ہوتے تو ہم اس وقت تک کھانا شروع نہیں کرتے تھے جب تک کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے دست مبارک سے کھانا شروع نہیں فرماتے۔ ایک مرتبہ ہم آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایک کھانے میں شریک تھے ایک لڑکی دوڑتی ہوئی آئی جیسے کہ اسے دھکا دیا جا رہا ہو اور اس نے کھانے میں ہاتھ ڈالنے کا ارادہ کیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا، پھر ایک دیہاتی بدو تیزی کے ساتھ آیا جیسے کہ اسے دھکا دیا جا رہا ہو، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا ہاتھ بھی پکڑ لیا، اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "جس کھانے پر اللہ تعالیٰ کا نام نہیں لیا جاتا شیطان اسے اپنے لیے حلال کر لیتا ہے۔ شیطان پہلے اس لڑکی کو لے کر آیا تاکہ اس کے ذریعہ کھانے کو حلال کر لے، میں نے جب اس لڑکی کا ہاتھ پکڑ لیا تو وہ ایک دیہاتی بدو کو لے کر آیا تاکہ اس کے ذریعہ کھانے کو حلال کر لے، میں نے اس دیہاتی بدو کا بھی ہاتھ پکڑ لیا۔ قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، اس لڑکی کے ساتھ شیطان کا ہاتھ بھی میرے ہاتھ میں ہے۔" ۵۷؎

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کسی بھی چھوٹے یا بڑے کو "بسم اللہ" پڑھے بغیر کھانے کی اجازت نہیں دیتے تھے۔ کھانے سے پہلے "بسم اللہ" پڑھنے کے وجوب کا سبب کیا ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے عملی طور پر اس کا مظاہرہ کر کے صحابہ کرام کو سمجھا دیا اور وہ یہ کہ شیطان اس کھانے میں شریک ہو جاتا ہے جس پر "بسم اللہ" نہیں پڑھا جاتا ہے۔ ماں کی

یہ ذمہ داری ہے کہ وہ سنت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی اقتداء واتباع کرتے ہوئے کھانے کے وقت اپنے بچوں پر نگاہ رکھے، ان کی نگرانی کرے اور انہیں کھانے پینے کے آداب سکھائے۔

مائیں اپنے بچوں کو پینے کے آداب بھی سکھائیں اور وہ یہ ہے کہ پانی یا کوئی بھی چیز بیٹھ کر پی جائے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کھڑے ہو کر پانی پینے سے منع فرمایا ہے۔ انس رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کھڑے ہو کر پانی پینے سے منع فرمایا ہے۔ قتادہ کہتے ہیں کہ میں نے دریافت کیا کہ کھڑے ہو کر کھانے کا کیا حکم ہے؟ انس رضی اللہ عنہ نے کہا کہ کھڑے ہو کر کھانا تو اور بھی زیادہ برا اور ناپسندیدہ عمل ہے۔"۵۸

ایک مسلمان کے لیے افضل اور بہتر یہ ہے کہ وہ بیٹھ کر کھائے اور پیئے، اس لیے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اگرچہ کھڑے ہو کر پینے سے منع فرمایا ہے تاہم آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے کھڑے ہو کر پینے کا ثبوت بھی ہے۔ عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو آب زمزم پیش کیا تو آپ نے کھڑے ہو کر نوش فرمایا۵۹۔ پہلی حدیث میں کھڑے ہو کر پینے کی جو ممانعت وارد ہے وہ نہی تنزیہی ہے۔ امام نووی کہتے ہیں: پہلی حدیث میں کھڑے ہو کر پینے کی ممانعت کو کراہت پر محمول کیا گیا ہے یعنی بہتر یہ ہے کہ کھڑے ہو کر پینے سے اجتناب کیا جائے۔ دوسری حدیث میں آیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے آب زمزم کو کھڑے ہو کر نوش فرمایا، یہ بیان جواز کے لیے تھا۔ اس صورت میں کوئی اشکال اور تعارض باقی نہیں رہتا ہے۔۶۰

پینے کے آداب میں سے یہ بھی ہے کہ پیتے وقت برتن میں سانس نہ لی جائے کیونکہ حدیث میں اس کی ممانعت آئی ہے۔ ابو قتادہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے برتن میں سانس لینے سے منع فرمایا ہے۔۶۱

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تین بار میں پانی پیتے تھے تاکہ ہر بار برتن سے باہر سانس لی جاسکے۔ انس رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم پانی پیتے وقت تین بار سانس لیتے تھے۔ اور فرماتے تھے کہ یہ (طریقہ) زیادہ سیر کرنے والا، زیادہ محفوظ اور زیادہ مزیدار ہے۔۶۲

(۳) جسمانی ورزش

بچے کو جسمانی طور پر توانا و مضبوط اور چاق و چوبند رکھنے کے لیے والدین کو انہیں مفید جسمانی ورزش کا موقع فراہم کرنا چاہیے۔ والدین اپنی اس ذمہ داری کو ادا کر کے اللہ تعالیٰ کے اس حکم کی تعمیل کر سکیں گے: "و أعدوا لهم ما استطعتم من قوة و من رباط الخيل" (الأنفال/ ۶۰)(ترجمہ: تم ان کے مقابلہ کے لیے اپنی طاقت بھر قوت کی تیاری کرو اور گھوڑے کے تیار رکھنے کی)

جن چیزوں سے بھی یہ طاقت و قوت حاصل ہو سکتی ہو مسلمانوں کو انہیں اختیار کرنا چاہیے۔ پہلے مرحلہ میں مسلمانوں کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ طاقتور ہو اور جسمانی طاقت و قوت کے حصول کے لیے اسے مختلف نوعیت کی جسمانی ورزش کرنی چاہیے تاکہ اس کے ذریعہ اس کی جسمانی قوت میں اضافہ ہو مثلاً تیر اندازی، گھوڑ سواری اور تیراکی وغیرہ۔ ایک موقع پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اوپر کی آیت "و أعدو لهم ما استطعتم من قوة و من رباط الخيل" کی تلاوت کرنے کے بعد فرمایا: "تم لوگ آگاہ رہو کہ قوت سے مراد تیر اندازی ہے، تم لوگ باخبر رہو کہ قوت سے تیر اندازی مراد ہے۔ ۶۳

اسلام مسلمانوں کو اولوالعزمی کی ترغیب دیتا ہے، وہ انہیں پوشیدہ صلاحیتوں کو پروان چڑھانے کے لیے آمادہ کرتا ہے اور جسمانی و اخلاقی قوت حاصل کرنے پر ابھارتا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: "طاقتور مومن اللہ تعالیٰ کے نزدیک کمزور مومن سے بہتر و پسندیدہ ہے، ہر ایک میں خیر ہے، تم نفع بخش چیز کو حاصل کرنے کے لیے کوشش کرو، اللہ تعالیٰ سے مدد طلب کیا کرو اور عاجزی و بے بسی کا مظاہرہ نہ کرو۔" ۶۴

اس حدیث میں نوجوانوں کو یہ ترغیب دی گئی ہے کہ وہ اپنے خالی اوقات سے فائدہ اٹھائیں اور اپنے خالی اوقات کو مفید کاموں میں لگا کر اسے کارآمد بنائیں۔ صحابہ کرام جسمانی ورزش و تربیت کی اہمیت سے آگاہ تھے۔ وہ مسلمانوں کو اس بات کی ترغیب دیتے تھے کہ وہ اپنے بچوں کو مختلف قسم کے ہنر سکھائیں جن سے ان کے جسم ٹھوس اور مضبوط ہوں اور ان کی جسمانی صلاحیت میں اضافہ ہو۔

(۴) علاج و معالجہ

ماں کو اس جانب خصوصی توجہ دینے کی ضرورت ہے کہ بچہ جب بیمار ہو تو فوراً اس کے علاج کی فکر کریں، کیونکہ بسا اوقات علاج و معالجہ میں لاپرواہی برتنے کا خطرناک نتیجہ برآمد ہوتا ہے۔ بیمار ہونے پر علاج کرانا اور بیماری کے

مطابق دوا استعمال کرنا شرعی طور پر مطلوب ہے۔ جابر رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”ہر بیماری کی دوا ہے، جب بیماری کی مناسبت سے دوا استعمال کی جاتی ہے تو اللہ تعالیٰ کے حکم سے شفا حاصل ہوتی ہے۔[۶۵]“ اس حدیث نبوی سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر بیماری کا علاج موجود ہے اور ہر مسلمان کو بیمار ہونے کے بعد بیماری کے علاج کی طرف متوجہ ہونا چاہیے۔

اسامہ بن شریک رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ ایک مرتبہ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس تھا، اسی دوران کچھ دیہاتی بدو آپ کے پاس آئے اور ان لوگوں نے دریافت کیا: اے اللہ کے رسول! بیمار ہونے پر کیا ہم اپنا علاج کرائیں؟ آپ نے فرمایا: ہاں، اے اللہ کے بندو! اپنا علاج کرایا کرو، اللہ تعالیٰ نے جو بھی بیماری پیدا کی ہے اس کی شفاء بھی رکھی ہے سوائے ایک بیماری کے اور وہ ہے بڑھاپا۔[۶۶]“ لیکن جادو، منتر اور کہانت کے ذریعہ علاج کرانا شرعاً جائز نہیں ہے، کیونکہ یہ سب شرک اکبر میں سے ہے۔ شریعت میں ان تمام غیر شرعی کاموں کی ممانعت وارد ہے۔ بہت سی احادیث نبویہ سے معلوم ہوتا ہے ان تمام غیر شرعی کاموں کا عذاب بہت سخت ہے۔

کسی ماں کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ اپنے بچے کے کسی بھی خطرناک مرض کے علاج میں ان غیر شرعی کاموں کا سہارا لے، بلکہ بچے کے بیمار ہونے پر وہ اس مرض کے ماہر ڈاکٹر سے رجوع کرے اور اس کی تجویز کردہ مشروع دواؤں کے ذریعہ اس کا علاج کرے۔

(۲) عقلی وفکری تعلیم وتربیت

اللہ تعالیٰ نے عقل کی وجہ سے انسانوں کو دیگر تمام مخلوقات پر فضیلت عطا کی ہے۔ یہ انسان کے لیے اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی بہت بڑی نعمت ہے۔ اسی لیے بچوں کی عقلی تربیت کی بھی حد درجہ اہمیت ہے۔ ماں کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے بچے کی عقلی وفکری تربیت کی طرف توجہ دے اور ان کی پوشیدہ صلاحیتوں کو نکھارے اور پروان چڑھائے۔ ماں جب بچے کی عقلی وفکری تربیت کو نظر انداز کر دیتی ہے تو گویا وہ بچہ کی شخصیت کو مسخ کر دیتی ہے اور معاشرہ کو ایک ایسا انسان فراہم کرتی ہے جو انسان سے زیادہ حیوان کہلانے کا مستحق ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو عقل وفکر کی وجہ سے

حیوانوں سے ممتاز بنایا ہے، لہٰذا ماں کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ بچہ کی عقلی و فکری تربیت کی طرف توجہ دے۔ عقلی و فکری تربیت کے ذرائع یہ ہیں:

(۱) بچوں کو لکھنا پڑھنا سکھانا

سب سے پہلی وحی کے نزول کے وقت قرآن مجید کی جو سب سے پہلی آیت نازل ہوئی اس میں پڑھنے کا حکم دیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "إقرأ باسم ربک الذی خلق خلق الإنسان من علق إقرأ و ربک الأکرم الذی علم بالقلم" (العلق / ۱-۵)(ترجمہ: پڑھ اپنے رب کے نام سے جس نے پیدا کیا، جس نے انسان کو خون کے لوتھڑے سے پیدا کیا، تو پڑھتا رہ تیرا رب بڑا کرم والا ہے جس نے قلم کے ذریعہ (علم) سکھایا)

لکھنا پڑھنا ایک ایسا ہنر ہے جس کے ذریعہ انسان نامعلوم چیزوں کو دریافت کرتا ہے اور ان امور تک رسائی حاصل کرتا ہے جو اس کے دائرۂ علم سے باہر تھیں۔ وہ اس کے ذریعہ اپنے علم و آگہی میں اضافہ کرتا ہے اور اپنی ذہنی و فکری صلاحیت کو وسعت دیتا ہے۔ ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں: "اللہ تعالیٰ نے انسان کو نامعلوم چیزوں کا علم عطا کر کے اس کی عزت افزائی کی۔ یہ علم ہی جس کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو فضل و شرف سے نوازا۔ اسی علم کے ذریعہ ابوالبشر آدم علیہ السلام کو فرشتوں پر فضیلت و فوقیت عطا کی گئی۔ یہ علم کبھی انسان کے دماغ میں ہوتا ہے، کبھی اس کی زبان پر ہوتا اور کبھی اس کا مظاہرہ اس کی انگلیوں کے ذریعہ لکھ کر ہوتا ہے۔ اس اعتبار سے علم کا تعلق انسان کے دماغ سے، اس کے الفاظ سے اور اس کے ہاتھ کے ذریعہ کھینچی گئی لکیروں سب سے ہوتا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام کے اقوال و آثار کو مسلمانوں نے تحریری شکل میں محفوظ کیا ہے۔"[۶۷]

پڑھنا، عقلی و فکری تربیت کا پہلا زینہ ہے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے اپنے پہلے ہی حکم میں سب سے پہلے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اور آپ کے بعد تمام امت مسلمہ کو پڑھنے کا حکم دیا ہے۔

لکھنا، حصول علم کا دوسرا زینہ اور علم کی دوسری بنیاد ہے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے قلم کی نعمت سے نواز کر اپنے بندوں پر احسان عظیم کیا ہے۔ سعید نے قتادہ کا یہ قول نقل کیا ہے: قلم اللہ تعالیٰ کی عظیم ترین نعمت ہے۔ اگر قلم نہ ہوتا تو کوئی دین و مذہب بھی محفوظ و مدون نہ ہوتا اور بطور انسان ہماری زندگی بھی قابل ذکر نہ ہوتی۔ یہ رب سبحانہ و تعالیٰ کے کرم و احسان کا کمال ہے کہ اس نے اپنے بندوں کو وہ علم سکھایا جہاں تک اس کی رسائی نہیں تھی۔ اسے جہالت کے

اندھیرے سے علم کی روشنی تک کا سفر طے کرایا، اسے تحریر و کتابت کے علم کی فضیلت سے آگاہ کیا، اس لیے کہ اس بے بہا علم کے فوائد و منافع بے شمار ہیں جن سے صرف اللہ تعالیٰ کی ذات عالی ہی باخبر و آگاہ ہے۔ اگر تحریر و کتابت کا فن نہ ہوتا تو نہ علوم مدون ہوتے، نہ آئین و احکامات قید تحریر میں آتے، نہ اگلوں کی تاریخ اور ان کے علوم و فنون ضبط تحریر میں لائے جاتے اور نہ اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ آسمانی کتابیں ہم تک پہنچ پاتیں اور اس کے نتیجہ میں ہمارے لیے زندگی کی سیدھی راہ پر چلنا آسان نہ ہوتا۔"۶۸

اسی لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شدید خواہش ہوا کرتی تھی کہ ہر مسلمان لکھنا پڑھنا سیکھ لے۔ سیرت کی کتابوں میں یہ بات آئی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوۂ بدر کے کچھ قیدیوں کا فدیہ یہ طے کیا تھا کہ ان میں سے ایک قیدی دس مسلمانوں کو لکھنا پڑھنا سکھادے۔۶۹

علم حاصل کرنا ہر مسلمان کا دینی فریضہ بھی ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:"علم حاصل کرنا ہر مسلمان پر فرض ہے۔"۷۰

ماؤں کو اپنی اولاد کو تعلیم یافتہ بنانے کے لیے پوری کوشش و محنت صرف کرنی چاہیے۔ انہیں دینی علوم کے ساتھ مفید عصری علوم سے بھی آراستہ کرنا چاہیے تاکہ زندگی کے عملی میدان میں درپیش مسائل کو حل کرنے میں انہیں آسانی ہو اور وہ متنوع علوم سے لیس ہو کر ایک باعزت زندگی جی سکیں اور اپنے علم سے امت کو بھی فائدہ پہنچا سکیں۔ مسلمان کو کسی ایک علم کے حصول پر اکتفاء نہیں کرنا چاہیے بلکہ اسے ان تمام علوم کے حصول کی طرف متوجہ ہونا چاہیے جن کے ذریعہ وہ مسلمانوں اور انسانیت کو فائدہ پہنچا سکتا ہو۔ اللہ تعالیٰ نے علم اور علماء کی تعریف کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: "شهد الله أنّہ لا إله إلّا هو و الملائكة و أولوا العلم قائما بالقسط لا إله إلّا هو العزيز الحكيم" (آل عمران/۱۸)(ترجمہ: اللہ تعالیٰ، فرشتے اور اہل علم اس بات کی گواہی دیتے ہیں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور وہ عدل کو قائم رکھنے والا ہے، اس غالب اور حکمت والے کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں ہے) ایک دوسری آیت میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:"قل هل يستوى الذين يعلمون و الذين لا يعلمون إنما يتذكر أولوا الالباب" (الزمر/۹)(ترجمہ: تم بتاؤ کہ علم والے اور بے علم کیا برابر کے ہیں؟ یقیناً نصیحت وہی حاصل کرتے ہیں جو عقلمند ہوں)

مسلمانوں کا حال تو یہ ہوتا ہے کہ ان کے علم کی پیاس کبھی بجھتی نہیں ہے۔ وہ ہمیشہ علم کے بحر بیکراں سے اپنی علمی پیاس بجھانے کے لیے بیتاب ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے ذریعہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو سکھائی ہوئی یہ دعا مانگتا ہے:"و قل رب زدنی علما" (طٰہٰ / ۱۱۴)(ترجمہ: اور کہیے؛اے میرے رب میرے علم میں اضافہ فرما)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کرام کو دین کی باتیں اور شریعت کے احکام سکھاتے تھے اور انہیں قرآن مجید کی تعلیم دیتے تھے، پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم انہیں حکم دیتے تھے کہ وہ اپنی اولاد اور گھر والوں کو دین کی باتیں سکھائیں اور احکام شریعت سے انہیں واقف کرائیں۔ ابو سلیمان مالک بن حویرث رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ ہم لوگ چند ہم عمر نوجوان نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ ہم نے (دین سیکھنے کے لیے) بیس دن آپ کے پاس گزارے۔ آپ کو لگا کہ ہم لوگ اپنے گھر والوں سے ملاقات کے لیے مشتاق ہیں۔ آپ نے ہمارے گھر والوں کے بارے میں دریافت فرمایا کہ ہم کن لوگوں کو گھر میں چھوڑ کر یہاں حاضر ہوئے ہیں، ہم لوگوں نے اس کی تفصیل بتادی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نہایت شفیق و مہربان تھے۔ آپ نے فرمایا: تم لوگ اب اپنے گھر واپس چلے جاؤ، اپنے گھر والوں کو دین سکھاؤ اور انہیں احکام شریعت پر عمل کرنے کے لیے کہو۔ گھر پہنچ کر تم لوگ اسی طرح نماز پڑھنا جیسے مجھے نماز پڑھتے ہوئے دیکھا ہے۔ جب نماز کا وقت ہو تو تم میں سے ایک شخص اذان دے، پھر جو تم میں سب سے بڑا ہو وہ امامت کرے۔"[۱۷]

ماؤں کو اس بات کی فکر کرنی چاہیے کہ ان کے بچے خاطر خواہ حصول علم کی طرف متوجہ ہیں اور علم و معلومات کی وافر مقدار انہیں حاصل ہو رہی ہے، کیونکہ اسی میں ہر طرح کی خیر و بھلائی کا راز مضمر ہے۔ اس کے لیے ماؤں کو چاہیے کہ وہ اپنے بچوں کے اوقات کو منظم کریں اور ان کے ہر کام کے لیے نظام الاوقات بنا دیں۔ ان کے پڑھنے، سونے، وقت پر اسکول جانے اور کھیل کود کے اوقات متعین ہوں۔ وہ ان کاموں میں بچوں کی مدد اور نگرانی بھی کرے۔ اسکول و مدرسہ کے جو کام بچے کے بس سے باہر ہو اسے حل کرنے میں بچے کی مدد بھی کرے، مختلف مضامین میں بچے کی علمی پیش رفت پر نگاہ رکھے، بچے کے والد کو ان کے تعلیمی نتائج سے باخبر کیا کرے۔ ماؤں کو بچے کے اسکول سے بھی رابطہ میں رہنا چاہیے تاکہ بچوں کے تعلیمی پیش رفت کا حال انہیں معلوم ہوتا رہے اور اسکول میں بچوں کے اخلاقی تعامل سے بھی وہ باخبر رہے۔ کیونکہ بچے کی تعلیمی پیش رفت اور اخلاقیات دونوں کی طرف سے اطمینان و تسلی از حد ضروری ہے۔

(۳) ماں بچے کو کائنات میں غور و فکر کی طرف متوجہ کرے

ماؤں کا ایک کام یہ بھی ہے کہ وہ اپنے بچے کو اپنے آس پاس کے ماحول، اشیاء اور فطرت کی نشانیوں میں غور و فکر کی طرف متوجہ کرے جن میں اللہ تعالیٰ کے وجود اور اس کی طاقت و قدرت کی دلیلیں موجود ہیں۔ اس سے بچے کے اندر مشاہدہ اور غور و فکر کی صلاحیت پیدا ہو گی۔ غور و فکر کا عمل انسان کی دو ایسی خصوصیات ہیں جن کی قرآن مجید میں بھی تعریف کی گئی ہے، کیونکہ اس کے ذریعہ خالق و مالک کو پہچاننے کی انسانی صلاحیت میں اضافہ ہوتا ہے اور اس سے انسان کو اپنی ہر سانس کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی حمد و ثناء بیان کرنے کی توفیق ملتی ہے۔ قرآن مجید میں انسان کے غور و فکر کرنے کے عمل اور صلاحیت کی تعریف ان الفاظ میں کی گئی ہے: "إن فی خلق السماوات و الأرض و اختلاف اللیل و النهار لآیات لأولی الألباب الذین یذکرون الله قیاماً و قعودا و علی جنوبهم و یتفکرون فی خلق السماوات و الأرض ربنا ما خلقت هذا باطلا سبحانک فقنا عذاب النار" (آل عمران/۱۹۰-۱۹۱) (ترجمہ: آسمانوں اور زمین کی پیدائش میں اور رات دن کے ہیر پھیر میں یقیناً عقلمندوں کے لیے نشانیاں ہیں جو اللہ تعالیٰ کا ذکر کھڑے اور بیٹھے اور اپنی کروٹوں پر لیٹے ہوئے کرتے ہیں اور آسمانوں و زمین کی پیدائش میں غور و فکر کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار! تو نے یہ بے فائدہ نہیں بنایا، تو پاک ہے پس ہمیں آگ کے عذاب سے بچا لے)

زمانہ ماضی میں مائیں ایک ہی وقت میں اپنے بچوں کی جسمانی اور عقلی و فکری دونوں قسم کی تربیت کی طرف توجہ دیتی تھیں۔ اس سلسلہ میں ایک دیہاتی عرب بدو ماں کا واقعہ تاریخ کی کتابوں میں نقل کیا گیا ہے کہ وہ اپنی اولاد کی تربیت کا کس طرح اہتمام کرتی تھی۔ تاریخ اور ادب کی کتابوں میں یہ واقعہ نقل کیا گیا ہے کہ ایک مرتبہ فضل بن زید کی ملاقات ایک دیہاتی بدو عورت کے بیٹے سے ہوئی، فضل بن زید اس لڑکے کی تعلیم و تربیت سے بہت متاثر ہوئے، انہوں نے اس لڑکے کی ماں سے دریافت کیا کہ تم نے اسے کیسے تعلیم و تربیت سے آراستہ کیا؟ اس لڑکے کی ماں نے بتایا کہ جب یہ پانچ سال کا ہوا تو میں نے اسے استاذ کے حوالہ کر دیا، ان کی صحبت میں رہ کر اس نے قرآن مجید کو حفظ کیا اور اس کی تلاوت پر قدرت حاصل کی، اس استاذ نے اسے شعر و ادب کی تعلیم دی تو یہ اشعار کی روایت کرنے لگا، پھر اسے قوم کے قابل فخر کارناموں سے واقف کرایا گیا نیز اسے اس کے آباؤ و اجداد کی خدمات اور ان کے روشن کارناموں کی معلومات بھی فراہم کی گئی۔ جب یہ لڑکا بلوغت کی عمر کو پہنچا تو میں نے اسے گھوڑے کی پیٹھ پر سوار کر دیا، اس نے گھوڑ سواری کی

مشق کی اور اس فن کا ماہر بن گیا، پھر یہ ہتھیار لٹکا کر محلہ کی آبادی میں چلا گیا اور مظلوم کی چیخ و پکار کو کان لگا کر سننے لگا تاکہ اس کی مدد کر سکے۔ ۲۷ے

موجودہ دور کی ماؤں کے لیے یہ واقعہ ایک بہترین مثال و نمونہ ہے کہ ایک دیہاتی بدو خاتون نے کس طرح اپنے بیٹے کو ضروری تعلیم و تربیت سے آراستہ کیا۔ مجھے امید ہے کہ آج کی مائیں اس واقعہ سے رہنمائی حاصل کریں گی اور اسے اپنے لیے مشعل راہ بنائیں گی۔

ماؤں کی یہ ذمہ داری بھی ہے کہ وہ اپنے بچوں کو مسنون دعاؤں اور اذکار کو پڑھنے کا عادی بنائیں۔ احادیث میں ہر وقت اور ہر حالت کے لیے الگ الگ دعائیں منقول ہیں، بچوں کے اندر ان مخصوص اوقات و حالات میں ان دعاؤں کو پڑھنے کی عادت ڈالی جائے تاکہ وہ بار بار ان دعاؤں کو پڑھتے ہوئے اسے زبانی یاد کر لیں اور ان دعاؤں کا اہتمام ان کے معمولات کا حصہ بن جائے، مثلاً سوتے وقت کی دعاء، سو کر اٹھنے کی دعاء، گھر میں داخل ہونے کی دعاء، کھانے سے پہلے کی دعاء، کھانے کے بعد کی دعاء، بیت الخلاء میں داخل ہونے کی دعاء، اس سے نکلنے کی دعاء، سواری پر سوار ہونے کی دعاء اور ان کے علاوہ دیگر خوبصورت دعائیں بچوں کو بچپن ہی میں سکھائی جائیں تاکہ زندگی میں بھی انہیں ان دعاؤں کا فائدہ حاصل ہو اور مرنے کے بعد بھی وہ ان کے اجر و ثواب سے مستفید ہوں۔ اس طرح جب بار بار بچوں کو ان دعاؤں کو دہرانے کے لیے کہا جائے گا تو اس کی وجہ سے ان کی زبانوں پر اللہ تعالیٰ کا ذکر جاری و ساری رہے گا۔ وہ ان دعاؤں کو پڑھنے کی وجہ سے ہر قسم کے شرور و فتن سے محفوظ رہیں گے اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کرنے کا ثواب بھی انہیں حاصل ہو گا۔

(۳) ایمانی تربیت

اسلام میں انسان کی ایمانی و روحانی تربیت پر خصوصی توجہ دی گئی ہے۔ قرآن مجید کی نظر میں انسان جسم اور روح دونوں کا مجموعہ ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ”فإذا سويته و نفخت فيه من روحي فقعوا له ساجدين“ (الحجر/۲۹) (ترجمہ: تو جب میں اسے پورا بنا چکوں اور اس میں اپنی روح پھونک دوں تو تم سب اس کے لیے سجدے میں گر پڑنا)

جب ایک انسان اپنی ایمانی تربیت کو نظر انداز کر کے اپنی ساری توجہ جسمانی و مادی تربیت پر مرکوز کر دیتا ہے تو وہ اپنی اس بنیادی خصوصیت سے محروم ہو جاتا ہے جو اسے حیوان سے ممتاز بنا دیتی ہے۔ اسی لیے والدین کے لیے یہ

نہایت ضروری ہے کہ وہ اپنے بچہ کی ایمانی وروحانی تربیت پر بھی خصوصی توجہ دیں تاکہ وہ معاشرہ کا ایک صالح انسان بن کر اپنی صلاحیت کو خیر و بھلائی کے فروغ اور اپنی قوم و معاشرہ کی صلاح و فلاح کے لیے وقف کر دے۔ روحانی تربیت سے بچہ کے اندر خیر و شر اور نیکی و بدی کے درمیان تمیز کرنے کی صلاحیت پیدا ہوتی ہے۔

عصر حاضر کے مصلحین اور جدید تعلیم یافتہ مفکرین آج اسی ایمانی تربیت کی گہار لگارہے اور لوگوں کو اس کی طرف متوجہ کر رہے ہیں۔ مغرب کے ماہرین تربیت، ماہرین نفسیات، ماہرین سماجیات اور مصلحین نے اس راز کو پالیا ہے کہ انسان کی تعلیم وتربیت میں ایمان و اخلاق کا پہلو خصوصی توجہ و اہتمام کا محتاج ہے۔ اس سے قبل دنیا سے دین کو جدا کر دینے کی وجہ سے انسانی معاشرہ جب انارکی اور بے راہ روی کا شکار ہوا تو اس کا تلخ تجربہ کرنے کے بعد ہی یہ لوگ اخلاقی و ایمانی تعلیم وتربیت کی طرف متوجہ ہوئے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ جب دنیا بھر میں سیکولرزم (لامذہبیت) کی وبا پھیلی اور اس کی وجہ سے جب معاشرہ میں لاعلاج سماجی امراض پنپنے لگے، جرائم کی کثرت ہوگئی اور اخلاقی انحطاط کی وجہ سے شرفاء کا دم گھٹنے لگا تب جاکر ہر قسم کی مادر پدر آزادی کے دلدادہ اہل مغرب بھی ایمانی و اخلاقی تربیت کی طرف متوجہ ہوئے۔

ایمانی تربیت کے وسائل وذرائع

(۱) مائیں اپنے بچوں کو بچپن ہی سے صحیح اسلامی عقیدہ کی بنیادی باتیں بتائیں تاکہ جب وہ سن شعور کو پہنچیں تو صحیح عقیدہ، صاف ستھرے اخلاق اور اچھی سیرت و کردار کے حامل ہوں، اپنے رب اور مسلمانوں کے مخلص ہوں اور خیر و بھلائی سے محبت کرنے اور برائی سے نفرت کرنے والے ہوں۔

صحیح عقیدہ اسلام کی اولین بنیاد ہے۔ یہ فضائل اور کمالات انسانی کا سرچشمہ ہے۔ دین کا دار و مدار بھی اسی پر ہے۔ اسی لیے ماں کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ بچے کو ایمان کی حقیقت اور غیبی امور کے بارے میں بتائے مثلاً اللہ عزوجل، فرشتوں، آسمانی کتابوں، رسولوں پر ایمان خاص طور پر آخری رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان کی حقیقت۔ اسی طرح قبر میں فرشتوں کے سوالات، عذاب قبر، حساب وکتاب، جزاء وسزاء، جنت و جہنم اور دیگر تمام غیبی امور پر ایمان لانے کے بارے میں بتائے۔ جب بچہ بولنے کی کوشش کرے تو سب سے پہلے اسے کلمۂ توحید لا اِلٰہ اِلا اللہ پڑھایا جائے تاکہ سب سے پہلے بچہ کی زبان پر جو کلمہ جاری ہو وہ کلمۂ توحید ہو اور سب سے پہلے اس کے پردۂ سماعت سے ٹکرانے والا کلمہ بھی کلمۂ توحید ہی ہو، پھر بچہ کو اس کلمہ کا معنی و مفہوم بھی بتایا جائے۔ پھر بچہ کی توجہ کائنات میں موجود بڑی بڑی نشانیوں

اور اللہ کی دی ہوئی ان عظیم نعمتوں کی طرف مبذول کرائی جائے جو اللہ تعالیٰ کی عظمت و قدرت کی گواہی دیتی ہیں۔ یہ ساری باتیں بچے کو سادہ اور دلنشیں انداز میں بتائی جائیں۔ بچہ جب کچھ بڑا ہو تو ایمانیات سے متعلق ان ہی باتوں کو تھوڑی گہرائی اور تفصیل سے ان کے ذہنوں میں بٹھایا جائے تاکہ جب وہ بڑا ہو تو اس وقت تک سارے ایمانی مباحث اس کے ذہن میں راسخ ہو چکے ہوں۔

مائیں اپنے بچوں کے دلوں میں اللہ اور اس کے رسول کی محبت کی آبیاری کریں تاکہ اس کے دل میں اللہ تعالیٰ کا تصور، اس کی خشیت، اس پر کامل اعتماد و بھروسہ، اس سے استعانت و التجاء کی کیفیت پیدا ہو اور اللہ کے علاوہ کسی اور کے سامنے نہ جھکنے اور اس کے سوا کسی اور سے نہ ڈرنے کا تصور پیدا ہو۔ اس کے دل کی گہرائی میں خالق کی عظمت و قدرت کا احساس جگانے کے لیے قرآنی قصے سنائے جائیں اور روز مرہ کی تربیت کے دوران بھی اس کی طرف توجہ دلائی جائے۔ عہد طفولت میں ایمانی تربیت کا بہترین ذریعہ اولوالعزمی اور جانی و مالی قربانیوں کے تذکرہ پر مشتمل قصے ہیں۔ بچے اس نوعیت کے واقعات کو بہت شوق و دلچسپی سے سنتے ہیں۔ بچوں کے تصورات کی دنیا بہت وسیع و عریض ہوتی ہے۔ وہ اس نوعیت کے حیرت انگیز قصوں اور محیر العقول واقعات کو سن کر اپنے تصورات کی دنیا میں آسودگی محسوس کرتے ہیں۔

قرآن مجید میں انبیائے کرام کی زندگی کے حیران کن واقعات اور ان کے حیرت انگیز معجزات کا بیان بکثرت موجود ہے، اسی طرح سیرت نبوی میں بھی اس نوعیت کے بے شمار واقعات درج ہیں۔ بچوں کے سامنے ان ایمان افروز واقعات کا تذکرہ کرنے کا فائدہ یہ ہے کہ اس سے جہاں ان کے امنڈتے جذبات کی تسکین ہوتی ہے، دوسری طرف ان کے ذہنوں میں زندگی بھر کے لیے ایمانیات کے اسباق راسخ ہو جاتے ہیں۔ اس کی وجہ سے ان کی نشو و نما اس طور پر ہوتی ہے کہ وہ اپنے رب کی تعظیم کرنے والے ہوتے ہیں اور انبیاء و صالحین کی محبت ان کے دلوں میں جاگزیں ہوتی ہے۔

بچے کی تربیت کے اس ابتدائی مرحلہ سے گزرنے کے بعد ماؤں کو چاہیے کہ وہ ہمیشہ بچوں سے نصیحت آموز اور دینی رہنمائی کی باتیں کرتی رہیں تاکہ اخلاص و توکل اور اللہ کے سامنے سپر انداز ہونے کے جذبات سے ان کی دل کی دنیا آباد رہے۔ اس تعلق سے ماؤں کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی بہترین اسوہ و نمونہ ہے۔ آپ ہمیشہ اپنے گھر کے بچوں سے وعظ و نصیحت کی باتیں کرتے رہتے تھے۔ اس طرح کی ایک روایت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ وہ بیان کرتے ہیں کہ میں ایک دن نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے سواری پر بیٹھا ہوا تھا، آپ

نے فرمایا: ”اے لڑکے! میں تم کو چند کلمات سکھاتا ہوں، تم اللہ کو یاد رکھو اللہ تم کو یاد رکھے گا، تم اللہ کو یاد رکھو تم اسے ہمیشہ اپنے سامنے پاؤ گے۔ جب تم مانگو تو اللہ سے مانگو، تمہیں مدد کی ضرورت ہو تو اللہ سے مدد طلب کرو۔ تم یہ جان لو کہ اگر سارے لوگ مل کر تم کو کوئی فائدہ پہنچانا چاہیں تو وہ تم کو صرف اتنا ہی فائدہ پہنچاسکتے ہیں جتنا اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے مقدر کر دیا ہے۔ اور اگر پوری قوم تم کو نقصان پہنچانے پر آمادہ ہو جائے تو وہ سب تم کو صرف اتنا ہی نقصان پہنچاسکتے ہیں جتنا اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے مقدر کر دیا ہے۔ قلم اٹھا لیے گئے ہیں اور صحیفے خشک ہو چکے ہیں۔“[۳۷]

ایمانیات کے یہ اسباق جب بچے کے ذہن و دماغ میں راسخ ہو جائیں گے تو کفر والحاد کے سخت حملے ایمان سے لبریز اس کے دل و دماغ پر اثر انداز نہیں ہو سکیں گے اور دین و ایمان کے منافی افکار و نظریات سے بچے کے قلوب و اذہان متاثر نہیں ہوں گے۔

سب سے پہلے خود ماؤں کو اس سے آگاہ ہونا چاہیے کہ ان کی زندگی سے تعلق رکھنے والی کونسی چیز اسلام میں حلال ہے اور کونسی چیز حرام ہے۔ جب تک انہیں احکامات کی خود واقفیت نہیں ہوگی وہ اس معاملہ میں بچے کی کوئی رہنمائی نہیں کر سکتی ہیں۔ ان احکامات سے واقف ہونے کے بعد جب وہ بچوں کو حلال و حرام کا سبق پڑھائیں گی تو وہ بڑے ہو کر حلال و حرام سے پوری طرح واقف ہوں گے، احکام شریعت پر عمل کے پابند ہوں گے اور اس طرح شاہراہ شریعت پر چلنا ان کے لیے آسان ہو گا۔

(۲) ایمانی تربیت کے دوسرے مرحلہ میں مائیں اپنی اولاد کو اسلامی عبادات کی تعلیم دیں گی اور ان کی عملی مشق کرائیں گی۔ سب سے پہلے وہ بچے کے اندر نماز اور روزے کی عادت ڈالیں گی، نیز انہیں فریضۂ زکاۃ اور حج کے بارے میں بھی بتائیں گی۔ سب سے پہلے وہ بچے کو نرمی اور خوش اسلوبی کے ساتھ دن ورات میں ادا کی جانے والی پانچوں نمازوں کا تعارف کرائیں گی اور اس کا طریقہ سکھائیں گی تاکہ وہ بچپن ہی سے نماز پڑھنے کے عادی بن سکیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ”و امر أهلک بالصلاة و اصطبر علیها“ (طٰہٰ / ۱۳۲) (ترجمہ: اپنے گھرانے کے لوگوں پر نماز کی تاکید رکھ اور خود بھی اس پر جمارہ)

قرآن مجید کی اس آیت میں یہ حکم اگرچہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو دیا گیا ہے لیکن اس کے عمومی مفہوم میں ساری امت شامل ہے۔ امام قرطبی نے اس آیت کی تفسیر میں کہا ہے کہ ”اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں آپ صلی اللہ

علیہ وسلم کو یہ حکم دیا ہے کہ آپ اپنے گھر والوں کو نماز پڑھنے کی تاکید کریں اور ان کے ساتھ خود بھی نماز پڑھیں اور اس کی پابندی کریں۔"۴۷

بچوں کو نماز پڑھنے کی تعلیم دیتے وقت اور بچپن میں ان کے اندر نماز کی عادت ڈالنے کے دوران صبر و تحمل کا مظاہرہ کیا جانا چاہیے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے ماؤں کو چاہیے کہ وہ سات سال کی عمر میں بچوں کو نماز پڑھنے کا عادی بنانے کی کوشش شروع کریں۔ عمرو بن شعیب اپنے والد اور وہ ان کے دادا سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "تم اپنی اولاد کو نماز پڑھنے کا حکم دو جبکہ وہ سات سال کی عمر کو پہنچ جائیں اور تم ان کو نماز کے لیے تنبیہاً مارو جبکہ وہ دس سال کی عمر کے ہو جائیں، اور اسی عمر میں الگ الگ بستر پر ان کے سونے کا انتظام کرو۔"۵۷

والدین کے لیے یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا واضح فرمان ہے کہ وہ اپنے بچوں کو سات سال کی عمر ہی میں نماز پڑھنے کی تعلیم دینا شروع کر دیں تاکہ اس نوخیزی کی عمر ہی سے نماز پڑھنے کی مشق ہو جائے۔ سات سال کی عمر میں بچہ کا ذہن بالکل سادہ ہوتا ہے، اس کے اندر بات ماننے اور والدین کی اطاعت کرنے کی صلاحیت بھی زیادہ ہوتی ہے اور اس عمر میں کسی بھی چیز کی عادت ڈال دینا آسان ہوتا ہے۔ اس نوعمری میں جب وہ نماز شروع کر دے گا تو یہ ایک پسندیدہ عبادت کے طور پر اس کے معمولات کا حصہ بن جائے گی۔ آگے چل کر کسی کی توجیہ و تنبیہ کے بغیر خود بخود وہ نماز پڑھنے کی طرف راغب ہوگا۔ اس طرح اللہ تعالیٰ کی اطاعت، اس کے حقوق کی ادائیگی اور اس کے لیے شکر و سپاس کے جذبات کے ساتھ اس کی پرورش ہوگی۔ اسے نماز کے دیگر فوائد بھی شروع سے حاصل ہوں گے اور اس کی زندگی پر عبادت کے خوشگوار روحانی اثرات بھی مرتب ہوں گے۔

اگر دس سال کی عمر کو پہنچنے کے بعد بچہ نماز پڑھنے سے انکار کرے یا نماز کی ادائیگی میں سستی کرے جبکہ پچھلے تین سالوں سے اسے نرمی اور شفقت کے ساتھ نماز پڑھنے کی مشق کرائی جارہی ہے تو اس صورت میں والدین کو بچہ کے نماز ترک کرنے پر تنبیہاً ہلکی پھلکی مار مارنے کی اجازت ہے۔ اصل میں جب اس نوعمری میں بچہ کو نماز کا عادی بنانے میں ناکامی ہاتھ آئے گی تو مزید بڑے ہونے پر اسے نماز کا عادی بنانے میں نسبتاً زیادہ دشواری کا سامنا کرنا پڑے گا۔ عادت ڈالنے ہی کی خاطر بچے کو رمضان کے دنوں میں چند ایام کے روزے رکھنے کی بھی مشق کرائی جائے گی، لیکن روزے کی

مشق تب کرائی جائے جب اس کے اندر بھوک پیاس کو برداشت کرنے کی سکت پیدا ہو جائے۔ اسی نو عمری کے زمانہ میں دوسری عبادات مثلاً حج و عمرہ کے بارے میں بھی بتایا جائے اور اگر ممکن ہو تو بطور مشق حج و عمرہ کرایا بھی جائے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اوپر نقل کردہ حدیث میں بچوں کے تعلق سے جو حکم دیا ہے اس کا دوسرا حصہ یہ ہے کہ دس سال کی عمر سے بچوں کو الگ الگ بستروں پر سلایا جائے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ حکم بھی بچوں کی تربیت کے تعلق سے نہایت اہم ہے۔ صحت کے اصول اور نفسیاتی و اخلاقی تربیت کے لحاظ سے اس پر عملدرآمد کو یقینی بنانے میں بچوں کی خیر و بھلائی کے ساتھ بہت ساری ممکنہ مشکلات اور پیچیدگی کا ازالہ بھی ہے۔

ماؤں کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ بچپن ہی سے اپنی بچیوں کو شرم و حیاء اختیار کرنے اور ساتر و شریفانہ لباس پہننے کا عادی بنائیں تاکہ پردہ وستر پوشی کے ساتھ اس کی پرورش ہو اور جسم کو چھپانے کی اہمیت و ضرورت بچپن ہی سے اس کے ذہن میں راسخ ہو جائے۔ اور سن شعور کو پہنچنے کے بعد حجاب و پردہ کے لیے اسے کہا جائے تو وہ برضا و رغبت اسے قبول کرے۔ اس سے جہاں اس کی عزت و آبرو کی حفاظت ہوگی وہیں پردہ کرنا اس کی پسندیدہ عادت بن جائے گی۔ پھر دین سے پہلے اس کی حیاء ہی اسے لوگوں کے سامنے جسم کے کسی پوشیدہ حصہ کو عریاں کرنے سے روکے گی۔

(۳) ماؤں کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ بچوں کو بلند اسلامی اخلاق کی بھی تعلیم دیں اور معاملات میں اسلامی سلوک و برتاؤ کا انہیں عادی بنائیں۔ اس کے لیے وہ انہیں آسان، سادہ اور قابل فہم الفاظ میں نیکی و بھلائی کے کاموں کی اہمیت و فضیلت بتائیں۔ اخلاق اور ایمان اور اخلاق و عبادات کے درمیان بہت مضبوط رشتہ ہے۔ اسلام میں عقیدہ و عبادات کے بعد اچھے اخلاق کی تیسری بنیادی حیثیت ہے۔ رسول گرامی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: ”میری بعثت اسی لیے ہوئی ہے تاکہ میں اچھے اخلاق کی تکمیل کر دوں۔“ ۷۶؎

اسلام میں اچھے اخلاق و کردار کی اہمیت کا اندازہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ ”قیامت کے دن میرے نزدیک سب سے زیادہ محبوب اور مجھ سے سب سے زیادہ قریب وہ شخص ہوگا جو تم میں سب سے زیادہ اچھے اخلاق کا حامل ہوگا۔“ ۷۷؎

بہت سی احادیث میں عمدہ اخلاق کا پیکر بننے کی ترغیب دی گئی ہے اور ان احادیث میں اچھے اخلاق کی اہمیت و خصوصیت اور اس پر ملنے والے اجر و ثواب کو بیان کیا گیا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صریح الفاظ میں والدین کو

یہ حکم دیا ہے کہ وہ اپنے بچوں کو ادب سکھائیں اور انہیں عمدہ اخلاق کا پیکر بنائیں۔ عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اپنے اولاد کی عزت افزائی کرو اور انہیں اچھے اخلاق و ادب سے آراستہ کرو۔" ۷۸

والدین کی طرف سے اولاد کے لیے بہترین تحفہ حسن ادب اور عمدہ اخلاق کی تعلیم ہے۔ ایوب بن موسیٰ اپنے والد سے اور وہ ان کے دادا سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "ایک باپ کی طرف سے اس کی اولاد کے لیے حسن ادب کی تعلیم سے بہتر کوئی تحفہ نہیں ہو سکتا ہے۔" ۷۹

اسلام نے اس سے بھی آگے بڑھ کر بچہ کو ادب سکھانے کو باپ کے لیے صدقہ جیسی عبادت سے افضل قرار دیا گیا ہے، حالانکہ صدقہ ایک اہم عبادت ہونے کے ساتھ تقرب الٰہی کا ذریعہ بھی ہے۔ سماک بن حرب جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ کے حوالہ سے نقل کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "کوئی شخص اپنے بچہ کو ادب سکھائے یہ اس سے بہتر ہے کہ وہ ایک صاع کوئی چیز صدقہ کر دے۔" ۸۰

اسلام میں چھوٹے بچوں کو ادب سکھانے کی اس قدر تاکید اس لیے کی گئی ہے کہ بچپن کی عادت ٹھوس اور پختہ ہوتی ہے اور بچپن میں بچے کسی چیز کو تیزی کے ساتھ سیکھتے ہیں جو آگے چل کر ان کے لیے فائدہ مند ثابت ہوتا ہے۔ یہ ذمہ داری سب سے پہلے ماں پر عائد ہوتی ہے کہ وہ اپنے بچہ کو اچھے اخلاق کی تعلیم دے، اس لیے کہ ماں کی گود بچہ کے لیے سب سے پہلی تربیت گاہ ہے اور ماں ہی بچہ کے لیے سب سے اولین درسگاہ ہے جہاں وہ زندگی کے ابتدائی اسباق حاصل کرتے ہیں۔ ایک چھوٹے بچہ کے لیے ماں ہی نمونہ ہوتی ہے، دن رات اسی کی باتیں بچہ کے کانوں میں پڑتی ہیں اور وہ صبح و شام اسی کی حرکات و سکنات کا مشاہدہ کرتا ہے، اس لیے ماں کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ بچہ کو اسلامی آداب سکھانے کی طرف توجہ دے۔ سب سے پہلے اس کے اندر سلام کرنے کی عادت ڈالے اور سلام کرنے کا طریقہ سکھائے، پھر کسی دوسرے کے گھر یا خلوت میں جانے سے پہلے اور وہاں سے نکلتے ہوئے اجازت لینے کی تعلیم دے۔ پھر انہیں اچھے اخلاق مثلاً صدق گوئی، امانتداری، صبر و استقامت، ایثار و قربانی، حسن سلوک و بھلائی، پریشان حال کی مدد، بڑے کا احترام، چھوٹے پر مہربانی، مہمان کی عزت افزائی، پڑوسی کے ساتھ حسن سلوک، کمزوروں کی مدد، دوسروں سے محبت، فقراء و

مساکین کے ساتھ نیکی و بھلائی کا سلوک اور صلہ رحمی کا حامل بنائے۔ قرآن مجید اور احادیث نبویہ میں ایسے احکامات اور نصوص بکثرت موجود ہیں جو ان اخلاق فاضلہ سے خود کو آراستہ کرنے کی ترغیب دیتے ہیں۔

ماؤں کی یہ ذمہ داری بھی ہے کہ وہ اپنے بچے کو برے اخلاق اور مذموم عادات واطوار سے بچانے کی بھی فکر کریں۔ اور ان کی قباحت و شناعت کے بارے میں انہیں باخبر کرتی رہیں، مثلاً جھوٹ، چوری، غیبت، چغل خوری، مذاق اڑانا، برے ناموں یا القاب سے پکارنا، نمود و نمائش، حسب و نسب پر بے جا فخر، بدگمانی، تکبر، غرور و گھمنڈ، فحش گوئی، گالی گلوچ، سختی، درشتی اور انانیت وغیرہ۔ مائیں ان برے اخلاق و عادات سے بچوں کو دور رکھنے کے لیے تربیت کے تمام وسائل و ذرائع اور اسالیب و طریقوں کو استعمال میں لائیں، مثلاً اس کے لیے کبھی ترغیب و ترہیب کا طریقہ اختیار کریں، اچھے کاموں کی تعریف اور برے کاموں کی قباحت و مذمت کو بیان کریں، کبھی اچھے کام سے خوش ہو کر بچہ کو انعام دیں اور غلطی کرنے پر سزا بھی دیں۔

بچوں کی تعلیم و تربیت میں ماؤں کا بہت اہم کردار ہے۔ اسی وجہ سے ہم دیکھتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ شدید خواہش ہوا کرتی تھی کہ مائیں بچوں کے لیے بہترین نمونہ ہوں اور ان کا کردار اور سلوک و برتاؤ پختہ و مثالی ہو۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم خود اس پہلو کی جانب ماؤں کی رہنمائی فرماتے تھے۔ عبد اللہ بن عامر رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میرے گھر میں تشریف فرما تھے، اسی دوران میری والدہ نے مجھے آواز دے کر بلایا کہ "یہاں میرے پاس آؤ، میں تمہیں کوئی چیز دوں گی۔" آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے میری والدہ سے دریافت فرمایا: "تم نے اسے کیا چیز دینے کا ارادہ کیا؟" میری والدہ نے عرض کیا: میں نے اسے کھجور دینے کا ارادہ کیا تھا۔ یہ سن کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اگر تم اسے کوئی چیز نہ دیتی تو تمہارا ایک جھوٹ لکھ لیا جاتا۔"[۸۱]

یہاں پر یہ بات جاننے کی ہے کہ لوگوں کی معمولی حرکتوں پر بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی گہری نظر ہوتی تھی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ اندیشہ ہوا کہ ایسا نہ ہو کہ ماں جھوٹ بول رہی ہو اور بچہ کو دھوکہ دے کر بلا رہی ہو اور اس کا کچھ بھی دینے کا ارادہ نہ ہو، اگر ایسا ہوا تو اس کی وجہ سے بچہ میں انحراف و بگاڑ پیدا ہوگا، کیونکہ ماں ہی اسے جھوٹ اور دھوکہ بازی کی تعلیم دے رہی ہے۔ آج کے دور میں بہت سی مائیں اس طرح کی غلط حرکت کا ارتکاب کرتی ہیں، وہ بات بات میں بچوں کے سامنے غلط بیانی کرتی ہیں۔ ایسی ماؤں کو اس بات سے آگاہ رہنا چاہیے کہ اس طرح کی غلط بیانی اور

جھوٹ کا نہایت برا اثر بچہ کی شخصیت پر مرتب ہوتا ہے۔ بچہ کے اندر نقل کرنے کی عادت ہوتی ہے، وہ اپنی ماں سے جھوٹ اور غلط بیانی سیکھتا رہتا ہے، یہاں تک کہ کذب بیانی اس کی عادت ثانیہ بن جاتی ہے۔

جھوٹ تمام برے اخلاق کی جڑ ہے۔ اسلام نے ہر قسم کی غلط بیانی سے روکا ہے، چاہے وہ تھوڑی ہو یا زیادہ۔ اسلام میں مذاقاً بھی جھوٹ بولنے کی اجازت نہیں ہے۔ اوپر نقل کردہ حدیث نبوی میں ماؤں کے لیے سبق ہے کہ ان کی ہر غلط حرکت اور اخلاقی کمزوری کو اسی پر محمول کیا جائے گا۔ مائیں بسا اوقات بچوں کو خاموش کرانے کے لیے یا ان سے کوئی کام لینے کے لیے یا انہیں خوش کرنے کے لیے جھوٹ بولتی ہیں، اس کا دوسرا نقصان یہ ہوتا ہے کہ اس تجربہ سے گزرنے کے بعد بچہ کو ماں کی بات پر بھروسہ باقی نہیں رہتا ہے اور آگے چل کر ماں کی نصیحت اور رہنمائی کی باتیں بچہ پر اثر انداز نہیں ہوتی ہیں۔

”بچہ اپنی زندگی کے ابتدائی مرحلہ میں بہت سے عادات و اخلاق کو نقل اور تقلید کے ذریعہ سیکھتا ہے۔ اس عمر میں اسے اس بات کی ضرورت ہوتی ہے کہ اس کے سامنے کوئی اچھا نمونہ ہو جس کی وہ نقل کر سکے۔ اسے ضرورت ہوتی ہے ایسے انسان کی جو اسلامی اخلاق و آداب کا مجسم پیکر ہو۔ اسلام کی نظر میں اگر کوئی شخص اپنے عمل کے ذریعہ ایک بہترین نمونہ پیش کرتا ہے تو یہ بچہ کی تربیت کے لیے ایک بہترین اور کامیاب ذریعہ و وسیلہ ثابت ہو سکتا ہے۔ جب تک کوئی اسلامی اخلاق و آداب پر عمل کر کے نہ دکھائے اس وقت کوئی بھی تعلیم صرف زبانی جمع خرچ اور کتابی باتوں تک ہی محدود رہتی ہے۔ اسلامی طور طریقہ کو جب تک کوئی شخص اپنے سلوک و برتاؤ، تصرفات و جذبات اور افکار میں برت کر نہ دکھائے اس وقت تک یہ صرف زبانی دعوی ہی رہتا ہے۔ ایک مسلمان بچہ کے لیے اس کے گھر اور خاندان کے اندر اور خود اس کے والدین کی ذات میں اسلامی اخلاق و آداب کا ماڈل و نمونہ ہونا چاہیے تاکہ بچپن ہی سے اسلامی اصولوں پر چلنے کی اسے عادت پڑ جائے اور آگے چل کر اسلامی طرز حیات کو اختیار کرنا اور اس پر قائم رہنا اس کے لیے مشکل نہ ہو۔ جو بچہ اپنے باپ کو جھوٹ بولتے ہوئے دیکھے گا وہ کبھی صدق گوئی کا سبق نہیں سیکھ پائے گا اور جس بچہ کے سامنے ماں خود کو ایک دھوکہ باز عورت کے طور پر پیش کرے گی جو اس کے باپ اور بھائی بہنوں کے ساتھ دھوکہ کا معاملہ کرتی ہے اور جھوٹ بولتی ہے، وہ بچہ کسی بھی حال میں ایک ایماندار اور سچا انسان بننے کی کوشش نہیں کرے گا۔“[۸۲]

خلاصۂ کلام یہ کہ ماؤں کو اپنے بچے کے لیے ایک اچھا نمونہ بننا چاہیے تاکہ وہ ان کے زیر سایہ بہتر تعلیم و تربیت سے مستفید ہو سکیں۔ ماؤں کے سامنے طریقۂ تربیت کے طور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کا نمونہ ہونا چاہیے جس پر وہ اعتماد کر سکیں۔ بچوں کو جب کچھ شعور ہونے لگے تو مائیں انہیں گھر میں داخل ہونے کے آداب سکھائیں جیسا کہ رب تعالیٰ نے اپنے بندوں کو حکم دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ”یا أیھا الذین آمنوا لیستأذنکم الذین ملکت أیمانکم و الذین لم یبلغوا الحلم منکم ثلاث مرات من قبل صلاۃ الفجر و حین تضعون ثیابکم من الظھیرۃ و من بعد صلاۃ العشاء ثلاث عورات لکم لیس علیکم و لا علیھم جناح بعدھن طوّافون علیکم بعضکم علی بعض کذلک یبین اللہ لکم الآیات و اللہ علیم حکیم و إذا بلغ الأطفال منکم الحلم فلیستأذنوا کما استأذن الذین من قبلھم کذلک یبین اللہ لکم آیاتہ و اللہ علیم حکیم“ (النور/۵۸-۵۹)

(ترجمہ: ایمان والو! تم سے تمہاری ملکیت کے غلاموں کو اور انہیں بھی جو تم میں سے بلوغت کو نہ پہنچے ہوں (اپنے آنے کی) تین وقتوں میں اجازت حاصل کرنی ضروری ہے۔ نماز فجر سے پہلے اور ظہر کے وقت جب کہ تم اپنے کپڑے اتار رکھتے ہو اور عشاء کی نماز کے بعد، یہ تینوں وقت تمہاری خلوت اور پردہ کے ہیں۔ ان وقتوں کے ماسوا نہ تو تم پر کوئی گناہ ہے نہ ان پر۔ تم سب آپس میں ایک دوسرے کے پاس بکثرت آنے جانے والے ہو۔ اللہ اس طرح کھول کھول کر اپنے احکام تم سے بیان فرما رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ پورے علم اور کامل حکمت والا ہے۔ اور تمہارے بچے جب بلوغت کو پہنچ جائیں تو جس طرح ان کے اگلے لوگ اجازت مانگتے ہیں انہیں بھی اجازت مانگ کر آنا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ تم سے اسی طرح اپنی آیتیں بیان فرماتا ہے، اللہ تعالیٰ ہی علم و حکمت والا ہے)

اللہ تعالیٰ نے ان آیات مبارکہ میں مومن والدین کو یہ حکم دیا ہے کہ وہ اپنے جوان بچوں اور خادموں کو تین اوقات میں اندر آنے کے آداب سکھائیں۔

(۱) فجر کی نماز سے پہلے جبکہ گھر کے افراد شب باشی کے لباس میں ہوتے ہیں یا بے لباس ہوتے ہیں۔

(۲) ظہر کی نماز کے بعد جبکہ بہت سے لوگ قیلولہ اور آرام کر رہے ہوتے ہیں اور ہلکے یا کم کپڑے زیب تن کیے ہوئے ہوتے ہیں۔

(۳) عشاء کی نماز کے بعد جبکہ لوگ دن کے کپڑے اتار دیتے ہیں اور سونے کی تیاری کر رہے ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان اوقات کو ”تخلیہ کے تین اوقات“ کا نام دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان تین اوقات

کے علاوہ دیگر اوقات میں ایک گھر کے افراد کو ایک دوسرے کے ساتھ بلا روک ٹوک ملنے سے نہیں روکا ہے تاکہ لوگ تنگی و دشواری میں نہ پڑ جائیں۔

والدین کو اس حکم الٰہی کی تعمیل کے معاملہ میں سستی اور غفلت کا شکار نہیں ہونا چاہیے۔ انہیں اپنے بچوں اور خادموں کو مذکورہ تینوں اوقات میں اجازت لے کر اندر آنے کا پابند بنانا چاہیے۔ سید قطب کہتے ہیں: ”بہت سے لوگ اللہ تعالیٰ کے بتائے ہوئے اس شریفانہ طور طریقے کو اپنی خانگی زندگی میں کوئی اہمیت نہیں دیتے ہیں اور اس پر عمل نہ کرنے کے اخلاقی، نفسیاتی اور اعصابی منفی اثرات کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ خادموں کی نگاہیں آقاؤں کے جسم کے کھلے ہوئے حصہ پر نہیں پڑتی ہیں، ان کے ذہن میں یہ بات ہوتی ہے کہ بچوں کو بلوغت سے پہلے ان باتوں کا شعور نہیں ہوتا ہے جبکہ علم نفسیات کے میدان میں بحث و تحقیق کے ماہرین اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ بچپن میں بچوں کی نگاہیں کچھ ایسے مناظر پر پڑ جاتی ہیں جن کے منفی اثرات مرتے دم تک ان کے ذہن و دماغ پر باقی رہتے ہیں، وہ اس کی وجہ سے نفسیاتی اور اعصابی امراض کا شکار ہوتے ہیں جن سے شفایابی مشکل ہو جاتی ہے۔ اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ کی علیم و خبیر ذات نے مومنوں کو زندگی کے یہ آداب سکھائے ہیں۔ وہ ایسی امت کو وجود میں لانا چاہتا ہے جس کے اعصاب مضبوط، سینے گندگی و آلائش سے پاک، جذبات و احساسات مہذب و شائستہ، دل صاف ستھرے اور تصورات پاکیزہ ہوں۔“[۸۳]

بچے جب بالغ ہو جائیں اور سن رشد کو پہنچ جائیں تو انہیں اجنبیوں کی طرح تمام اوقات میں اندر آنے کے لیے اجازت طلب کرنی چاہیے۔

بچے کی تربیت کے دوران ماؤں کو چاہیے کہ وہ اپنے فطری پیار و محبت اور شفقت و مہربانی کے ساتھ تربیت کی دیگر حکمت عملی کو بھی استعمال کریں، مثلاً کسی اچھے کام سے خوش ہو کر انعام دیں، غلطی کرنے پر ہلکی پھلکی سزا دیں اور کبھی ہمت افزائی اور تشویق کے لیے تحفے بھی دیا کریں۔ ماؤں کو بچوں پر شفقتیں نچھاور کرنے کے ساتھ تربیت کے معاملہ میں سخت بھی ہونا چاہیے۔ ماؤں کو چاہیے کہ جب وہ اپنے کئی بچوں کو کچھ دیں تو انصاف کے اصولوں پر عمل کریں اور کسی ایک کو دوسرے پر ترجیح نہ دیں۔ اس لیے کہ اولاد کے درمیان بھی عدل و انصاف ضروری ہے اور شریعت میں اس کا حکم دیا گیا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: ”تم لوگ اللہ سے ڈرو اور اپنی اولاد کے درمیان عدل و انصاف کرو۔“[۸۴]

اس حدیث میں اگرچہ بچوں کو تحفہ وغیرہ کوئی بھی چیز دینے کے معاملہ میں انصاف کرنے کا حکم دیا گیا ہے لیکن اس کا عمومی مفہوم یہ ہے کہ ہر معاملہ میں اور ہر موقع پر اولاد کے درمیان عدل و انصاف کیا جائے۔ بچوں میں سے ایک کو دوسرے پر ترجیح دینے کی وجہ سے ان میں آپسی حسد، بغض اور ناچاقی پیدا ہو گی اور اس کے گہرے نفسیاتی اثرات ان پر مرتب ہوں گے۔ اور جب بچوں کو والدین کی طرف سے ہمیشہ انصاف اور برابری کا تجربہ ہو گا تو اس کی وجہ سے ان میں آپسی محبت، میل ملاپ اور ہمدردی ورحمدلی کے جذبات پروان چڑھیں گے۔

لقمان علیہ السلام نے اپنے بیٹے کو جو نصیحت کی تھی اس میں بہترین اور جامع ایمانی و اخلاقی تربیت کے نکات موجود ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ”و إذ قال لقمان لابنہ و ھو یعظہ یا بنیّ لا تشرک باللہ إن الشرک لظلم عظیم و وصینا الإنسان بوالدیہ حملتہ امّہ وھنا علی وھن و فصالہ فی عامین أن اشکر لی و لوالدیک إلیّ المصیر و إن جاھداک علیٰ أن تشرک بی ما لیس لک بہ علم فلا تطعھما و صاحبھما فی الدنیا معروفا و اتبع سبیل من أناب إلیّ ثم إلیّ مرجعکم فأنبئکم بما کنتم تعملون یا بنیّ إنھا إن تک مثقال حبّۃ من خردل فتکن فی صخرۃ أو فی السماوات أو فی الأرض یأت بھا اللہ أن اللہ لطیف خبیر یا بنیّ أقم الصلاۃ و امر بالمعروف و انہ عن المنکر و اصبر علیٰ ما أصابک إن ذلک من عزم الأمور و لا تصعّر خدک للناس و لا تمش فی الأرض مرحا إن اللہ لا یحب کل مختال فخور و اقصد فی مشیک و اغضض من صوتک إن أنکر الأصوات لصوت الحمیر“ (لقمان/۱۳-۱۹)(ترجمہ: اور جب کہ لقمان نے نصیحت کرتے ہوئے اپنے لڑکے سے کہا کہ میرے پیارے بچے اللہ کے ساتھ شریک نہ کرنا، بیشک شرک بڑا بھاری ظلم ہے۔ ہم نے انسانوں کو اس کے ماں باپ کے متعلق وصیت کی ہے، اس کی ماں نے دکھ پر دکھ اٹھا کر اسے حمل میں رکھا اور اس کی دودھ چھڑائی دو برس میں ہے کہ تو میری اور اپنے ماں باپ کی شکر گزاری کر، تم سب کو میری ہی طرف لوٹ کر آنا ہے۔ اور اگر وہ دونوں تم پر اس بات کے لیے دباؤ ڈالیں کہ تو میرے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرائے جس کا تجھے علم نہ ہو تو تو ان کا کہنا نہ ماننا، ہاں دنیا میں ان کے ساتھ اچھی طرح بسر کرنا اور اس کی راہ چلنا جو میری طرف جھکا ہوا ہو، تمہارا سب کا لوٹنا میری ہی طرف ہے، تم جو کچھ کرتے ہو اس سے پھر میں تمہیں خبردار کر دوں گا۔ پیارے بیٹے! اگر کوئی چیز رائی کے دانے کے برابر ہو، پھر وہ خواہ کسی چٹان میں ہو یا آسمانوں میں ہو یا زمین میں ہو اسے اللہ تعالیٰ ضرور لائے گا، اللہ تعالیٰ بڑا باریک بین اور خبردار ہے۔ اے میرے بیٹے! تو نماز قائم رکھنا، اچھے کاموں کی نصیحت کرتے رہنا، برے کاموں سے منع کیا کرنا اور جو مصیبت تم پر آجائے اس پر صبر کرنا، یقین مانو کہ یہ بڑے تاکیدی کاموں میں سے ہے۔ لوگوں کے سامنے اپنے گال نہ پھلا اور زمین پر اترا کر نہ چل، کسی تکبر کرنے والے شیخی خورے کو اللہ تعالیٰ

پسند نہیں فرماتا۔ اپنی رفتار میں میانہ روی اختیار کر اور اپنی آواز پست کر، یقیناً آوازوں میں سب سے بدتر آواز گدھوں کی آواز ہے)

اوپر کی آیات میں لقمان علیہ السلام کی زبانی ان کے بیٹے کو جو نصیحتیں کی گئی ہیں، ایک ماں اگر اپنے بچہ کی اسی کی روشنی میں تربیت کرے تو یہ ماں کی طرف سے بچہ کے لیے بہترین نصیحت اور قیمتی سوغات ہوگی۔ بچہ کے لیے ان نصیحتوں کو پیش کرنے کے بعد ماں کو یہ امید رکھنی چاہیے کہ اللہ تعالیٰ اس کے بچہ کو خیر کی توفیق دے گا اور اس کی رہنمائی کرے گا اور بچہ کی تربیت کے لیے اس کی محنت کو کامیاب بھی کرے گا۔

گھر اور خاندان سے متعلق ماں کی جو ذمہ داریاں ہیں اسے خود ہی انجام دینا چاہیے۔ خاص طور پر بچہ کی تربیت سے متعلق اپنی ذمہ داری کو نوکروں، بچہ کی دیکھ بھال کرنے والے مراکز اور معلمین کے حوالہ کر کے وہ اپنی ذمہ داری سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتی ہے۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا اس سلسلہ میں بہت واضح ارشاد ہے کہ "ہر عورت اپنے شوہر کے گھر کی نگراں اور ذمہ دار ہے اور وہ اپنے ماتحتوں کے بارے میں جواب دہ ہے۔[۸۵]" گھر اور افراد خانہ کی دیکھ بھال کی ذمہ داری مکمل طور پر عورت ہی کی ہے، البتہ نوکروں سے گھر کا کام کاج کرانے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ وہ خادم اور خادماؤں سے گھر کی صفائی ستھرائی اور مطبخ کے کام لے سکتی ہے۔ اس طرح وہ اپنے بچوں کی تعلیم و تربیت کے لیے زیادہ وقت فارغ کر سکتی ہے اور اس اہم کام میں اپنی صلاحیت کا بہتر طور پر استعمال کر سکتی ہے۔

حواشی:

۱۔ صحیح مسلم بشرح النووی، کتاب القدر باب کل مولود یولد علی الفطرة، جلد۵، ص۵۱۲

۲۔ سنن ترمذی، کتاب الجهاد باب ما جاء فی الإمام، جلد۴، ص۲۰۸

۳۔ فتح الباری شرح صحیح بخاری، کتاب النکاح باب المرأة راعیة فی بیت زوجها، جلد۹، ص۲۹۹

۴۔ الجامع لأحکام القرآن، مؤلفه ابو عبدالله محمد بن احمد الانصاری القرطبی، جلد۱۸، ص۷۲، تفسیر سورة الممتحنة

۵۔ تفسیر القرآن العظیم، مؤلفه ابن کثیر، جلد۴، ص۳۵۴

۶۔ تفسیر القرآن العظیم، مؤلفه ابن کثیر، جلد۱، ص۲۸۴، تفسیر سورة البقرة

۷۔ صحیح بخاری، کتاب النکاح باب إلی من ینکح و أی نساء خیر، **جلد۶، ص۱۳۰**

۸۔ صحیح بخاری، کتاب الأدب باب رحمۃ الولد و تقبیلہ و معانقتہ، **جلد۷، ص۷۵**

۹۔ *حوالہ سابق*

۱۰۔ صحیح بخاری، کتاب الأدب باب وضع الصبی علی الفخذ، **جلد۷، ص۷۶**

۱۱۔ صحیح مسلم بشرح النووی، کتاب البر و الصلۃ و الآداب باب فضل الإحسان إلی البنات، **جلد۱۶، ص۱۸۰**

۱۲۔ عون المعبود شرح سنن أبی داؤد، کتاب الأدب باب فی تغییر الأسماء، **جلد۱۳، ص۲۹۶**

۱۳۔ صحیح مسلم بشرح النووی، کتاب الأدب باب بیان ما یستحب من الأسماء، **جلد۱۴، ص۱۱۳**

۱۴۔ عون المعبود شرح سنن أبی داؤد، کتاب الآداب باب فی تغییر الأسماء، **جلد۱۳، ص۲۹۳**

۱۵۔ صحیح مسلم بشرح النووی، کتاب الآداب باب الأسماء المحرمۃ، **جلد۱۴، ص۱۲۲**

۱۶۔ صحیح بخاری، کتاب الآداب باب قول النبی صلی اللہ علیہ و سلم: سمّوا باسمی و لا تکنوا بکنیتی، **جلد ۷، ص۱۱۶**

۱۷۔ *حوالہ سابق*

۱۸۔ صحیح مسلم بشرح النووی، کتاب الآداب باب استحباب تغییر الاسم القبیح إلی حسن، **جلد۱۳، ص ۱۱۹**

۱۹۔ عون المعبود شرح سنن أبی داؤد، کتاب الجنائز باب البکاء علی المیت، **جلد۸، ص۳۹۸**

۲۰۔ سنن ترمذی، کتاب الأضاحی باب العقیقۃ، **جلد۴، ص۱۰۱**

۲۱۔ سنن ترمذی، کتاب الأضاحی باب الأذان فی أذن المولود، **جلد۴، ص۹۷**

۲۲۔ تحفۃ المودود فی أحکام المولود، ***مؤلفہ ابن قیم الجوزیۃ، ص۲۵***

۲۳۔ صحیح مسلم بشرح النووی، کتاب الآداب، **جلد۱۴، ص۱۳۵**

۲۴۔ *حوالہ سابق*

۲۵۔ صحیح بخاری، کتاب العقیقۃ باب إماطۃ الأذی عن الصبی، **جلد۶، ص۲۱۷**

۲۶۔ سنن ترمذی، کتاب الأضاحی باب من العقیقة، **جلد۴، ص۱۰۱**

۲۷۔ **حوالہ سابق، ص۹۶**

۲۸۔ **حوالہ سابق، ص۹۹**

۲۹۔ المغنی، **مؤلفہ ابن قدامہ، جلد۳، ص۵۸۹**

۳۰۔ صحیح مسلم بشرح النووی، کتاب الطهارة باب خصال الفطرة، **جلد۴، ص۱۴۶**

۳۱۔ **حوالہ سابق**

۳۲۔ تحفة المودود بأحكام المولود، **مؤلفہ ابن قیم الجوزیہ، ص۱۲۷**

۳۳۔ عون المعبود شرح سنن أبی داؤد، کتاب الطهارة، **جلد۲ (امام ابو داؤد نے اس حدیث کو ضعیف کہا ہے)**

۳۴۔ **ابن قیم نے اس حدیث کو**شرح سنن أبی داؤد، کتاب الأدب باب الختان، **ص۸۵ میں نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ روایت منقطع ہے۔**

۳۵۔ إحياء علوم الدين، مؤلفہ امام غزالی، کتاب رياضة النفس بيان الطريق فی رياضة الصبيان فی أول نشؤهم و وجه تأديبهم و تحسين أخلاقهم، **ص۷۲**

۳۶۔ **حوالہ سابق**

۳۷۔ الجامع لأحكام القرآن، **مؤلفہ ابو عبد اللہ محمد بن أحمد الأنصاری القرطبی، جلد۱، ص۵۰۰**

۳۸۔ صحیح مسلم بشرح النووی، کتاب الطهارة باب نجاسة البول و وجوب الاستبراء، **جلد۳، ص۲۰۰**

۳۹۔ صحیح بخاری، کتاب الوضوء باب الاستنجاء بالماء، **جلد۱، ص۲۵۰**

۴۰۔ صحیح مسلم بشرح النووی، کتاب الطهارة باب آداب قضاء الحاجة، **جلد۳، ص۱۵۹**

۴۱۔ سنن نسائی، کتاب الطهارة باب الترغيب فی السواک، **جلد۱، ص۱۰**

۴۲۔ صحیح مسلم بشرح النووی، باب الطهارة، **جلد۳، ص۱۴۳**

۴۳۔ **حوالہ سابق**

۴۴۔ السواک دراسة بنائية كيميائية صحية **(مقالہ برائے پی ایچ ڈی، دمشق یونیورسٹی) مقالہ نگار: صلاح الدین حنفی،**

مشرف: ڈاکٹر محمد زہیر بابا، ص ۲۴

۴۵۔ صحیح مسلم بشرح النووی، کتاب الطهارة باب صفة الوضوء، **جلد ۳، ص ۱۲۴**

۴۶۔ **حوالہ سابق**

۴۷۔ صحیح مسلم بشرح النووی، کتاب الجمعة، **جلد ۶، ص ۱۳**

۴۸۔ **حوالہ سابق**

۴۹۔ سنن ابن ماجہ، کتاب إقامة الصلاة و السنة فيها باب ما جاء فى الزينة يوم الجمعة، **جلد ۱، ص ۲۴۸**

۵۰۔ **حوالہ سابق**

۵۱۔ مشكاة المصابيح، کتاب البيوع باب الكسب و طلب الحلال، **مؤلفہ خطیب تبریزی، تحقیق: محمد ناصر الدین البانی،**

جلد ۲، ص ۸۴۵

۵۲۔ سنن ترمذی، کتاب الزهد باب ما جاء فى كراهية كثرة الأكل، **جلد ۴، ص ۵۹۰**

۵۳۔ الغذاء لا الدواء، مؤلفہ صبری القبانی، **ص ۵۷۲**

۵۴۔ مع الطب فى القرآن الكريم، مؤلفہ دکتور عبدالحميد دياب و دکتور احمد قرموز، **ص ۱۲۹**

۵۵۔ أحسن القصص، مؤلفہ علی فکری، **جلد ۳، ص ۱۳۴**

۵۶۔ صحیح مسلم بشرح النووی، کتاب الأشربة باب آداب الطعام و الشراب، **جلد ۱۱، ص ۱۹۳**

۵۷۔ **حوالہ سابق**

۵۸۔ **حوالہ سابق**

۵۹۔ **حوالہ سابق**

۶۰۔ **حوالہ سابق**

۶۱۔ **حوالہ سابق**

۶۲۔ **حوالہ سابق**

۶۳۔ سنن ترمذی، باب تفسیر سورة الأنفال، **جلد۵، ص۲۷۰**،سنن ابن ماجہ، باب الرمی فی سبیل اللہ، **جلد۲، ص۹۴۰**

۶۴۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الزھد باب التوکل و الیقین، **جلد۲، ص۱۳۹۵، حدیث نمبر:۴۱۶۸**

۶۵۔ صحیح مسلم بشرح النووی، کتاب السلام باب لکل داء دواء، **جلد۱۴، ص۱۹۱**

۶۶۔ سنن ترمذی، کتاب الطب باب ما جاء فی الدواء و الحث علیہ، **جلد۴، ص۳۸۳، حدیث نمبر:۲۰۳۸**

۶۷۔ تفسیر القرآن العظیم، **مؤلفہ ابن کثیر، جلد۴، ص۵۲۸**

۶۸۔ الجامع لأحکام القرآن، **مؤلفہ ابو عبد اللہ محمد بن احمد الأنصاری القرطبی، جلد۲، ص۱۲۰**

۶۹۔ صور من حیاة الرسول صلی اللہ علیہ و سلم، مؤلفہ امین دویدار، **ص۳۲۲**

۷۰۔ **سنن ابن ماجہ، باب۱۷، جلد۱، ص۸۰**

۷۱۔ صحیح بخاری، کتاب الأدب باب رحمة الناس بالبھائم، **جلد۷**

۷۲۔ تربیة الأولاد فی الإسلام، مؤلفہ عبداللہ ناصح علوان، **ص۱۵۱**

۷۳۔ سنن ترمذی، کتاب صفة القیامة، **جلد۴، ص۶۶۷**

۷۴۔ الجامع لأحکام القرآن، **مؤلفہ ابو عبد اللہ محمد بن أحمد الأنصاری القرطبی، جلد۷، ص۲۶۳**

۷۵۔ عون المعبود شرح سنن أبی داؤد، کتاب الصلاة باب متی یؤمر الغلام بالصلاة، **جلد۲**

۷۶۔ المنتقی شرح مؤطا امام مالک، مؤلفہ امام باجی، باب ما جاء فی حسن الخلق، **جلد۷، ص۲۱۳**

۷۷۔ جامع الأصول فی أحادیث الرسول، مؤلفہ ابن اثیر الجزری، **جلد۴، ص۶**

۷۸۔ سنن ابن ماجہ، کتاب الأدب باب الولد و الإحسان إلی البنات، **جلد۱، ص۱۲۱۱**

۷۹۔ سنن ترمذی، کتاب البر و الصلة باب ما جاء فی أدب الولد، **جلد۴، ص۳۳۸**

۸۰۔ **حوالہ سابق**

۸۱۔ عون المعبود شرح سنن أبی داؤد، کتاب الأدب باب التشدید فی الکذب، **جلد۱۳، ص۳۳۵**

۸۲۔ منهج التربیۃ الإسلامیۃ، **مؤلفہ محمد قطب، ص۲۲۱**

۸۳۔ فی ظلال القرآن، **مؤلفہ سید قطب، جلد۴، ص۲۵۳۲**

۸۴۔ صحیح بخاری، کتاب الهبۃ باب الهبۃ للولد، **جلد۳، ص۱۳۳**

۸۵۔ فتح الباری شرح صحیح بخاری، کتاب النکاح باب المرأۃ راعیۃ فی بیت زوجها، **جلد۹، ص۲۹۹**

خاتمہ

اسلام کی آمد سے پہلے دنیا کی قدیم تہذیبوں میں عورتوں کی مختلف حیثیتوں کا جائزہ لینے کے بعد میں نے دنیا کے مختلف مذاہب بالخصوص آسمانی مذاہب میں عورتوں کے مقام اور ان کے حقوق پر روشنی ڈالی ہے۔ اس سلسلہ میں میں نے بہت سارے تاریخی شواہد و دستاویز بھی پیش کیے ہیں۔ ان تمام حقائق سے روبرو ہونے کے بعد میں نے کچھ نتائج اخذ کیے ہیں جنہیں میں یہاں پیش کر دینا مناسب سمجھتا ہوں۔

تاریخ کی ورق گردانی کرنے سے یہ بالکل صاف ہو جاتا ہے کہ معلوم انسانی تاریخ میں عورتیں بدترین معاشرتی پستی و انحطاط کا شکار رہی ہیں۔ تقریباً ہر دور میں ان کے حقوق و مراعات سے زیادہ ان پر فرائض اور ذمہ داریوں کا بوجھ ڈالا گیا۔ انہیں لامحدود ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کا مکلف بنایا گیا اور اس کے عوض انہیں ان کے بنیادی حقوق سے بھی محروم رکھا گیا۔ انسانی تاریخ کے اس گوشہ کو جو عورتوں سے تعلق رکھتا ہے، ہمیشہ نظر انداز ہی کیا گیا۔ اور اگر کبھی اس کا جائزہ لینے کی کوشش بھی کی گئی تو اس کا انداز یا تو دیومالائی تھا یا معذرت خواہانہ تھا یا پھر عام طور پر جانبدارانہ تھا۔

اسی لیے میں پوری شدت کے ساتھ اس بات کی وکالت کرتا ہوں کہ پوری انسانی تاریخ کے دوران عورتوں کی صورت حال کا از سر نو جائزہ لینے کی ضرورت ہے۔ میرا یہ مشورہ ہے کہ مسلمان مورخین مثبت، موضوعی اور منطقی انداز میں دوبارہ تاریخ کو لکھنے کی کوشش کریں۔ اس کے لیے وہ تین باتوں کا خاص طور پر التزام کریں۔ پہلے وہ پوری تاریخ انسانی کا اس طرح مکمل جائزہ لیں کہ کوئی گوشہ نظر انداز نہ ہو، تاریخ کو از سر نو مرتب کریں اور غلط معلومات کی اصلاح بھی کریں۔ اس کے بعد ہی محققین کے لیے صحیح و منصفانہ رائے پیش کرنا ممکن ہو گا۔

میں اپنے بحث و تحقیق کے سفر میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ جب ہم اپنے نظریہ کی وسیع تناظر میں بازیافت کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے تو انسانیت کے بارے میں بالعموم اور عورتوں کے بارے میں بالخصوص ہم جو نظریہ و تحقیق پیش کریں گے اسے اسلام کی تائید بھی حاصل ہو گی۔

اس موضوع کا مطالعہ کرتے ہوئے میرے لیے یہ بالکل واضح ہو گیا کہ دیگر انسانی تہذیبوں میں عورتوں کو زندگی کے مختلف مراحل میں بہت کم مراعات اور حقوق دیئے گئے۔ اس طرح کی تمام تہذیبوں میں مردوں کے ذاتی مفادات کی تکمیل کے لیے مردوں کی پسند کے سماجی قوانین بنائے گئے۔ اپنی عورتوں کو مقام وعزت دینے کی بات ان کے ذہن میں کبھی آتی ہی نہیں تھی۔ اسی لیے اگر عورتوں کو کچھ حقوق و مراعات کسی طرح مل بھی جاتے تھے تو مرد اسے چھین لینے کے درپے رہتے تھے۔

یہی وجہ ہے کہ معاشرہ میں عورتوں کی غیر مستحکم صورت حال جس کے لیے مردوں کے بنائے ہوئے قوانین ذمہ دار تھے، کے تعلق سے بہت سارے طلبا اور بحث و تحقیق سے دلچسپی رکھنے والے افراد نے غلط اور متضاد رائے پیش کی اور اپنے نظریہ کی تائید کے لیے کمزور و باطل تاویلات کا سہارا لیا۔

اس کتاب کا پہلا باب میرے لیے سب سے زیادہ مشکل ثابت ہوا، کیونکہ اس کے لیے ہمارے پاس قابل اعتماد مراجع و مصادر بہت محدود تھے۔ اور اس موضوع پر جن مراجع تک ہماری رسائی ہوئی ان میں بھی مستند اور غیر مستند ماٰخذ کے درمیان تمیز کرنا بہت مشکل کام تھا۔ جو تاریخی شواہد، ثبوت اور دستاویز ہمارے سامنے موجود تھے ان کی معتبریت کو جانچنے اور پرکھنے کے ساتھ میں نے ان سب کا گہرائی سے مطالعہ کیا اور ان کے بارے میں اہل علم کی رائے اور تبصرہ کا تجزیہ کیا، پھر ان تاریخی شواہد سے جو نتیجہ برآمد ہوا اسے پیش کیا۔ یہ نہایت مشکل کام تھا جو بہت وقت طلب بھی تھا اور بہت محنت و مشقت کا متقاضی بھی تھا، لیکن اسلام میں عورتوں کے مقام اور حیثیت کا تجزیاتی مطالعہ پیش کرنے کے لیے ان دشوار گزار مراحل کو عبور کرنا بھی ضروری تھا۔

پہلے باب میں میں نے یہ واضح کرنے کی بھی کوشش کی ہے کہ زمانۂ جاہلیت سے مراد کوئی مخصوص اور محدود زمانہ نہیں ہے بلکہ اس کا تعلق انسانی زندگی کے ان خود ساختہ اور ظالمانہ قوانین اور اصول و ضوابط سے ہے جو احکام الٰہی کے برخلاف ہیں اور ان سے متصادم نظر آتے ہیں۔ انسانیت کو شرمسار کرنے والے اس طرح کے ظالمانہ و سیاہ

قوانین چاہے جس دور میں نظر آ جائیں ہم اس دور پر زمانہ جاہلیت کا اطلاق کر سکتے ہیں؛ اس میں اہل یونان کا دور جاہلیت، رومیوں کا عہد جاہلیت، ابو جہل کی جاہلیت اور بیسویں صدی کی جاہلیت سب شامل ہے۔ یہودیت اور عیسائیت جیسے آسمانی مذاہب کے پیروکاروں نے بھی اپنی جاہلیت و ناواقفیت کی وجہ سے عورتوں کی محکومیت کو بڑھاوا دیا۔ ان دونوں مذاہب کے متبعین نے عورتوں کی سماجی حیثیت کو گرانے اور انہیں اذیت پہنچانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ ان لوگوں نے بھی عورتوں کے ساتھ ایک ناپاک اور بری مخلوق جیسا ہی سلوک روا رکھا۔

دوسرا باب جس میں مسلمان خواتین کے حقوق سے بحث کی گئی ہے، کا بنیادی مأخذ قرآن مجید اور صحیح احادیث نبویہ ہیں۔ اس ضمن میں میں نے علماء و دانشوروں کی تشریحات اور آراء بھی بطور حوالہ جات پیش کیا ہے۔ اس کے ذریعہ میں نے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ ان اہل علم نے جو کچھ کہا ہے میں نے اسے اچھی طرح سمجھا ہے تبھی میں نے اسے بطور حوالہ پیش کیا ہے تاکہ کوئی یہ نہ سمجھے کہ یہ ساری باتیں میری ذاتی آراء و نظریے سے تعلق رکھتی ہیں۔

اس زیر بحث موضوع کے وسیع تر جائزے سے جو نتائج بر آمد ہوئے ہیں قارئین بآسانی ان کا ادراک کر سکیں گے۔ میں نے ٹھوس دلائل سے یہ بات ثابت کر دی ہے کہ اسلام ہی وہ دین ہے جس نے عورت کی انسانیت کے تعلق سے پھیلی ہوئی غلط فہمی کو دور کر کے اسے انسانی معاشرہ میں عزت و وقار عطا کیا اور اسے مردوں کے اس تحقیر آمیز سلوک سے آزاد کرایا جس نے اسے صدیوں سے پسماندگی و گمنامی سے دوچار کر رکھا تھا۔

میں نے قرآن مجید کی آیات اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی صحیح احادیث کے حوالہ سے یہ ثابت کر دیا ہے کہ مردوں کی طرح عورتوں کو بھی تمام اسلامی عبادات کو انجام دینے کا حق ہے اور مردوں کی طرح عورتوں سے بھی یہ مطلوب ہے کہ وہ اپنے تمام شرعی فرائض و واجبات کو ادا کریں۔ منہیات، جزاء و سزا اور اجر و ثواب کے معاملہ میں بھی عورتیں مردوں کے برابر ہیں۔ اللہ کے حکموں کی تعمیل کرنے کی وجہ سے عورتیں بھی اس کی بنائی ہوئی جنت میں جانے کی مستحق ہیں۔ اور اللہ کی نافرمانی کرنے کی صورت میں مردوں کی طرح ان کے لیے بھی جہنم کی آگ کا ایندھن بننے کی سخت وعید موجود ہے۔ **اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:** "إن المسلمين و المسلمات و المؤمنين و المؤمنات و القانتين و القانتات و الصادقين و الصادقات و الصابرين و الصابرات و الخاشعين و الخاشعات و المتصدقين و المتصدقات و الصائمين و الصائمات و الحافظين فروجهم و الحافظات و الذاكرين الله كثيرا و الذاكرات أعد الله لهم مغفرة و أجراً عظيما" (الأحزاب/۳۵) (ترجمہ: **بیشک مسلمان مرد اور مسلمان عورتیں، مومن مرد اور مومن عورتیں، فرمانبرداری کرنے والے مرد اور فرمانبردار عورتیں، راست باز مرد**

اور راست باز عورتیں، صبر کرنے والے مرد اور صبر کرنے والی عورتیں، عاجزی کرنے والے مرد اور عاجزی کرنے والی عورتیں، خیرات کرنے والے مرد اور خیرات کرنے والی عورتیں، روزے رکھنے والے مرد اور روزے رکھنے والی عورتیں، اپنی شرمگاہ کی حفاظت کرنے والے مرد اور حفاظت کرنے والی عورتیں، بکثرت اللہ کا ذکر کرنے والے اور ذکر کرنے والیاں، ان سب کے لیے اللہ تعالیٰ نے (وسیع) مغفرت اور بڑا ثواب تیار کر رکھا ہے)

میں نے قرآن مجید کی آیات کریمہ اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث مبارکہ کے حوالہ سے یہ ثابت کر دیا ہے کہ:

اسلام نے عورتوں کی عزت و تکریم کی ہے اور اس کی شخصیت کو وہ اہمیت دی ہے جس کی وہ مستحق تھی۔ اس کا واضح ثبوت یہ ہے کہ اس نے مسلمانوں کو بچی کی پیدائش پر مایوس یا غمگین ہونے اور اسے نحوست قرار دینے سے روکا ہے۔ بچوں کے ساتھ ظلم و زیادتی کی یہ صورت حال زمانۂ جاہلیت میں بڑے پیمانہ پر موجود تھی اور آج کے اس ترقی یافتہ دور میں بھی یہ جاہلی رویہ اور سوچ کسی نہ کسی حد تک موجود ہے۔ اسلام نے ماں، بیٹی، بیوی اور بہن ہر حیثیت میں عورت کی عزت و تکریم اور اس کے ساتھ حسن سلوک کا حکم دیا ہے۔

اسلام حصول علم کے لیے مرد و عورت دونوں کی ہمت افزائی کرتا ہے، اور شرعی احکام تک رسائی کو دونوں کے فرائض میں شامل کرتا ہے۔ مردوں کو یہ حکم ہے کہ وہ عورتوں کے لیے حصول علم کی راہ کو آسان بنائیں اور انہیں اعلیٰ و بہترین تعلیم و تربیت سے آراستہ کرنے کا مکمل انتظام کریں تاکہ وہ زیور علم سے آراستہ ہونے کے بعد اپنے خالق و مالک کی صحیح طریقے سے عبادت کرنے کے ساتھ اپنے گھر اور معاشرہ کے لیے ایک مفید و صالح عنصر ثابت ہوں۔

اسلام نے عورتوں کو ماں، بیوی اور بیٹی کی حیثیت سے وراثت میں حقدار بنایا ہے۔ اس معاملہ میں اس کی عمر، مالی حیثیت اور وراثت میں حاصل ہونے والے مال کے تعلق سے کوئی قید و بندش نہیں لگائی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے عورتوں کو یہ حق عطا کیا ہے جس میں نہ تو کوئی ترمیم کی جاسکتی ہے اور نہ اسے اس حق سے محروم کیا جاسکتا ہے۔

اسلام نے عورتوں کو مردوں کی ناانصافی اور استحصال سے آزادی عطا کی ہے اور انہیں مردوں کے برابر حقوق دیئے ہیں۔ قرآن مجید میں صاف طور پر یہ بات کہی گئی ہے کہ عورتوں کے مردوں پر بھی حقوق ہیں جو اس کے اخراجات مہیا کرنے اور اس کے ساتھ حسن سلوک کرنے سے متعلق ہیں جس طرح عورتوں پر ان کے شوہر کے حقوق

ہیں جو اس کی اطاعت کرنے اور اس کے ساتھ عزت و احترام سے پیش آنے سے متعلق ہیں۔(آل عمران /۲۲۸) شوہر اور بیوی کی باہمی معاشرت کے تعلق سے یہ بات طے کر دی گئی ہے کہ مرد گھر کا ذمہ دار ہو گا اور بیوی کے مقابلہ اس کی حیثیت ایک درجہ اوپر ہو گی۔(آل عمران /۲۲۸) مرد کی یہ ایک درجہ برتری ان ذمہ داریوں کی وجہ سے ہے جو اس کے کندھوں پر ڈالی گئی ہے، نہ کہ محض مرد ہونے کی وجہ سے۔

اسلام نے ہر آزاد عورت کو شوہر کے انتخاب کا حق دیا ہے۔ قرآن مجید کی آیات اور احادیث نبوی کے مضامین سے یہ حکم بالکل واضح ہے۔

مسلم خواتین کے بھی وہی مالیاتی حقوق اور ذمہ داریاں ہیں جو مردوں کی ہیں۔ انہیں اپنے مال و جائیداد پر مکمل اختیارات حاصل ہوتے ہیں، خرید و فروخت، ادائیگی، شرط عائد کرنے، پیشگی ادائیگی، تبادلہ، تملیک، پیشگی حکم نافذ کرنے، کرایہ دار رکھنے، ضمانت دینے، احتیاطی تدابیر کا استعمال کرنے، چیزوں کو استعمال کرنے، مال و جائیداد کو وقف کرنے اور کسی کو امان دینے یا معاف کرنے کا عورتوں کو بھی اتنا ہی حق ہے جتنا مردوں کو ہے۔ یہاں میں دو اہم گوشوں پر مزید روشنی ڈالنا چاہتا ہوں جو اکثر بحث و مباحثہ کا موضوع بنتے ہیں۔

۱۔ ایک نوعمر لڑکی کو اس کے وراثت کے مال اور جائیداد پر کس عمر میں مکمل اختیار دے دیا جائے گا؟

۲۔ کیا بیوی اپنے ذاتی مال کو شوہر کی مرضی کے بغیر خرچ کرنے کا حق رکھتی ہے؟

میں نے اوپر کی سطروں میں شرعی اصول و احکام کی بنیاد پر یہ بات ثابت کر دی ہے کہ اسلام لڑکی کے ساتھ بھی بالکل لڑکے ہی کی طرح معاملہ اور سلوک کرنے کا حکم دیتا ہے اور ان دونوں کے درمیان کسی بھی طرح کی تفریق یا امتیاز کرنے سے منع کرتا ہے۔ نیز یہ بات بھی ثابت کی جا چکی ہے کہ سن شعور کو پہنچتے ہی لڑکی کا مال اس کے حوالہ کر دیا جائے گا اور وہ اپنے شوہر کی اجازت کے بغیر بھی اپنے ذاتی مال کو جہاں چاہے خرچ کر سکتی ہے۔

اسلام ایک نوعمر چھوٹی لڑکی کو یہ مشورہ دیتا ہے کہ وہ کسی مناسب آدمی کو اپنا سرپرست بنا لے جو اس کی اور اس کے مال کی حفاظت کرے، لیکن اس سرپرست کو یہ اجازت نہیں ہے کہ وہ لڑکی پر اپنے اثر ورسوخ کو بے جا طور پر استعمال کرے اور لڑکی کی مرضی و خواہش کو نظر انداز کر کے اس پر اپنی مرضی تھوپ دے اور نہ ہی لڑکی کی مرضی کے بغیر اس کے مال میں تصرف کرنے کا حق سرپرست کو حاصل ہے۔

عائلی معاملات مثلاً نکاح و طلاق میں بھی اسلام نے مردوں کے یک طرفہ لامحدود اختیارات اور ان کی آمریت پر قدغن لگادی ہے جس کا مظاہرہ زمانۂ جاہلیت میں خوب ہوا کرتا تھا۔ اس دور میں عورتیں مردوں کے رحم و کرم پر ہوتی تھیں جو ان کے ساتھ اپنی خواہش و مرضی کے مطابق سلوک کرتے تھے۔ مرد اپنی بیویوں کو جتنی چاہتے طلاق دیتے تھے، نہ اس کی کوئی حد تھی، نہ اس کے لیے کوئی اصول وضابطہ تھا اور نہ حالات و مواقع کا کوئی لحاظ خیال تھا۔ اسلام نے زیادہ سے زیادہ تین طلاق کی حد مقرر کر دی جس کے بعد شوہر کو رجوع کرنے کا اختیار نہیں رہتا ہے۔

میں نے اس کتاب میں اس کی وضاحت کر دی ہے کہ بعض حالات میں اسلام نے عورتوں اور مردوں کے ساتھ الگ الگ طرح کا معاملہ کیوں کیا ہے، وہیں پر میں نے یہ بھی واضح کر دیا ہے کہ مرد و عورت کی مختلف صلاحیت اور الگ طرح کی ذمہ داریوں کی وجہ سے اسلام نے ان کے ساتھ جو دو الگ طرح کے معاملات کیے ہیں، اس سے عورت کی انسانیت، توقیر اور قدر و منزلت پر کوئی فرق نہیں پڑتا ہے۔ حکمت الٰہیہ نے دونوں کی الگ الگ خصوصیات کا اعتبار کرتے ہوئے دونوں کے لیے الگ طرح کی ذمہ داریوں اور میدان عمل کا تعین کیا ہے۔ اسی طرح ہم نے ان شکوک و شبہات کو بھی ختم کر دیا ہے جو بعض شرعی احکام و فیصلے کے تعلق سے ظاہر کیے جاتے ہیں، مثلاً گواہی اور حق وراثت کے معاملہ میں مرد و عورت کی نابرابری، یعنی ایک مرد کی گواہی دو عورتوں کی گواہی کے برابر ہے اور وراثت میں مرد کا حق عورت سے دوگنا ہے۔ میں نے خوں بہا اور دوسرے اختلافی مسائل پر بھی روشنی ڈالی ہے اور اس سلسلہ میں سارے شکوک و شبہات کو دور کر کے یہ واضح کر دیا ہے کہ اس طرح کے بعض معاملات میں عورت اور مرد کے درمیان جو فرق و امتیاز نظر آتا ہے، اس سے نہ تو رب کی نگاہ میں عورت کی حیثیت کم ہوتی ہے اور نہ اس کے سماجی مقام و مرتبہ میں فرق آتا ہے۔ یہ فرق و اختلاف صرف اس وجہ سے ہوا ہے کہ مرد و عورت کی جسمانی ساخت، جذبات و احساسات اور طاقت و صلاحیت میں بھی فرق ہے اور معاشرہ میں دونوں کا کردار بھی ایک دوسرے سے مختلف ہے۔

”عورتوں کے سیاسی حقوق“ کے تحت قانونی شواہد اور منطقی بحث کے ذریعہ میں نے یہ ثابت کیا ہے کہ عورتوں کو جہاد میں شریک ہونے کا حق حاصل ہے اور اس کی منسوخی کی بات ناقابل اعتبار ہے۔

اسلام نے عورت کو وہ حق و اختیار عطا کیا ہے کہ آج کی نام نہاد مہذب اور ترقی یافتہ دنیا کے قوانین کی رسائی بھی وہاں تک نہیں ہو سکی ہے۔ اسلام میں ایک آزاد عورت کو یہ حق ہے کہ وہ کسی کو امان دے سکتی ہے اور کسی کی جان کے

محترم ہونے کا اعلان کر سکتی ہے جس کے بعد تمام مسلمانوں کے لیے اس عہد و امان کا پاس و لحاظ کرنا ضروری ہو گا۔ یہ معاشرہ میں عورت کی عزت و توقیر کا اعلیٰ معیار ہے۔ اس کی وجہ سے ایک خاتون معاشرہ کے تمام معزز مردوں کے برابر ہو جاتی ہے۔ ترقی یافتہ کہلانے والی مغربی دنیا میں مردوں کے ذریعہ بنائے گئے نام نہاد "بین الاقوامی آئین" میں یہ حق اور اختیار کسی مرد کو بھی نہیں دیا گیا ہے۔

عورت کو حاصل ہونے والا یہ اختیار اسلام میں عورتوں کے حقوق کے بلند نمونہ کو اجاگر کرتا ہے۔ اور یہ معاشرہ میں عورتوں کی عزت اور اس کے اعلیٰ مقام و مرتبہ کو ظاہر کرتا ہے۔

تیسرے باب میں خواتین کی ذمہ داریوں اور فرائض سے بحث کی گئی ہے۔ یہ باب اس اعتبار سے منفرد ہے کہ اس میں عائلی زندگی میں عورتوں کے منظم تال میل و باہمی تعاون کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ اس سلسلہ میں مجھے جہاں سے بھی مواد حاصل ہونے کی امید تھی میں نے وہاں سے رجوع کیا اور اس گوشے پر روشنی ڈالنے کے لیے قدیم و جدید دونوں طرح کی کتابوں کو کھنگالا ہے۔ پھر میں نے حاصل شدہ مواد پر نظر ثانی کیا، اسے صحیح طریقہ پر ترتیب دیا اور ایک بامقصد اور قابل عمل فیصلے تک پہنچنے کے لیے میں نے کمی و کوتاہی اور مبالغہ آرائی کے بغیر عورت کی ذمہ داریوں سے متعلق اہل علم کے بحث و مناقشہ کا ایک خلاصہ ترتیب دیا۔ پھر دوبارہ اس مواد کا جائزہ لینے اور اسے اچھی طرح جانچنے و پرکھنے کے بعد میں نے اس سے کئی نتائج اخذ کیے۔ ان میں سے ایک کا میں یہاں پر خاص طور سے ذکر کرنا چاہوں گا۔

میں نے ایک مسلمان عورت کی ذمہ داری اور فرائض کے تعلق سے بہت سی کتابوں کی ورق گردانی کی، اس کے لیے میں نے اپنے مشاہدات اور دعوت کے میدان میں اپنے تجربات کا بھی جائزہ لیا، اس کے باوجود میں نے یہی نتیجہ اخذ کیا کہ اسلام میں ایک مسلمان عورت کے حقوق اس کے کندھوں پر ڈالی گئی ذمہ داریوں سے کہیں زیادہ ہیں۔

یہ بات جو میں نے کہی ہے، یہ صرف زبانی دعویٰ نہیں ہے بلکہ یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے۔ یہ مسلم اہل علم و دانشوروں اور خاص طور پر مسلم خواتین کو اس بات کی دعوت ہے کہ اتنی بڑی صداقت کے پیچھے جو حکمت الٰہیہ ہے اس پر غور و فکر کریں۔ یہ حقیقت حقوق نسواں کے لیے کام کرنے والے ان لوگوں کے لیے منہ توڑ جواب بھی ہے جو عورتوں کو قید و بند کی زندگی سے آزادی دلانے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ یہ لوگ مسلم خواتین کو نشانہ پر رکھ کر آزادی کا جو نعرہ لگاتے ہیں، یہ کچھ اور نہیں ہے بس مسلمان عورتوں کو اس دین کا قلادہ گردن سے اتار پھینکنے کی دعوت ہے جس نے اسے

معاشرہ میں باعزت مقام عطا کیا، اسے محکومیت اور غلامی کی زندگی سے نجات دی اور اسے سماج میں سر اٹھا کر جینے کا حق عطا کیا۔ اسلام سے پہلے زمانۂ جاہلیت میں عورتیں جس استحصال، آمریت اور محکومیت کی حالت میں زندگی گزارتی تھیں، آزادی کا یہ کھوکھلا نعرہ اسی بدترین حالت کی طرف لوٹنے کی دعوت ہے۔

اس بحث و تحقیق کے دوران مجھے اس حقیقت کا ادراک بھی ہوا کہ مردوں کے بنائے ہوئے معاشرتی قوانین نے ہر دور میں عورتوں کو غلامی سے ہمکنار کیا اور اسے مردوں کا خدمتگار اور اس کی دل لگی کا سامان بنا کر رکھ دیا اور اس غلامی کی زنجیروں سے باہر نکلنے کا واحد راستہ صرف اسلام ہے اور اسلام کی تعلیمات ہی صنف نازک کے تمام مسائل کا حل ہے۔

اسلام میں مسلم خواتین کو جو حقوق حاصل ہیں وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا کیے گئے ہیں، نہ تو اس میں حذف و اضافہ کیا جا سکتا ہے اور نہ کوئی دوسرا قانون اس کی جگہ لے سکتا ہے۔ مسلم خواتین کو یہ حقوق اس طور پر حاصل ہوئے ہیں کہ اس کے لیے حقوق نسواں کی تحریک چلانے والوں کو نہ تو باغیانہ تیور دکھانا پڑا ہے، نہ عورتوں کو رائے دہی کا حق دینے کے لیے کوئی تحریک چلانی پڑی ہے اور نہ اس کے لیے عورتوں کو اپنی نسوانیت کی سرعام نمائش کر کے اس کے وقار کو مجروح کرنا پڑا ہے، جبکہ اس سے پہلے کچھ حقوق پانے کے لیے روم اور یونان کی عورتوں کو ان تمام تکلیف دہ مراحل سے گزرنا پڑا ہے اور مغربی دنیا کی عورتیں آج بھی ان حقوق کو پانے کے لیے جدوجہد کر رہی ہیں اور ہر طرح کی ذلت اور استحصال کو برداشت کر رہی ہیں۔ مغربی خواتین کے ساتھ آج بھی توہین آمیز سلوک کیا جاتا ہے، گھر میں اور گھر سے باہر ان کے ساتھ بدسلوکی کی جاتی ہے۔ دور جدید کی نام نہاد آزاد عورت کا یہ حال ہے کہ اسے اس کی فطری ذمہ داریوں یعنی بچہ پیدا کرنے، اس کی پرورش کرنے اور گھر کے کاموں کو انجام دینے کے ساتھ اسے باہر جا کر اپنی ضروریات کے لیے کمانے اور ملازمت کرنے پر بھی مجبور کیا جاتا ہے اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ گھر کے تمام افراد کے اخراجات کا بوجھ اسی کے کندھے پر ڈال دیا جاتا ہے۔ اس طرح وہ ایک وقت میں مرد و عورت دونوں کا کردار ادا کرتی ہے۔ بدقسمتی سے کچھ مسلم خواتین بھی آزادیٔ نسواں کے جھانسہ میں آکر مغربی خواتین کی طرح آزادانہ زندگی گزارنے کی بات کرتی ہیں حالانکہ یہ مسلم خواتین ان مغرب کی عورتوں کے اندرونی کرب اور ان کی قابل رحم حالت کا ادراک کرنے سے قاصر ہیں۔ ان مسلم خواتین کو اسلام کا احسان مند ہونا چاہیے اور اسلام نے بغیر مطالبے کے جتنے حقوق اسے عطا کر دیئے ہیں ان

پر اسے فخر محسوس کرنا چاہیے۔ اسلام ہی واحد مذہب ہے جس نے عورتوں کی انسانیت، توقیر اور مرد کے برابر اس کی حیثیت کو تسلیم کیا ہے۔

اس کتاب میں میری بحث و تحقیق کے یہ چند نتائج تھے جنہیں میں نے یہاں پر قلمبند کرنے کی کوشش کی ہے۔ میں نے ان نتائج کو منطقی و موضوعی بحث و تحقیق کی شکل میں قارئین کے روبرو پیش کر دیا ہے۔ یہ مکمل طور پر موضوع سے متعلق سچائی کو سامنے لانے کی ایک کوشش ہے۔ آخر میں میں اللہ تعالیٰ کی شایان شان حمد و ثنا بیان کرتے ہوئے اس سے دعا گو ہوں کہ وہ میری اس علمی کاوش کو اپنی رضا و خوشنودی کے لیے قبول فرما لے، مجھے اپنی رضا کے دیگر کاموں کو انجام دینے کی توفیق دے، مجھے ہدایت کے راستہ پر گامزن رکھے۔ ہر قسم کی کامیابی اللہ ہی کی طرف سے ہے، میں اسی کی ذات پر بھروسہ کرتا ہوں اور اسی کی طرف مجھے لوٹ کر جانا ہے۔

مصادر و مراجع:

۱۔ **ابوالولید ازرقی:** أخبار مکۃ، **تحقیق: رشدی ملحس، ناشر: دارالثقافۃ، بیروت، لبنان، طباعت سوم**

۲۔ عبداللہ بن عبدالمحسن الترکی: أصول مذہب الإمام أحمد بن حنبل، **ناشر: مکتبہ جامعہ عین شمس، طباعت اول**

۳۔ **ابن قیم الجوزیۃ:** إعلام الموقعین عن رب العالمین، **دارالجلیل، بیروت، لبنان، ۱۹۷۳ء**

۴۔ **ابوالفضل أحمد بن حجر عسقلانی:** الإصابۃ فی تمییز الصحابہ، **ناشر: داراحیاء التراث العربی، بیروت، لبنان**

۵۔ **سعید عبدالمالک بن قریب بن عبدالمالک:** الاصمعیات، **ترتیب و تدوین: عبدالسلام ہارون، احمد شاکر، دارالمعارف، مصر، ۱۹۶۴ء**

۶۔ **ابوعبید القاسم بن سلام:** کتاب الأموال، **تحقیق: خلیل ہراس،** مکتبۃ الکلیات الأزہریہ، **قاہرہ، مصر، ۱۹۶۸ء**

۷۔ الماوردی: الأحکام السلطانیۃ و الولایۃ الدینیۃ، دار الباز مکۃ مکرمہ، دار الکتب العلمیہ، **بیروت، لبنان**

۸۔ **محمد بن ادریس الشافعی:** الأم، **دارالمعارف، بیروت، لبنان**

۹۔ **ابوحامد الغزالی:** إحیاء علوم الدین، مطبعۃ الاستقامہ، **قاہرہ، مصر**

۱۰۔ **الامام الحافظ محمد بن اسماعیل البخاری:** الأدب المفرد، دار الکتب العربیہ، **بیروت، لبنان**

۱۱۔ **ابن قیم الجوزیہ:** أخبار النساء، **تحقیق: نزار رضا، مکتبہ الحیاۃ، بیروت، لبنان**

۱۲۔ **ابوالفضل بن طاہر:** الأنساب المتفقۃ

۱۳۔ **الواحدی:** أسباب النزول، دار الکتاب العلمیۃ، **بیروت، لبنان**

۱۴۔ **علی عبدالواحد وافی:** الأسفار المقدسۃ للأدیان السابقۃ للاسلام، دار نہضۃ، **قاہرہ، مصر**

۱۵۔ **محمد اسلام مدکور:** الاسلام و الأسرۃ و المجتمع، دار النہضۃ العربیۃ، **قاہرہ، مصر**

۱۶۔ **ڈاکٹر محمد حسین:** الاتجاہات الوطنیۃ فی الأدب المعاصر، دار الارشاد، **بیروت، لبنان، ۱۳۸۹ھ / ۱۹۷۰ء**

۱۷۔ البہی الخولی: آدم علیہ السلام، مکتبہ وہبۃ، **قاہرہ، مصر**

۱۸۔ البهی الخولی: الاسلام و المرأة المعاصرة، دار القلم، **کویت**

۱۹۔جرجی نقولا باز: النسائیات، **بیروت، لبنان، طباعت دوم، ۱۹۱۶ء**

۲۰۔ محمد الطاہر بن عاشور: أصول النظام الاجتماعی فی الاسلام، الشرکة التونسیة للتوزیع، **تیونس**

۲۱۔

۲۲۔ محمود شلتوت: الإسلام عقیدة و شریعة، **دار الشرق، جدة، طباعت دوم، ۱۳۹۵ھ**

۲۳۔ بدوی طبانة: أدب المرأة العراقیة فی القرن العشرین، دار الثقافة، **بیروت، لبنان**

۲۴۔ **محمود محمد الجوہری:** الأخت المسلمة أساس المجتمع الفاضل

۲۵۔ جورج حنا: أحادیث مع المرأة العربیة، دار بیروت، **بیروت، لبنان، ۱۹۵۸ء**

۲۶۔ **حسین محمد یوسف:** آداب العقد و الزفاف فی الإسلام، دار الاعتصام

۲۷۔ **عبد الغنی عبود:** الأسرة المسلمة و الأسرة المعاصرة، دار الفکر العربی، **قاہرہ، مصر**

۲۸۔ محمد بن سالم الکدادی، البیجانی: أستاذ المرأة، مکتبہ الثقافہ

۲۹۔ **سعید الأفغانی:** الأحلام و المرأة، دار الفکر، **بیروت، لبنان**

۳۰۔ **طاہر الحداد:** امرأتنا فی الشریعہ و المجتمع، دار التونسیة

۳۱۔ **کوثر کامل علی:** أحکام الخطبة فی الشریعة الإسلامیة، دار الاعتصام

۳۲۔ **ڈاکٹر رؤوف شلبی:** استوصوا بالنساء خیرا

۳۳۔ منیر محمد الغضبان: إلیک أیتها الفتاة المسلمة، مکتبة الحرمین، **ریاض، ۱۴۰۰ھ**

۳۴۔ **ڈاکٹر عز الدین:** الاسلام و الأسرة العربیة، دار الفکر العربی

۳۵۔ **تقی الدین الہلالی:** أحکام الخلع فی الإسلام، المکتب الإسلامی، **بیروت، لبنان**

۳۶۔ **منیر محمد الغضبان:** الأخوات المؤمنات، مکتبة الحرمین، **ریاض**

۳۷۔

۳۸۔ **جمال عبد الہادی و محمد رفعت:** عرابة منذ أقدم العصور دولة الروم و الیونان، دار الشروق

۳۹۔ **ڈاکٹر محمد عمرۃ:** الإسلام و المرأة فی رأی الامام محمد عبده

۴۰۔ **عبدالغنی أحمد ناجی:** الأمومة و الطفولة فی الإسلام، دار الاعتصام

۴۱۔ **حسین محمد یوسف:** أهداف الأسرة فی الإسلام و التیارات المضادة، دار الاعتصام

۴۲۔ **زین الدین ابن نجیم حنفی:** البحر الرائق فی کنز الدقائق، **دار المعارف، بیروت، لبنان**

۴۳۔ **ابن رشد:** بدایة المجتهد و نهایة المقتصد، **دار المعارف، بیروت، لبنان**

۴۴۔ **أمینه یعقوب:** بماذا نتمسک و عماذا نتخلی، مطبعہ جریدة الهدی، **نیویارک، ۱۹۰۷ء**

۴۵۔ **عبدالکریم الخطیب:** التفسیر القرآنی للقرآن، دار الفکر العربی، **۱۹۷۰ء**

۴۶۔ **امام عماد الدین ابو الفداء اسماعیل بن کثیر:** تفسیر القرآن العظیم، دار المعرفة، **بیروت، لبنان**

۴۷۔ **امام محمد فخر الدین الرازی:** التفسیر الکبیر و مفاتیح الغیب، **دار الفکر**

۴۸۔ **ابو عبد اللہ محمد بن احمد الأنصاری القرطبی:** (تفسیر القرطبی) الجامع لأحکام الغیب، **دار الشعب، قاہرہ، مصر**

۴۹۔ **احمد موسیٰ المراغی:** تفسیر المراغی، **ناشر:** مصطفی الباجی و أولاده، **مصر**

۵۰۔ **رشید رضا:** تفسیر المنار، مکتبة القاهرة، **مصر**

۵۱۔ **ابو جعفر محمد بن جریر طبری: تفسیر الطبری، دار المعارف، مصر**

۵۲۔ محمود شلتوت: تفسیر القرآن الکریم، دار الشروق، **طباعت پنجم، ۱۹۷۳ء**

۵۳۔ **محمد عزت دروزة:** التفسیر الحدیث، دار إحیاء الکتب العربیة عیسیٰ البالی و شرکاؤہ

۵۴۔ **أندریہ إیمار**، جانین بوابة: تاریخ الحضارات العامة، **دار عویدات، بیروت، لبنان، ۱۹۶۴ء**

۵۵۔ **بوجے دی برج:** تراث العالم القدیم، **قاہرہ، مصر، ۱۹۶۵ء**

۵۶۔ **محمد فخری التزام حین:** تحریر المرأة و السفور

۵۷۔ **عائشہ بنت عبدالرحمٰن:** تراجم سیدات بیت النبوة، **دار الکتاب العربی**

۵۸۔ **ابن قیم الجوزیة:** تحفة المودود بأحکام المولود، المکتبة القیمة، **قاہرہ، مصر**

۵۹۔ **عبداللہ علوان:** تربیۃ الأولاد فی الإسلام، **دار السلام، بیروت، لبنان**

۶۰۔ **عبدالقادر عودۃ:** التشریع الجنائی الإسلامی، **طباعت پنجم، ۱۳۸۸ھ**

۶۱۔ **جمال عبدالہادی و محمد رفعت:** تاریخ حضارة مصر و العراق و بلاد الشام و إیران و ترکیا منذ أقدم العصور، **دار الشروق**

۶۲۔ **عبدالناصر توفیق العطار:** تعدد الزوجات، **دار الشروق**

۶۳۔ **عبدالعزیز بن باز:** التحذیر من البدع

۶۴۔ **ابو جعفر محمد بن جریر طبری: جامع البیان فی تفسیر القرآن، دار المعارف، بیروت، لبنان، طباعت دوم، ۱۹۷۸ء**

۶۵۔ **ابو عبداللہ محمد بن أحمد انصاری القرطبی: الجامع لأحکام القرآن، دار إحیاء التراث العربی، بیروت، لبنان**

۶۶۔ **ابن اثیر جزری:** جامع الأصول فی أحادیث الرسول، مکتبۃ دار البیان

۶۷۔ **محمد عمر کحالۃ:** الجمال البشری، مؤسسۃ الرسالۃ

۶۸۔ **عبدالمتعال جابری:** جریمۃ الزواج بغیر المسلمات فقھاً و سیاسۃً، **دار الأنصار، قاہرہ، مصر**

۶۹۔ **سعید عبدالعزیز جندول:** الجنس الناعم فی ظل الإسلام

۷۰۔ **ابن عابدین:** حاشیۃ رد المختار علی الدر المختار، مکتبۃ البابی الحلبی، **قاہرہ، مصر**

۷۱۔ عنایۃ القاضی و کنایۃ الرازی علی تفسیر البیضاوی (حاشیۃ الشھاب)، المکتبۃ الاسلامیۃ، **ترکی**

۷۲۔ **صدیق حسن خان:** حسن الأسوۃ، مطبعۃ الإمام، **قاہرہ، مصر**

۷۳۔ **عبدالوہاب الشیشانی:** حقوق الإنسان و حریاتہ الأساسیۃ فی النظام الإسلامی و النظم المعاصرۃ، جامعۃ الإمام محمد بن سعود الإسلامیۃ، **ریاض، ۱۴۰۰ھ**

۷۴۔ **جون ڈالون:** الحضارۃ المصریۃ، **ترجمہ: أحمد فخری**، مکتبۃ النھضۃ، **قاہرہ، مصر**

۷۵۔ **غوستاف لوبون:** حضارۃ العرب، **ترجمہ: عادل زعیتر**، مطبعۃ البابی الحلبی

۷۶۔ **علی عبدالواحدوافی:** حقوق الإنسان فی الإسلام، دار النهضة، **قاہرہ، مصر**

۷۷۔ **محمد رشید رضا:** حقوق النساء فی الإسلام و حظهن من الإصلاح المحمدی العام، مکتبۃ الاسلامی، **بیروت، لبنان**

۷۸۔ **محمد ناصر الدین البانی:** حجاب المرأۃ المسلمة فی الکتاب و السنة، المکتب الإسلامی، **بیروت، لبنان**

۷۹۔ **أحمد بیک أجایف:** حقوق المرأۃ فی الإسلام، **ترجمۃ:** سلیم قبعین، مطبعة الجمهوریة، **قاہرہ، مصر**

۸۰۔ **محمد عطیۃ خمیس:** الحرکات النسائیة و صلتها بالاستعمار، **دار الأنصار، قاہرہ، مصر**

۸۱۔ **ابو الأعلی مودودی: حقوق الزوجین**

۸۲۔ **عفیف مزاح:** الحریة فی أدب المرأۃ، مؤسسة الأبحاث العربیة، **بیروت، لبنان**

۸۳۔ **انور الجندی:** حرکة تحریر المرأۃ فی میراث الإسلام، **دار الأنصار، قاہرہ، مصر**

۸۴۔ **عبدالباقی رمضون:** خطر التبرج و الاختلاط، مؤسسة الرسالة، **بیروت، لبنان**

۸۵۔ **جلال الدین سیوطی:** الدر المنثور فی التفسیر المأثور، دار المعرفة، **بیروت، لبنان**

۸۶۔ **أحمد فائز:** دستور الأسرۃ فی ظلال القرآن، مؤسسة الرسالة، **بیروت، لبنان**

۸۷۔ **دیوان عنترہ**

۸۸۔ **توفیق علی وصبۃ:** دور المرأۃ فی المجتمع الإسلامی، دار اللواء، ۱۹۷۸ء

۸۹۔ دراسات عودۃ المرأۃ فی الکویت و الخلیج العربی: الجمعیة الثقافیة الاجتماعیة النسائیه

۹۰۔ **محمد عبداللہ دراز:** الدراسات العلمیة فی العلاقات الاجتماعیة و الدولیة، دار القلم، **بیروت، لبنان**

۹۱۔ **سعید حوی:** دروس فی العمل الإسلامی، دار السلام، **حلب**

۹۲۔ **احمد بن عبدالعزیز المبارک:** ضیاء المعارف فی الفقہ الإسلامی، مؤسسة الاتحاد

۹۳۔ **ابن حزم: ذخائر العرب** (جمهرۃ أنساب العرب)

۹۴۔ **علامہ آلوسی بغدادی:** روح المعانی فی تفسیر القرآن و السبع المثانی، احیاء التراث، **بیروت، لبنان، طباعت دوم**

۹۵۔ ابن قیم الجوزیۃ: الروح، دار الکتب العربیۃ، بیروت، لبنان،۱۹۷۹ء

۹۶۔ صفی الرحمٰن مبارکپوری: الرحیق المختوم

۹۷۔ سنیۃ قراعۃ: الرسالۃ الکبریٰ، مکتب الصحافۃ الدولی للصحافۃ و النشر

۹۸۔ محمد الحامد: رحمۃ الإسلام للنساء، دار الأنصار، قاہرہ، مصر،۱۳۹۸ھ

۹۹۔ سید أمیر علی: روح الإسلام، ترجمہ: عمر الدیراوی، دار العلم الملایین، بیروت، لبنان

۱۰۰۔ ابن قیم الجوزیۃ: زاد المعاد فی ھدی خیر العباد، مصری طباعت، قاہرہ، مصر

۱۰۱۔ تحفۃ أحمد السید: الزواج و الطلاق و حقوق الزوجۃ و الأولاد فی مصر القدیمۃ (مقالہ برائے پی۔ایچ۔ڈی۔، معھد الآثار، قاہرہ یونیورسٹی)

۱۰۲۔ علی حب اللہ: الزواج فی الشریعۃ الإسلامیۃ، دار الفکر العربی، قاہرہ، مصر

۱۰۳۔ محمد علی الصابونی: المواریث فی الشریعۃ الإسلامیۃ

۱۰۴۔ ابو عیسیٰ محمد بن عیسیٰ: سنن الترمذی، ناشر: مصطفی البابی الحلبی، قاہرہ، مصر

۱۰۵۔ جلال الدین سیوطی: شرح سنن النسائی

۱۰۶۔ ابو عبداللہ محمد بن یزید قزوینی: سنن ابن ماجۃ، دار الکتب العربیہ

۱۰۷۔ سنن الدارمی، دار الکتب العلمیۃ، بیروت، لبنان

۱۰۸۔ ابو محمد عبد المالک بن ہشام عامری: السیرۃ النبویۃ، دار الجلیل، بیروت، لبنان

۱۰۹۔ محمد ناصر الدین البانی: سلسلۃ الأحادیث الصحیحۃ، المکتب الإسلامی، بیروت، لبنان

۱۱۰۔ محمد ناصر الدین البانی: سلسلۃ الأحادیث الضعیفۃ و الموضوعۃ، المکتب الإسلامی، بیروت، لبنان

۱۱۱۔ صلاح الدین حنفی: السواک دراسۃ بنائیۃ کیمیائیۃ صحیۃ (تحقیقی مقالہ برائے پی۔ایچ۔ڈی۔)، دمشق یونیورسٹی

۱۱۲۔ محمد کامل حسن المحامی: سطور مع العظمات

۱۱۳۔ کمال الدین محمد عبد الواحد الیواسی: شرح فتح القدیر

۱۱۴۔ منصور بن یونس بن ادریس البھوتی: شرح منتھی الإرادات (دقائق لأولی النھی)

۱۱۵۔ **فوزی رشید:** الشرائع العراقیۃ القدیمہ، وزارۃ الإعلام

۱۱۶۔ **عبدالحمید زائد: الشرق الخالد**

۱۱۷۔ **ابو علی أحمد بن محمد بن حسن المرزوقی:** شرح دیوان الحماسۃ

۱۱۸۔ **مزایا اسٹارک:** شھادۃ النساء فی الشرق، **برٹش براڈکاسٹ**، المطبعۃ العربیۃ، عدن

۱۱۹۔ **ابو عبداللہ محمد بن اسماعیل البخاری: صحیح البخاری**، دار الطباعۃ العامرۃ، **استنبول**

۱۲۰۔ **صحیح مسلم بشرح النووی، دار إحیاء التراث العربی، بیروت، لبنان**

۱۲۱۔ **ابو زکریا یحی بن شرف بن مزی حسن بن حسین ابن حزم النووی: شرح صحیح مسلم**

۱۲۲۔ **صحیح ابن حبان**، المکتبۃ السلفیہ، المدینۃ المنورۃ

۱۲۳۔ **شیخ حمود بن عبداللہ التویجری:** السنام المشھور علی التبرج و السفور، **دار السلام، بیروت، لبنان**

۱۲۴۔ **ابن حزم الاندلسی:** طوق الحمامۃ، **دار المعارف، قاہرہ، مصر**

۱۲۵۔ العینی: عمدۃ القاری شرح صحیح البخاری، دار إحیاء التراث العربی، **بیروت، لبنان**

۱۲۶۔ **ابو الطیب شمس الحق عظیم آبادی:** عون المعبود شرح سنن أبی داؤد، المکتبہ السلفیہ، المدینۃ المنورۃ

۱۲۷۔ **سعاد صالح:** علاقۃ الآباء و الأبناء فی الشریعۃ الإسلامیۃ

۱۲۸۔ **سعد الأفغانی:** عائشۃ و السیاسۃ، **دار الفکر، بیروت، لبنان، ۱۹۷۱ء**

۱۲۹۔ **محمد علی البار:** عمل المرأۃ فی المیزان

۱۳۰۔ **صبری القبانی:** الغذاء لا الدواء، دار العلم للملایین، **بیروت، لبنان، ۱۹۷۳ء**

۱۳۱۔ **احمد بن علی بن حجر العسقلانی: فتح الباری شرح صحیح البخاری**، المکتبۃ السلفیہ

۱۳۲۔ ابو عبداللہ الشیخ محمد احمد اللیث: فتح العالیہ المالکی علی مذھب الإمام مالک، مصطفی البابی الحلبی، **مصر، ۱۳۷۸ھ**

۱۳۳۔ **سید قطب: فی ظلال القرآن، دار الشروق، بیروت، لبنان**

۱۳۴۔ **عبدالرحمٰن الجزری:** الفقہ علی المذاہب الأربعۃ، المکتبۃ التجاریۃ الکبری، **مصر**

۱۳۵۔ **محمد الغزالی:** فقہ السیرۃ، دار الکتب الحدیثۃ، **قاہرہ، مصر**

۱۳۶۔ **المناوی: فیض القدیر شرح الجامع الصغیر، دار المعارف، بیروت، لبنان**

۱۳۷۔ **ول دیورانت:** قصۃ الحضارۃ، **ترجمہ: محمد بدران متبعی، قاہرہ، مصر**

۱۳۸۔ **عادل محمد محمود:** قضایا المرأۃ فی الشرق العربی الحدیث و مصر **(مقالہ برائے پی۔ ایچ۔ ڈی۔)**

۱۳۹۔ **ام کلثوم یحی الخطیب:** قضیۃ تحدید النسل فی الشریعۃ الإسلامیۃ، الدار السعودیۃ، **جدہ**

۱۴۰۔

۱۴۱۔ محمود بن عمر الزمخشری: الکشاف عن حقائق التنزیل

۱۴۲۔ الکتاب المقدس (القدیم و الجدید)

۱۴۳۔ **محمد سعید الجابی:** کشف النقاب عن کتاب السفور و الحجاب

۱۴۴۔ أرثر شوبنھار: کلمۃ عن النساء، **ترجمہ: حسن ریاض**، مطبعۃ الترقی، **قاہرہ**

۱۴۵۔ **عطیہ حنان:** کلاب الحلال

۱۴۶۔ **جلال الدین السیوطی:** لباب القول فی أسباب النزول، دار إحیاء العلوم، **بیروت، لبنان**

۱۴۷۔ **ابن منظور: لسان العرب**

۱۴۸۔ مھدیۃ شھادی: لباس المرأۃ و زینتھا فی الفقہ الإسلامی

۱۴۹۔ **احمد آل مبارک:** لزوم الطلاق الثلاث فی کلمۃ واحدۃ، مکتبۃ دار القلم، **دمشق**

۱۵۰۔ **ابن حزم:** المحلی، إدارۃ الطباعۃ المنیرۃ، **۱۳۴۹ھ**

۱۵۱۔ شمس الدین ابن قدامۃ: المغنی، دار الکتاب العربی، **بیروت، لبنان، ۱۹۷۲ء**

۱۵۲۔ المعجم المفھرس لألفاظ الحدیث، **ناشر: ڈاکٹر الونسک، استاذ عربی زبان، لیڈن یونیورسٹی**

۱۵۳۔ **مؤطا امام مالک، طباعت چہارم، بیروت، لبنان**

۱۵۴۔ **ابو اسحاق الشاطبی:** الموافقات فی أصول الشریعۃ، دار الباز للنشر و التوزیع

۱۵۵۔ **احمد رضا:** معجم متن اللغہ **(لسانیات انسائیکلوپیڈیا)**، المجمع العلمی العربی، **دمشق، مکتبہ الحیاۃ، بیروت، ۱۹۶۰ء**

۱۵۶۔ **مسند الامام أحمد بن حنبل**، المکتب الإسلامی، **دار الصدر، بیروت، لبنان**

۱۵۷۔ **خطیب التبریزی: مشکاۃ المصابیح، تحقیق: محمد ناصر الدین البانی**، المکتب الإسلامی، **بیروت، لبنان، طباعت دوم، ۱۹۷۹ء**

۱۵۸۔ **ابو علی الفضل بن الحسن التبریزی: مجمع البیان فی تفسیر القرآن، دار إحیاء التراث العربی، بیروت، لبنان**

۱۵۹۔ احمد شلبی: مقارنۃ الأدیان الیھودیۃ، مکتبۃ النھضۃ، **قاہرہ، مصر**

۱۶۰۔ **محمد علی الصابونی: مختصر تفسیر ابن کثیر، دار القرآن الکریم، بیروت، لبنان**

۱۶۱۔ محمد بن الحسن بن زبالۃ: منتخب من أزواج النبی صلی اللہ علیہ و سلم، الجامعۃ الإسلامیہ المدینۃ المنورۃ

۱۶۲۔ صبحی المحمصانی: المبادئ الشریعۃ فی الحجر و النفقات و المواریث و الوصیۃ، دار العلم للملایین، **بیروت، لبنان، طباعت چہارم**

۱۶۳۔ **أحمد غنیم:** المرأۃ منذ النشأۃ بین التحریم و التکریم، مطبعۃ الکیلانی، **قاہرہ، مصر**

۱۶۴۔ **محمد علی الصابونی:** المواریث فی الشریعۃ الإسلامیہ، **دار الإرشاد، بیروت، لبنان**

۱۶۵۔ **أحمد عبد العزیز الحصین:** المرأۃ و مکانتھا فی الإسلام، مطابع المختار الإسلامی، **۱۹۸۱ء**

۱۶۶۔ وھبی سلیمان البانی: المرأۃ المسلمۃ، **دار القلم، دمشق، ۱۳۹۵ھ**

۱۶۷۔ **عبد المتعال محمد الجابری:** المرأۃ فی التصور الإسلامی، مکتبۃ الوھاب، **طباعت چہارم، ۱۹۷۸ء**

۱۶۸۔ **حسین عطوان:** مقدمۃ القصیدۃ العربیۃ فی الشعر الجاھلی، **دار المعارف، قاہرہ، مصر، ۱۹۷۹ء**

۱۶۹۔ کامل سلامۃ الدقس: منھج سورۃ النور، دار الشروق، **جدۃ، طباعت دوم**

۱۷۰۔ سید أمیر علی ھندی: مرکز المرأۃ فی الإسلام

۱۷۱۔ **المدنیۃ والحجاب (السفور والحجاب کے جواب میں لکھی گئی)**

۱۷۲۔ **ابو رضوان زغلول بن السنوسی:** المرأة بین الحجاب و السفور، دار مکتبۃ الحیاۃ، **بیروت، لبنان**

۱۷۳۔ **محمد عزت دروز:** المرأۃ فی القرآن و السنۃ، المکتبۃ الأثریۃ، **بیروت، لبنان**

۱۷۴۔ **محمد فرید وجدی:** المرأۃ المسلمۃ، دار إحیاء علوم الدین للتالیف و الطباعۃ و النشر

۱۷۵۔ **عبداللہ عفیفی:** المرأۃ العربیۃ فی ظلال الإسلام، دار الکتاب العربی، **قاہرہ، مصر**

۱۷۶۔ المرأۃ و السیاسۃ **(میری کوریلی، ارل برنس، چارلس جرفس)، عربی ترجمہ: محمد عبدالعزیز الصدر**

۱۷۷۔ نبیھۃ موسیٰ: المرأۃ و العمل

۱۷۸۔ **حبیب آفندی الزیات الدمشقی:** المرأۃ فی الجاھلیۃ

۱۷۹۔ **محمد مسعود:** المرأۃ فی الأزمنۃ الثلاث

۱۸۰۔ **لیلی حسن سعد الدین:** المرأۃ فی الإسلام، بنتاً و زوجۃً و أمّاً، جامعۃ عین شمس، **قاہرہ، مصر**

۱۸۱۔ سھیلۃ زین العابدین حماد: مسیرۃ المرأۃ السعودیۃ الی أین؟، الدار السعودیۃ للنشر و التوزیع، **۱۹۸۲ء**

۱۸۲۔ شیخ صبحی الصالح: المرأۃ فی الإسلام، المؤسسۃ العربیۃ للدراسۃ و النشر

۱۸۳۔ أحمد زکی تفاحۃ: المرأۃ فی الإسلام، دار الکتاب اللبنانی، **۱۹۷۹ء**

۱۸۴۔ **عبدالمتعال الجابری:** المسلمۃ العصریۃ عند باحثۃ البادیۃ ملک حنفی ناصف، دار الأنصار، **قاہرہ،**

طباعت سوم

۱۸۵۔ سالم البھنساوی: مکانۃ المرأۃ بین الإسلام و القوانین العالمیۃ، دار القیم، **کویت**

۱۸۶۔ **عبداللہ عفیفی:** المرأۃ العربیۃ فی الجاھلیۃ و الإسلام، مکتبۃ الإستقامۃ، **قاہرہ، مصر**

۱۸۷۔ **محمد السباعی:** المرأۃ الجدیدۃ فی المرکز الاجتماعی، مطبعۃ السعادۃ، **مصر**

۱۸۸۔ **أحمد جمال:** مکانک تحمدی، جدۃ، تھامہ، **طباعت چہارم، ۱۴۰۱ھ**

۱۸۹۔ نزیھۃ لکحل عیاط: المرأۃ التونسیۃ، **دار العمل**

۱۹۰۔ **أحمد الحوفی:** المرأۃ فی الشعر الجاھلی، **دار الفکر العربی، قاہرہ، طباعت دوم**

۱۹۱۔ عمر سلیمان الأشقر: المرأۃ بین دعاۃ الإسلام و أدعیاء التقدم، مکتبۃ الفلاح، **کویت، ۱۹۸۰ء**

۱۹۲۔ **عبدالغنی أحمد ناجی:** الأمومہ و الطفولۃ فی الإسلام، دار الاعتصام

۱۹۳۔ **لوئس شیدولیناد:** المرأۃ العربیۃ و العیر، **عربی ترجمہ: شوکت یوسف**، دار الجیل، **بیروت**

۱۹۴۔ **روبرٹ وی اسمتھ:** المرأۃ و العمل فی أمریکا، **عربی ترجمہ: حسین عمر**

۱۹۵۔ عصمۃ الدین کرکر حرم الهیلۃ: المرأۃ من خلال الآیات القرآنیۃ، الشرکۃ التونسیۃ للتوزیع

۱۹۶۔ **أحمد خالکی:** المرأۃ فی مختلف العصور، **دار المعارف، قاہرہ، ۱۹۴۷ء**

۱۹۷۔ **علی عبدالواحد وافی:** المرأۃ فی الإسلام، دار نهضۃ مصر، **قاہرہ، طباعت پنجم**

۱۹۸۔ عمر رضا کحالۃ: المرأۃ فی القدیم و الحدیث (الأجزاء: ۱-۳)، مؤسسۃ الرسالۃ، **۱۳۹۹ھ**

۱۹۹۔ المرأۃ فی عالم العرب و الإسلام: سلسلۃ البحوث الاجتماعیہ (الأجزاء: ٦، ٧)

۲۰۰۔ **عباس محمود العقاد:** المرأۃ ذلک اللغز، **دار الکتاب العربی، بیروت، لبنان، ۱۹۷۰ء**

۲۰۱۔ **عباس محمود العقاد:** المرأۃ فی القرآن، **دار الکتاب العربی، بیروت، لبنان، ۱۹۶۹ء**

۲۰۲۔ **محمد ظاہر وتر:** مکانۃ المرأۃ فی الشئون الإداریۃ و البطولات القیادیۃ، مؤسسۃ الرسالۃ، **بیروت، لبنان،**
۱۳۹۹ھ

۲۰۳۔ **مصطفی السباعی:** المرأۃ بین الفقہ و القانون، المکتب الإسلامی، **بیروت، لبنان، طباعت پنجم**

۲۰۴۔ **نورالدین عتر:** ماذا عن المرأۃ، **دار الفکر دمشق، طباعت چہارم**

۲۰۵۔ محمد الحجری اسماعیل: مرآۃ المرأۃ، الکتاب الأول، **تیونس، ۱۹۴۶ء**

۲۰۶۔ **محمد قطب:** منهاج التربیۃ الإسلامیۃ، **دار الشروق، بیروت، قاہرہ، جدۃ، طباعت دوم**

۲۰۷۔ **الکزنڈر کولونیٹ:** محاضرات حول تحریر المرأۃ، **ترجمہ: ہنریٹ عبودی، دار التالیف، بیروت، ۱۹۸۰ء**

۲۰۸۔ **أحمد خیرت:** مرکز المرأۃ فی الإسلام، **دار المعارف، قاہرہ، مصر**

۲۰۹۔ السعید محمد عبدہ النیجیری: موقف الإسلام من تعلیم المرأۃ، جامعۃ الأزہر

۲۱۰۔ عبدالرزاق السنهوری: مصادر الحق فی الشریعۃ الإسلامیۃ

۲۱۱۔ **کامل سلامہ الدقس:** نفحات من السنۃ، **دار الشروق، جدۃ**

۲۱۲۔ **محمد المبارک:** نظام الإسلام الاقتصادی مبادئ و قواعد عامۃ، **دار الفکر، بیروت، لبنان، ۱۹۷۲ء**

۲۱۳۔ **محمد المبارک:** نظام الاسلام، العقیدۃ و العبادۃ، **دار الشروق، جدۃ، طباعت ششم**

۲۱۴۔ **علی ابراہیم حسن:**

۲۱۵۔ **عائشہ بنت عبد الرحمٰن الشاطی: نساء النبی علیہ الصلاۃ والسلام، دار الکتاب العربی**

۲۱۶۔ **محمد بن علی بن محمد الشوکانی:** نیل الأوطار شرح منتقی الأخبار من أحادیث سید الأخیار، مطبعۃ مصطفی الحلبی، **مصر**

۲۱۷۔ **جمال الدین حنفی زیلعی:** نصب الرایۃ لأحادیث الهدایۃ مع حواشی بغیۃ العلماء فی تخریج الزیلعی' **طباعت دوم' المکتبۃ الاسلامیۃ۔**

۲۱۸۔ **ابراہیم عاصی:** همسۃ فی أذن حواء، **دار القلم دمشق، طباعت سوم**

۲۱۹۔ السنهوری: الوسیط

۲۲۰۔ محمد ابو زهرۃ: الولایۃ علی النفس، **دار الرائد العربی، بیروت، لبنان**

۲۲۱۔ کمال جودۃ: وظیفۃ المرأۃ فی نظر الإسلام، دار الهدی للطباعۃ، **قاہرہ، ۱۴۰۰ھ**

جرائد و مجلات:

۱۔ اللواء الإسلامی (**دینی، علمی و سماجی مجلہ**)، مکتبۃ دار الکتاب العربی، **مصر**

۲۔ نور الإسلام (**دینی و تحقیقی مجلہ**)، **جاری کردہ:** مشائخ جامعۃ الازہر، ۱۳۱۴ھ تا ۱۳۵۴ھ، المطبعۃ الحدیثۃ، **قاہرہ، مصر**

۳۔ جریدۃ الریاض، شمارۃ: ۵۰۹۶، **(۱۳/۶/۱۴۰۲ھ مطابق ۷/۴/۱۹۸۲ء)**

کتب احادیث نبویہ:

۱۔ صحیح بخاری

۲۔ صحیح مسلم

۳۔ مسند الامام أحمد بن حنبل

۴۔ صحیح ابن حبان

۵۔ سنن الترمذی

۶۔ سنن النسائی

۷۔ سنن ابن ماجہ

۸۔ سنن الدارمی

۹۔ مؤطا امام مالک